الفقه المنهجي

على مذهب الإمام الشافعي

(فقہِ شافعی؛ مختصر فقہی احکام مع دلائل وحکم)

جلد دوم

(پرسنل لاء، وقف، وصیت، میراث)

تالیف:

ڈاکٹر مصطفیٰ خن، ڈاکٹر مصطفیٰ بغا، علی شربجی

ترجمہ

ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی

ناشر

معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل

پہلا ایڈیشن

نام کتاب:	الفقه المنهجي على مذهب الامام الشافعي
	فقہِ شافعی مختصر فقہی احکام مع دلائل وحکم
تصنیف :	ڈاکٹر مصطفیٰ خن، ڈاکٹر مصطفیٰ بغا، علی شربجی
ترجمہ :	ڈاکٹر عبد الحمید اطہر ندوی
صفحات :	۴۶۴
تاریخ اشاعت:	صفر المظفر ۱۴۳۱ ہجری مطابق فروری ۲۰۱۰ء
کمپوزنگ:	ندوی پرنٹرس بھٹکل
تعداد اشاعت:	۲۰۰۰
قیمت :	۱۸۰ روپئے

ملنے کے پتے:

نیو شباب بک ہاؤس، ندوہ روڈ لکھنؤ۔ یوپی

مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر: ۳۰، بھٹکل، کرناٹک ۵۸۱۳۲۰

ناشر

معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل

پوسٹ بکس نمبر ۱۳ بھٹکل ۵۸۱۳۲۰، کرناٹک۔ انڈیا

فہرست کتاب

عرضِ ناشر

اللہ تبارک وتعالی کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے محض اپنی توفیق وعنایت سے **الفقه المنهجي على مذهب الإمام الشافعي** کے حصہ اول کا ترجمہ معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل سے طبع کرا کے مقبول عام وخاص کیا، اب اس سلسلہ کی دوسری کڑی بھی محض اسی کی توفیق سے طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جن کا نام محمد بن ادریس ہے، پوری امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے فقہ میں اتنا عظیم کام کر کے امت پر بہت بڑا احسان کیا ہے، آج ان ہی کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہمیں مل رہا ہے، اللہ ان کی قبر پر رحمتوں کی بارش فرمائے۔

اللہ تعالی اپنے دینِ متین کی حفاظت اور اس کی تجدید کے لیے اپنی یگانۂ روزگار شخصیات کو پیدا فرماتا رہتا ہے اور تا قیامت ایسی یکتائے روزگار ہستیاں وجود میں آتی رہیں گی، جن کے علم وفضل سے پوری دنیا مستفید ہوتی رہے گی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان باکمال شخصیات میں سے ایک ہیں، جن کے احسان تلے پوری امت دبی ہوئی ہے، جن کے حیرت انگیز حافظہ اور فطانت نے اپنے ہم عصروں کے درمیان ایک ممتاز مقام پیدا کر دیا تھا، اس کی ایک جھلک راقم سطور نے حصہ اول کے عرضِ ناشر میں پیش کی تھی، اب ان کے حافظہ کا دوسرا انوکھا واقعہ جو امام محمد کے ساتھ پیش آیا تھا ضبطِ تحریر کر رہا ہوں؛ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قافلے کے ساتھ کوفہ پہنچ جاتے ہیں، قافلہ والے سب کے سب اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، آپ کوفہ میں نووارد تھے، اس لیے سیدھے وہاں کی جامع مسجد میں یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے: ''اے اللہ! مجھ پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے'' مسجد میں عصر کی نماز ہو چکی تھی، امام شافعی مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھے آنے جانے والوں کو تکتے رہے، اس دوران

ایک نوجوان پر ان کی نگاہ جم گئی، نوجوان جب اپنی نماز سے فارغ ہوگیا تو امام شافعی اس کی نماز کے بارے میں اس سے الجھ گئے، بات لمبی ہوتی گئی تو یہ معاملہ اس وقت کے امام وفقیہ امام محمد تک پہنچ گیا، امام محمد اس نووارد نوجوان کی گفتگو سے بھانپ گئے کہ یہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے، اس سے پوچھنے لگے کہ تم نے امام مالک کی موطا بھی دیکھی ہے، نوجوان جواب دیتا ہے کہ صرف دیکھی ہی نہیں ہے بلکہ پوری کتاب مجھے یاد ہے، لیکن امام محمد کو ان کی بات پر یقین نہیں ہوا، اس وقت ان کا امتحان لینے کے لیے قلم وقرطاس منگوایا اور چند سوالات لکھ کر امام شافعی کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیے کہ ان کے جوابات موطا کی روشنی میں تحریر کیجیے، امام شافعی نے ان کے جوابات قرآن وحدیث اور اجماع امت کی روشنی میں تحریر کرکے امام محمد کی طرف بڑھا دیے، امام محمد بڑی دیر تک یہ جوابات دیکھتے رہے اور حیرت واستعجاب میں کھو گئے کہ ایک نوجوان علم وادب کے میدان میں اس قدر آگے ہے تو ضرور مستقبل میں اس میدان کا شہسوار بن کر چمکے گا۔

امام محمد اسی وقت امام شافعی کو اپنا مہمان بنا کر گھر لے گئے اور بڑی فراخ دلی اور تکریم واحترام کے ساتھ ان کی میزبانی کی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ان کو امام محمد اپنے ذاتی کتب خانے لے گئے اور اپنے استاذ امام ابوحنیفہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''الکتاب الاوسط'' امام شافعی کو مطالعہ کے لیے دی، امام شافعی نے اس کتاب کو ایک ہی رات میں اپنے ذہن ودماغ میں انڈیل دیا، اسی رات یہ کتاب امام کو ازبر یاد ہوجاتی ہے، کیسا غضب کا حافظہ اللہ تعالی نے امام شافعی کو عطا فرمایا تھا، اسی حافظے اور علم وادب نے آپ کو امام کے درجے تک پہنچایا۔

یہ کتاب ہم قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کررہے ہیں کہ وہ اس کا مطالعہ کریں گے اور اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات کو نافذ کریں گے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہماری کاوشوں کو قبول فرمائے۔

محمد ناصر اکرمی عفی عنہ
ناظم معہد امام حسن البنا شہید بھٹکل

پیش لفظ

یوں تو تمام ہی اسلامی علوم کی اہمیت ہے، لیکن فقہ کی حیثیت ان سب کے عطر اور نچوڑ کی ہے، کیوں کہ یہ براہ راست انسانی زندگی سے مربوط ہے، اس کی افادیت اور ضرورت کے پیش نظر عہد تابعین ہی سے اس کی تدوین کا کام شروع ہو چکا تھا، اور چند ہی صدیاں گزری تھیں کہ اس فن کی کتابوں کے بڑے بڑے کتب خانے وجود میں آ گئے تھے، کیوں کہ بدلتے ہوئے احوال اور تغیر پذیر اسالیب اور تقاضوں کے مطابق مختلف مکاتب فکر کے فقہاء ہر زمانہ میں احکام شرعیہ کی ترتیب کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں، تاکہ زمان ومکان سے مکمل ہم آہنگی کے ساتھ یہ علم امت کو سیراب کر سکے۔

موجودہ حالات میں ___ جب کہ سہل، عام فہم، مرتب اور ترکیبی پیچیدگیوں سے صاف ستھرے کلام کو پسند کیا جاتا ہے ___ علماء نے اسی اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے دنیا کی متداول زبانوں میں قدیم کتابوں کی افادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی تیسیر وتسہیل کا کام شروع کیا ہے، عربی زبان میں تقریباً سبھی دبستان فقہ کے علماء نے یہ خدمت انجام دی ہے، فقہ شافعی میں بھی عربی زبان میں اس نوعیت کی کئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ان میں دکتور مصطفیٰ خن، دکتور مصطفیٰ بغا اور علی شربجی کی مشترکہ تصنیف "**الفقہ المنہجی علی مذہب الامام الشافعی**" اپنی جامعیت اور افادیت میں ممتاز اور انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب تعداد ہے، اس لیے اردو میں بھی فقہ پر کافی کام ہوا ہے، اور خاص کر فقہ حنفی میں تو بے شمار کتابیں شائع ہوئی ہیں، مگر فقہِ شافعی کی بہت کم کتابیں دستیاب ہیں، حالاں کہ کیرالہ، کوکن، حیدرآباد، جزائر انڈومان ونکوبار اور ساحلی علاقوں میں شوافع کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے، تاہم بحمد اللہ بعض اہل علم نے اس کی طرف بھی توجہ دی ہے، اس سلسلہ میں المبسوط، المتوسط اور المختصر کے نام

سے فقہ شافعی پر تین اہم کتابیں حیدر آباد سے عرصہ پہلے شائع ہوچکی ہیں، جو جناب احمد جنگ کی تالیفات ہیں، محبی فی اللہ مولانا محمد ایوب ندوی کی ''شافعی فقہ'' (دو حصے) بھی اس بارے میں قابلِ ذکر ہے، اس سلسلہ میں ایک بڑا کام محبِّ گرامی مولانا محمد ابراہیم صاحب شیخ الحدیث ''جامعہ اسلامیہ حسینیہ شری وردھن'' کی کتاب ''تحفۃ الباری'' ہے، جو اپنی جامعیت اور استناد کے اعتبار سے اس موضوع پر اردو میں کم وکیف ہر دولحاظ سے شاید اب تک منظر عام پر آنے والی سب سے اہم کتاب ہے، جس پر اس حقیر کا مقدمہ بھی ہے۔

لیکن ابھی اس سلسلے میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسا اوقات مستقل تالیف سے زیادہ مفید کسی ایسی کتاب کا ترجمہ ہوتا ہے، جو اپنے موضوع پر جامع اور دل نشیں ہو، ماشاء اللہ ڈاکٹر عبد الحمید اطہر ندوی نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''**الفقه المنهجي على مذهب الامام الشافعي**'' کے ترجمہ کا کام شروع کیا ہے، جو فقہ شافعی پر بڑی نفیس اور دل آویز کتاب ہے، موصوف نے ترجمہ میں اتنی سلیس اور آسان زبان استعمال کی ہے کہ ترجمہ پن کا احساس نہیں ہوتا، ہر عام وخاص کے لیے اس سے استفادہ آسان ہوگیا ہے، حالاں کہ فقہی مضامین میں کلام کی چاشنی، زبان کی جاذبیت اور تراکیب کی سلاست کو برقرار رکھنا دشوار ہوتا ہے، مگر مترجم بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اللہ تعالی اس کاوش کو قبول فرمائے، میں اس سلسلہ میں کتاب کے مترجم کے ساتھ ساتھ معروف فاضل اور صاحبِ ذوق عالم جناب مولانا محمد ناصر اکرمی زید مجدہ کو بھی دل کی گہرائی سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، جن کی توجہ سے یہ اہم علمی کام منظر عام پر آرہا ہے، **جزاهم الله خير الجزاء**، امت کے لیے اس کتاب کو نافع بنائے اور مترجم سے زیادہ سے زیادہ دین اور علمِ دین کی خدمت لے، نیز شیخ حسن البنا شہید کی نسبت سے قائم ہونے والے اس ادارہ کو دوام واستحکام سے نوازے، **وبالله التوفيق وهو المستعان**۔

۱۱/جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ — خالد سیف اللہ رحمانی

۷/مئی ۲۰۰۹ء — (خادم المعہد العالی الاسلامی۔ حیدرآباد)

تمہید

پرسنل لاء سے مراد وہ تمام حالات ہیں جو انسان اور اس کے خاندان کے درمیان پیش آتے ہیں، اور ان حالات میں حقوق لازم آتے ہیں اور مادی یا اخلاقی پابندیاں نافذ ہوتی ہیں۔

اس معنی میں اس اصطلاح کا استعمال نیا ہے، اس کا استعمال "سول لا" کے مقابلے میں ہوتا ہے، جو انسان کے تعلقات کو خاندانی حدود اور دائرے سے باہر معاشرے کے افراد کے ساتھ منظم اور مرتب کرتا ہے۔

قدیم عہد میں فقہاء "پرسنل لا" کا استعمال خاندان اور اس کے متعلقات اصول اور احکام کے لیے نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر باب کو الگ نام سے موسوم کرتے تھے، مثلاً: کتاب النکاح، کتاب الصداق، کتاب النفقات، کتاب الطلاق، کتاب الفرائض وغیرہ۔

احکامِ نکاح

نکاح کی تعریف:

لفظ ''نــکـــاح '' کے لغوی معنی ضم کرنے اور جمع کرنے کے ہیں، مثلاً جب درخت ایک دوسرے کی طرف جھک جائیں اور آپس میں مل جائیں تو عربی میں کہتے ہیں: ''تناکحت الأشجار ''۔

شریعت میں نکاح ایک عقد کا نام ہے، جس عقد کے مکمل ہونے کے بعد شوہر اور بیوی شرعی طریقے پر ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونے کے مجاز ہوجاتے ہیں، اس کو نکاح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد سے دو افراد کو ضم کیا جاتا ہے، اور ایک کو دوسرے سے ملایا جاتا ہے، عرب لفظِ ''نکاح '' کا استعمال عقدِ نکاح، جماع، استمتاع (جنسی لطف اندوزی) کے معانی میں کرتے ہیں، لیکن لفظِ نکاح کا عمومی طور پر اور اصلاً استعمال نکاح کے لیے ہوتا ہے، اور مجازی طور پر جماع کے لیے ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں بھی لفظِ ''نکاح '' کا استعمال عقدِ نکاح کے لیے ہوا ہے، جماع کے لیے نہیں، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا '' (الاحزاب ۴۹)(اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو چھونے (یعنی جماع کرنے) سے پہلے طلاق دو، تو تمھاری وجہ سے ان پر عدت نہیں ہے کہ وہ عدت پوری کریں)۔

''نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ '' کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ عقدِ نکاح کرو، کیوں کہ بعد کے ٹکڑے ''ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ '' سے اس کی دلیل ملتی ہے،

کیوں کہ اس کا معنی یہ ہے جماع کرنے اور دخول کرنے سے پہلے تم ان کو طلاق دو۔

نکاح کی مشروعیت:

اسلام نے شادی کو شروع کیا ہے، اور اس کا ایک مستحکم اور مضبوط نظام پیش کیا ہے، جس کی بنیادیں بڑی پختہ ہیں، اس میں بے حیائی اور بدکاری سے معاشرے کی حفاظت، خاندان کی فلاح و بہبودی، اچھے کردار کی ترویج، اخلاق حسنہ کی حفاظت اور بنی نوعِ انسانی کی بقا کی ضمانت اور گیارنٹی ہے۔

نکاح کی مشروعیت کی دلیل:

قرآن کریم اور حدیث شریف میں کثرت سے نکاح کی دلیلیں ملتی ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ'' (النساء ۴) (پس اپنی پسند کی دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے شادی کرو)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ'' (النور ۳۲) اور اپنے میں سے بے بیاہوں کا نکاح کر دو، اور تمھارے غلاموں اور باندیوں میں سے صالح لوگوں کا۔

نکاح سے متعلق بکثرت حدیثیں موجود ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نوجوانو! جو تم میں سے شادی کی طاقت رکھتا ہے تو وہ شادی کرے، کیوں کہ اس سے نگاہیں جھکی رہتی ہیں اور شرم گاہ کی حفاظت ہوتی ہے، اور جس میں طاقت نہ ہو تو وہ روزے رکھے، کیوں کہ روزہ اس کے لیے ڈھال ہے''۔ (صحیح بخاری: کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح حدیث ۴۷۷۹، صحیح مسلم: باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ الیہ۔ حدیث ۱۴۰۰)

شادی کی ترغیب:

اسلام نے شادی کی ترغیب دی ہے، کیوں کہ اس میں فرد اور معاشرہ دونوں کا فائدہ ہے، اور اس میں بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’دنیا فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے، اور دنیا کا بہترین سامان صالح عورت ہے‘‘۔(امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کی ہے: کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ۔حدیث ۱۴۶۷)

امام ترمذی نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’چار چیزیں رسولوں کی سنت ہے: شرم وحیا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا‘‘۔(کتاب النکاح، باب ماجاء فی فضل التزویج والحث علیہ۔حدیث ۱۰۸۰)

شادی کی مشروعیت کی حکمتیں:

شادی کی بہت سی حکمتیں ہیں اور اس میں بہت سے فائدے پنہاں ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے بنائی ہوئی انسانی فطرت کی پکار پر لبیک کہنا:

اللہ تبارک وتعالی نے انسان کو پیدا فرمایا اور اس میں جنسی جذبہ بھی رکھا، اور اس میں عورت کی خواہش بھی پیدا فرمائی، اسی طرح عورت میں بھی یہ فطری جذبہ اور خواہش رکھی گئی

چوں کہ اسلام دینِ فطرت ہے، فطری خواہشات اور جذبات کا احترام کرتا ہے اور ان خواہشات کو منظم کرتا ہے، اسی وجہ سے انسان کی گہرائیوں میں موجود اس خواہش کی ندا کو قبول کرتے ہوئے شادی کو مشروع کیا اور اس رغبت کو پورا کرنے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے نکاح ہی ایک ذریعہ ہے۔

اسلام نے اس جذبے اور خواہش کو ختم کرنے کی ترغیب نہیں دی اور شادی سے محروم

کرنے کا حکم صادر کر کے انسانی وجود کے نظام کو درہم برہم نہیں کیا، اور رہبانیت اور شادی سے دور رہنے کی دعوت دے کر انسانی وجود کو تباہ و برباد نہیں کیا۔

امام ترمذی نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "تبتل" سے منع فرمایا۔ "تبتل" یہ ہے کہ مکمل طور پر عبادت میں منسلک ہونے کے لیے عورتوں سے بے رغبت ہو جائے اور شادی نہ کرے۔ (کتاب النکاح: باب ماجاء فی النھی عن التبتل، حدیث ۱۰۸۲)

امام مسلم نے حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون کو "تبتل" کی اجازت نہیں دی، اگر آپ ان کو اجازت دیتے تو ہم خصی کر لیتے۔ (کتاب النکاح: باب ماجاء فی النھی عن التبتل۔ حدیث ۱۰۸۳)

اسی طرح اسلام نے انسان کو اس جنسی جذبے اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے مرغ بے مہار کی طرح بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑا ہے کہ وہ خود بھی بگڑ جائے اور دوسروں کو بھی بگاڑ دے، اخلاق حسنہ کا خون ہو، گھر اور خاندان کے نظام درہم برہم ہو جائیں، شیطان کی گمراہی اور وسوسوں کے لیے تمام دروازے کھل جائیں، بلکہ اسلام نے معتدل اور درمیانی راہ اختیار کی ہے، اسی لیے فطرتِ انسانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے جنسی خواہش کو اس طرح منظم کیا ہے کہ نوعِ انسانی کے وجود اور اس کے مسلسل بقا میں شادی اپنا تعمیری کردار ادا کرے۔

۲۔ صالح نسل اور مہذب اولاد کے ذریعے اسلامی معاشرے میں وسعت:

اسلام نے نسل میں اضافہ کرنے کی دعوت اور ترغیب دی ہے اور اس کو شادی کا ایک مقصد بتایا ہے، تا کہ اسلامی معاشرہ دوسروں کے لیے قابلِ ہیبت بن جائے اور دشمن اس کی تعداد سے خوش نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "زیادہ جننے والی اور زیادہ چاہنے والی عورت کے ساتھ شادی کرو، کیوں کہ میں قیامت کے دن تمھارے ذریعے دوسری قوموں پر کثرت ثابت کروں گا"۔ (ابوداود: کتاب النکاح: باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث ۲۰۵۰، سنن نسائی: کتاب النکاح: باب کراھیۃ تزویج العقیم ۶/ ۶۵)

اسی وجہ سے قرآن کریم نے شادی کی ترغیب دی ہے اور ذمے داروں کو اپنے بچوں اور بچیوں کی شادی کرانے کی طرف متوجہ کیا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ "(النور۳۲)اور اپنے میں سے بے بیاہوں کا نکاح کردو،اور تمھارے غلاموں اور باندیوں میں سے صالح لوگوں کا۔

شادی کے ذریعے معاشرے کی افرادی قوت میں ایسی نسل کے ذریعے اضافہ ہوتا ہے جو رحم دل اور مشفق والدین کے سایے میں پرورش پاتے ہیں،جن کو معلوم رہتا ہے کہ وہ اس نسل کے افکار کو کس انداز میں ڈھالیں؟ان کی صلاحیتوں کی کس طرح تربیت کریں؟ یہ معاشرہ اس معاشرے سے کئی گنا بہتر ہے جہاں کی آبادی میں اضافہ زنا کاری اور حرام کاری کے نتیجے میں ہوتا ہے،ان کو اپنے والد کا علم نہیں ہوتا، پھر ان پر توجہ کون دے گا؟ان کو اپنی مشفق اور مہربان ماں کے بارے میں معلوم نہیں رہتا،ان کی پرورش اس انداز میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اپنے معاشرے،اپنی قوم اور ہر انسان کے خلاف حسد، دشمنی اور ناپسندیدگی کا جذبہ رکھتے ہیں،جس کے بڑے ہی سنگین نتائج رونما ہوتے ہیں۔

۳۔نفس کو سکون ملتا ہے اور روح کو استقرار نصیب ہوتا ہے:

شرعی شادی سے طمانیت،سکون اور نفسیاتی امن حاصل ہوتا ہے،اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے:"وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا، وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ "(روم ۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم کا جذبہ رکھا، بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس آیت میں شادی کی ضرورت اور اس سے حاصل ہونے والی سعادت،استقرار اور سکون کو بڑے ہی بدیع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالی دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: ”هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ“ (بقرہ ۱۸۷) وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس آیت کریمہ میں شوہر اور بیوی دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے، کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کو چھپاتے ہیں۔شوہر کو بیوی کی اور بیوی کو شوہر کی ضرورت اسی طرح ہوتی ہے، جس طرح انسان کو کپڑوں کی ضرورت رہتی ہے، کپڑا جسم کے عیوب کو چھپاتا ہے، تکلیف دہ چیزوں سے بدن کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح شوہر اور بیوی ایک دوسرے کی عزت وناموس کی حفاظت کرتے ہیں اور راحت کا خیال رکھتے ہیں، اور دونوں میں انسیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ اخلاق میں گراوٹ آنے سے حفاظت ہوتی ہے:

اگر انسان کو شرعی نکاح سے منع کردیا جاتا تو اس کا دل اپنی خواہش کو ممنوع طریقے سے پورا کرنے کے راستے تلاش کرتا، ہر ایک جانتا ہے کہ زنا کاری سے اخلاق بگڑتے ہیں، خاندان برباد ہوتے ہیں، عزتیں پامال ہوتی ہیں، بیماریاں پھیلتی ہیں اور دل اور روح کو قرار نصیب نہیں ہوتا ہے۔

اخلاق کی حفاظت اور فساد وبگاڑ سے اجتناب کے لیے ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تمھارے پاس کسی ایسے شخص کا رشتہ آئے جس کے دین اور اخلاق پر تم راضی ہو تو اس کی شادی کرادو، اگر اس طرح نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ اور فساد پھیلےگا“۔(سنن ترمذی: باب ماجاء اذا جاءکم من ترضون دینہ فزوجوہ، حدیث ۱۰۸۵۔ یہ روایت حضرت ابو حاتم مزنی رضی اللہ عنہ سے ہے)

۵۔ نسلِ انسانی کی حفاظت:

اللہ تبارک وتعالی کا یہ قانون ہے کہ انسان والدین یعنی ایک مرد اور ایک عورت ہی سے پیدا ہو۔اسلام نے مرد اور عورت کے ملاپ کو صرف شرعی طریقے پر شادی کی بنیاد ہی پر حلال کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے بنی نوع انسانی کی حفاظت کو شادی میں منحصر کیا ہے، اگر شادی حرام قرار دی جاتی تو انسانی نسل ختم ہو جاتی، اگر حرام کاری کی

اجازت ہوتی تو یہ انسان بد بخت اور مریض بن جاتا۔ اللہ سبحانہ وتعالی اپنے بندوں سے بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اوران کے لیے برائی کو پسند نہیں فرماتا۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:
"إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ"۔(البقرہ ۱۴۳) بے شک اللہ لوگوں پر بڑا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

۶۔ رشتے داری کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے تعاون کی بنیاد پڑتی ہے:
شادی سے رشتے داری کا دائرہ بڑھتا ہے، اس کے نتیجے میں دو خاندان کا ملاپ ہوتا ہے، اور مصاہرت (سسرالی رشتہ) کی وجہ سے ان کے درمیان نئے تعلقات بنتے ہیں اور آپس میں محبت ہوتی ہے۔

شادی سے شوہر اور بیوی کے درمیان تعاون ہوتا ہے، کیوں کہ بیوی شوہر کے کاموں میں تعاون کرتی ہے: اس کے کھانے پینے، پہننے اور رہنے سہنے، بچوں کی تربیت اور گھر کی دیکھ ریکھ کرتی ہے اور شوہر بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنے، اس کے اخراجات اٹھانے، اس کے دفاع، اس کی حفاظت اور اس کی عزت کی رکھوالی میں تعاون کرتا ہے۔

اسلام ایک دوسرے کی کفالت اور تعاون کا دین ہے، لہذا اسلام ان تمام مصلحتوں کی تکمیل کے لیے شادی کو شرعی حیثیت عطا کرتا ہے۔

نکاح کا شرعی حکم

انسان کے حالات کے اعتبار سے نکاح کا حکم مختلف ہوتا ہے، نکاح کبھی مستحب ہے تو کبھی جائز، اور کبھی مکروہ ہے تو کبھی افضل۔

۱۔ مستحب:

اگر آدمی کو شادی کی ضرورت ہو، اس کو شادی کرنے کی خواہش بھی ہو، اور اس کے پاس مہر دینے اور اپنی بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت بھی ہو، اس کے ساتھ شادی نہ کرنے پر زنا میں مبتلا ہونے کا خطرہ اور اندیشہ نہ ہو تو اس صورت میں شادی کرنا مستحب ہے، کیوں کہ اس میں اس کی نسل کی بقا بھی ہے اور نسل کی حفاظت بھی اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نوجوانو! جو تم میں سے شادی کی طاقت رکھتا ہے تو وہ شادی کرے، کیوں کہ اس سے نگاہیں جھکی رہتی ہیں اور شرم گاہ کی حفاظت ہوتی ہے، اور جس میں طاقت نہ ہو تو وہ روزے رکھے، کیوں کہ روزہ اس کے لیے ڈھال ہے"۔ (صحیح بخاری: کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح حدیث ۴۷۷۹، صحیح مسلم: باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ الیہ۔ حدیث ۱۴۰۰)

اس صورت میں صرف عبادت میں مشغول رہنے سے شادی کرنا افضل ہے۔

اس لیے کہ جب بعض صحابہ نے شادی نہ کرکے صرف عبادت میں مشغول ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ان کو شادی کی ترغیب دی۔

امام مسلم وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بعض صحابہ نے نبی کریم ﷺ کی بیویوں سے آپ کے خلوت کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا۔ ان کا

جواب سن کران میں سے ایک نے کہا: میں عورتوں سے شادی نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ تیسرے نے کہا: میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ آپ ﷺ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا: "ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جنھوں نے اس طرح کہا ہے۔ لیکن میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقے سے بے رغبت ہو جائے تو وہ مجھ میں سے نہیں"۔ (کتاب النکاح باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ إلیہ۔ حدیث ۱۴۰۱)

مرد کی طرح عورت کا بھی یہی حکم ہے، اگر وہ اپنی حفاظت، اپنے دین کی حفاظت، اپنے نفقے اور خرچے کے حصول کی ضرورت مند ہو تو اس کے لیے بھی شادی کرنا مستحب ہے

۲۔ شادی نہ کرنا مستحب ہے یعنی شادی کرنا مکروہ اور خلافِ اولی ہے:

کوئی شخص شادی کا ضرورت مند ہو، لیکن اس کے پاس شادی کے اخراجات نہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے شادی نہ کرنا مستحب ہے۔

اس صورت میں عبادت اور روزوں کے ذریعے اپنی جنسی خواہش کو کمزور کرنا اور پاکدامنی اختیار کرنا ضروری ہے، کیوں کہ عبادت اور روزے میں مشغول ہونے کی صورت میں وہ شادی کے بارے میں سوچنے سے مشغول ہو جائے گا، اس صورت میں عبادت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالی اس کو اپنے فضل واحسان سے بے نیاز فرمادے اور شادی کے وسائل پیدا کردے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" (سورہ نور ۳۳) اور وہ لوگ پاک دامنی اختیار کریں جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتے ہیں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو بے نیاز کردے۔

یہ حکم نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے بھی معلوم ہوتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے جس میں شادی کی طاقت ہو تو وہ شادی کرے"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے پاس شادی کی طاقت نہ ہو تو شادی نہ کرنا مستحب ہے۔

اس صورت میں بھی شادی کرنا مکروہ ہے جب اس کو شادی کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اس میں جنسی خواہش ہی نہ ہو، چاہے بے رغبتی فطری ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے ہو، اور اس کے پاس شادی کے لیے ضروری ساز و سامان اور تیاری نہ ہو، کیوں کہ نکاح کی صورت میں مہر اور بیوی کے اخراجات لازم آتے ہیں، اور اس میں اس کی طاقت نہیں ہے، اس صورت میں شادی کرنا مکروہ ہے۔

۳۔شادی نہ کرنا افضل ہے

یہ اس صورت میں ہے جب شادی کے لیے ضروری مال ہو، لیکن وہ شادی کی خواہش نہ رکھتا ہو اور وہ عبادت یا طلبِ علم میں مشغول ہو، کیوں کہ عبادت اور علم کی تلاش اور جستجو کے لیے فارغ ہونا شادی کرنے سے افضل ہے، شادی کی صورت میں وہ عبادت اور طلبِ علم سے غافل ہو جائے گا۔

۴۔شادی کرنا افضل ہے

اگر کوئی عبادت میں مشغول نہ ہو اور نہ علم کے حصول کے لیے فارغ ہو اور اس کے پاس شادی کے لیے ضروری سامان موجود ہو تو اس صورت میں شادی کرنا افضل ہے، تاکہ فراغت اور عدمِ مشغولیت کی وجہ سے گناہوں کا مرتکب نہ ہو جائے، شادی کی صورت میں اس کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے، اولاد کی پیدائش اور افزائشِ نسل میں مدد ملے گی۔

اسلام میں خاندان کا مقام ومرتبہ
اور خاندان کے قیام پر مکمل توجہ

خاندان کی تعریف:

''أسرة''عربی لفظ ہے، اردو میں اس کے لیے خاندان کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اس کے لغوی معنی مجموعۂ افراد کے ہیں یعنی چند افراد کا ایک گروہ۔

اسلامی نظام میں خاندان سے مراد وہ مجموعۂ افراد ہے جس میں آباء واجداد، ماں، دادیاں ونانیاں، بچے بچیاں اور پوتے نواسے شامل رہتے ہیں۔

خاندان معاشرے کا بنیادی ستون ہے

ایک طرف معاشرے کی تعمیر میں فرد بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف خاندان معاشرے کے ڈھانچے کا سرگرم رکن ہے، اس کے بغیر معاشرے کی تعمیر کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

فرد خاندان کا ایک حصہ ہے، اسی سے فرد اپنی ابتدائی خصوصیات اور صفات حاصل کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:''ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ''(آل عمران ۳۴) یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے۔

اسی طرح فرد خاندان کے رنگ میں رنگتا ہے اور اس کی تربیت سے متاثر ہوتا ہے، اور اس کے اثرات فرد کی پوری زندگی میں نظر آتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''ہر بچے کی پیدائش فطرت کے مطابق ہوتی ہے، چناں چہ اس کے والدین اس کو یہودی بناتے

ہیں، یا عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں، جس طرح جانور مکمل (کسی نقص کے بغیر) جانور کو جنم دیتا ہے، کیا تم ان میں کسی کو ناک کٹا دیکھتے ہو۔ (مسلم: کتاب القدر ۲۶۵۸)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب بچے کو جنم دیتا ہے تو وہ بچہ فطرتِ سلیمہ پر ہی رہتا ہے اور خیر کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، بالفاظ دیگر وہ اللہ پر ایمان رکھنے والا اور مسلمان رہتا ہے، اگر اس کو تنہائی میں چھوڑ دیا جائے اور ماحول کا اس پر اثر نہ ہونے دیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ دوسری چیزوں سے واقف نہ ہو، لیکن وہ بچہ ایمان والا ضرور ہوگا، لیکن اس کے والدین اور ماحول اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں رنگتے ہیں۔

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فرد خاندان کا حصہ ہوتا ہے اور خاندان معاشرے کا ایک جزء اور اس کا بنیادی ستون ہے، جب خاندان صالح ہوگا تو فرد صالح بنے گا، اگر فرد صالح ہوگا تو خاندان بھی صالح ہوگا اور پورا معاشرہ صالح بن جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خاندانی نظام پر بڑی توجہ دی ہے اور قرآن وحدیث کے احکام کا بہت بڑا حصہ خاندانی نظام سے متعلق ہے۔

اسلام میں خاندان پر توجہ کے چند نمونے

اسلام میں خاندان پر توجہ کی وضاحت ان احکام سے ہوتی ہے جو خاندان کو منظم کرنے کے لیے شروع کیے گئے ہیں، جس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ شادی کا حکم

خاندان کے ستونوں کو مستحکم بنانے کے لیے اسلام میں شادی کا حکم دیا گیا ہے، کیوں کہ شادی کے بغیر خاندان کا تصور ہی نہیں ہے، جو بھی جنسی تعلق مرد اور عورت کے بیچ شادی کے بغیر قائم ہوتا ہے وہ زنا اور بدکاری ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا'' (سورہ اسراء ۳۲) اور زنا سے قریب مت جاؤ، بے شک یہ بڑی فحش چیز ہے اور برا راستہ ہے۔

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ''مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ أَخْدَانٍ'' (سورہ مائدہ ۵) جب تم انہیں ان کا مہر دو، پاک دامن بناتے ہوئے، نہ کہ مستی نکالتے ہوئے اور نہ آشنا بناتے ہوئے۔

۲۔ میاں بیوی کے حقوق اور ذمے داریاں

اسلام نے مرد پر اپنی بیوی کے چند حقوق لازم کیے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مہر: اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً'' (سورہ نساء ۴) اور عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے دو۔

۲۔ نفقہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (بقرہ ۲۳۳) اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اور تم پر ضروری ہے کہ ان (عورتوں) کو کھانا اور کپڑا بھلائی کے ساتھ دو''۔ (مسلم: کتاب الحج ۱۲۱۸) یہ طویل حدیث کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ بہترین سلوک کرنا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (سورہ نساء ۱۹) اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

اسلام نے جس طرح شوہر پر چند حقوق ضروری قرار دیے ہیں، اسی طرح عورت پر بھی اپنے شوہر کے چند حقوق ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ گناہ کے علاوہ دوسرے سبھی امور ومعاملات میں شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری: اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ'' (سورہ نساء ۳۴) مرد عورتوں پر ذمے دار ہیں۔

۲۔ شوہر کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کسی کو گھر میں نہ لے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان (عورتوں) پر تمھارا یہ حق ہے کہ تمھارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ بٹھائے جس کو تم ناپسند کرتے ہو''۔ (مسلم ۱۲۱۸)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ تمھارے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل ہونے اور بیٹھنے کی اجازت نہ دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔

۳۔عورت اپنے شوہر کی عزت اور مال کی حفاظت کرے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''کیا میں تم کو مرد کے خزانوں میں سب سے بہترین چیز کے بارے میں نہ بتاؤں؟ نیکوکار عورت...... اگر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہوجائے، اس کو حکم دے تو بجالائے، اگر اس کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے تو اپنی ذات اور اس کے مال میں اس کی حفاظت کرے''۔ (ابو داود: باب فی حقوق المال ۱۶۶۴، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے)

۴۔اولاد اور والدین کے حقوق

اسلام نے والدین پر اپنی اولاد کے تئیں چند حقوق متعین کیے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔نفقہ یعنی اپنی اولاد پر خرچ کرنا: اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' (سورہ طلاق ۶) پس اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو۔

اللہ عزوجل نے بچوں کو دودھ پلانے پر اجرت دینا ضروری قرار دیا ہے جو بچوں کے اخراجات میں سے ہے۔

۲۔بہترین تربیت دینا اور عبادات واخلاق کی تعلیم دینا: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنی اولاد کو تین چیزوں کا ادب سکھاؤ: اپنے نبی کی محبت، آل بیت کی محبت اور قرآن کی تلاوت''۔ (دیلمی نے یہ روایت کی ہے)

نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: ''سن لو! تم میں سے ہر ایک ذمے دار ہے اور وہ اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، چناں چہ امیر لوگوں کا ذمے دار ہے، اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، ہر شخص اپنے گھر والوں کا ذمے دار ہے، اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی ذمے دار ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے، غلام اپنے آقا کے مال کا ذمے دار ہے اور وہ اس کے بارے میں

جواب دہ ہے، سن لو! تم میں سے ہر ایک ذمے دار ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔(بخاری: کتاب الجمعۃ ۸۵۳، مسلم: کتاب الامارۃ ۱۸۲۹)

اسلام نے اولاد پر مندرجہ ذیل ذمے داریاں عائد کی ہے:

۱۔اللہ کی معصیت کے علاوہ میں اپنے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری اوران کے ساتھ بہتر سلوک: اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:''وَقَضٰـی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ''(اسراء ۲۳) اورتمہارے پروردگار نے فیصلہ کیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:''وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ''(سورہ لقمان ۱۵) ان کے ساتھ دنیا میں بھلائی کے ساتھ رہو۔

اگر والدین کے پاس مال نہیں ہے اور بچہ مالدار ہے تو ان کے اخراجات برداشت کرنا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''سب سے بہترین مال وہ ہے جو آدمی اپنی کمائی سے کھاتا ہے اور اس کا بچہ اس کی کمائی میں سے ہے''۔ایک اور حدیث میں آیا ہے:''تم اور تمھارا مال والد کا ہے، تمھاری اولاد تمھاری بہترین کمائی ہے، چناں چہ اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ''(ابوداود: کتاب البیوت والاجارات ۳۵۲۸، ترمذی: ابواب الأحکام ۱۳۵۸)

خاندان کو منظم کرنے سے متعلق بہت سے احکام ہیں، ان احکام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے خاندان پر کتنی توجہ دی ہے اور اس کے قیام کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے۔

وہ عورتیں جن کے ساتھ شادی کرنا حرام ہے

تمہید:

جب اسلام نے شادی کو شروع کیا اور اس کی ترغیب دی تو بعض عورتوں سے شادی کرنا حرام قرار دیا، اس کے کئی اسباب اور وجوہات ہیں: ان عورتوں کا احترام اور قدر دانی ضروری ہونے کی وجہ سے مثلاً ماں کے ساتھ نکاح کرنا حرام قرار دیا۔

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتِ سلیمہ ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنا گوارا نہیں کرتی۔ مثلاً بیٹی اور بہن کے ساتھ شادی کو کوئی بھی شخص پسند نہیں کرتا ہے۔

یا اس وجہ سے کہ بہت ہی قریبی رشتے داروں کے ساتھ شادی کرنے کی صورت میں نکاح کا مقصد (عفت وپاکدامنی) ہی حاصل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً بھانجیوں یا بھتیجیوں کے ساتھ شادی، پوتیوں اور نواسیوں کے ساتھ نکاح، کیوں کہ ان عورتوں کے ساتھ کثرت سے اختلاط رہتا ہے اور ہر وقت ان کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔

یا اس کی وجہ خاندان کی تعمیر میں انتظامی ترتیب ہے مثلاً رضاعی بہن اور بھتیجیوں وغیرہ کے ساتھ شادی۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے بعض عورتوں کے ساتھ شادی کو ممنوع قرار دیا، جس کی تفصیلات اگلے صفحات میں آرہی ہیں۔

شادی کی حرمت کی قسمیں:

بعض عورتوں کے ساتھ شادی کرنا حرام ہونے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ دائمی حرمت ۲۔ وقتی حرمت

دائمی حرمت :اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ کسی بھی صورت میں شادی کرنا جائز نہیں ہے، چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔

دائمی حرمت کے اسباب

دائمی حرمت کے تین اسباب ہیں:

۱۔رشتے داری ۲۔رشتۂ مصاہرت ۳۔رضاعت

رشتے داری کی وجہ سے جن عورتوں کے ساتھ شادی حرام ہے وہ سات ہیں:

۱۔ماں، نانی، دادی، اسی طرح انسان کے سبھی آباء واجداد اور امہات، ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔بیٹی، پوتی، نواسی، اسی طرح انسان کے سبھی فروع۔

۳۔بہن: چاہے بہن حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی یعنی دونوں کے والدین ایک ہوں یا صرف باپ یا ماں ایک ہو۔اسی طرح ان کی اولاد (بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں وغیرہ نیچے تک) کے ساتھ بھی شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

۴۔حقیقی، علاتی یا اخیافی بھائی کی اولاد یعنی بھتیجیاں۔

۵۔حقیقی، علاتی یا اخیافی بہن کی اولاد یعنی بھانجیاں۔

۶۔پھوپھی، اسی طرح باپ کی پھوپھی اور ماں کی پھوپھی۔

۷۔خالہ، اسی طرح ماں کی خالہ اور باپ کی خالہ۔

ان میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

ان سبھی عورتوں کے ساتھ شادی کی حرمت قرآن کریم میں آئی ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''**حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ** ......'' (سورہ نساء ۲۳) تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں، اور بھتیجیاں اور بھانجیاں......

اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرے تو عقدِ نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا، اگر کوئی ان کے ساتھ شادی کرنا جائز سمجھے تو وہ کافر ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رشتۂ مصاہرت کی بنا پر حرام ہونے والی عورتیں

رشتۂ مصاہرت کی وجہ سے چار عورتیں دائمی طور پر حرام ہو جاتی ہیں:

۱۔ والد کی بیوی: اسی طرح دادا کی بیوی، نانا کی بیوی کے ساتھ بھی شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: **"وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَائُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا"** (سورہ نساء ۲۲) اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن کے ساتھ تمھارے والد نے نکاح کیا ہے، مگر جو پہلے ہو چکا، بے شک یہ بڑی فحش بات ہے اور برا راستہ ہے۔

۲۔ بہو (بیٹے کی بیوی)، اسی طرح پوتے کی بیوی اور نواسے کی بیوی، اسی طرح ان کی اولاد کی بیویوں کے ساتھ بھی شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے: **"وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُم"** (سورہ نساء ۲۳) اور تمھاری صلبی اولاد کی بیویاں۔

اس آیت کریمہ سے منھ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے کی حرمت کی نفی ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں صلبی اولاد کی بیوی کا تذکرہ ہے، زمانۂ جاہلیت میں لوگ بچوں کو گود لیتے تھے اور منھ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ شادی کو حرام قرار دیتے تھے، اسلام نے منھ بولا بیٹا بنانے کو باطل کر دیا اور منھ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: **"وَمَا جَعَلَ مِنْ أَدْعِيَائِكُمْ أَبْنَائَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ"** (سورہ احزاب ۴) اور اللہ نے تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے نہیں بنایا، یہ تمھارے منھ سے نکلی ہوئی بات ہے، اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا" (سورہ احزاب ۳۷) تاکہ مومنوں کے لیے ان کے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں میں (ان کے ساتھ شادی کرنے میں) کوئی حرج نہ ہو جب وہ ان کے ساتھ اپنی ضرورت کو پورا کریں اور اللہ کا معاملہ ہو کر رہتا ہے۔

۲۔ساس سے شادی کرنا بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ" (سورہ نساء ۲۳) اور تمھاری بیویوں کی مائیں۔

اسی طرح بیوی کی نانی دادی اور اوپر تک ماں کے اصول کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

یہ تینوں عورتیں صرف شادی کرتے ہی حرام ہو جاتی ہیں، چاہے اس کے بعد جماع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اگر ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرے تو عقدِ نکاح صحیح ہی نہیں ہوگا۔

۴۔بیوی کی بیٹی: یہ اپنی ماں کے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے، لیکن صرف عقدِ نکاح سے ہی حرام نہیں ہوتی ہے، بلکہ شادی کے بعد جماع بھی ہو جائے تو حرام ہو جاتی ہے، اگر صرف عقدِ نکاح کے بعد جدائی ہو جائے تو اس بچی کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (سورہ نساء ۲۳) اور تمھاری پروردہ جو تمھاری ان بیویوں سے تمھاری پرورش میں ہیں جن کے ساتھ تم نے جماع کیا ہے، پس اگر تم نے ان کے ساتھ جماع نہیں کیا ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے (کہ تم ان سے شادی کرو)۔

بیوی کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا حرام ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسی کے ساتھ رہتی ہو، اور اسی کی پرورش میں ہو، بلکہ وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ یہاں آیتِ کریمہ میں پرورش میں رہنے کی قید کا تذکرہ اس لیے ہے کہ اکثر اوقات بچی اپنی ماں کی ہی پرورش میں رہتی ہے۔

رضاعت کی بنیاد پر حرام ہونے والی عورتیں

رضاعت کی وجہ سے بھی سات عورتیں حرام ہوجاتی ہیں جن میں سے دو کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے اور بقیہ کا تذکرہ احادیث نبویہ میں ملتا ہے، یہ سات عورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رضاعی ماں: اس سے مراد وہ عورت ہے جس نے دودھ پلایا ہے، اس میں رضاعی ماں کی ماں، اس کی دادی اور نانی وغیرہ بھی شامل ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ رضاعی بہن: وہ عورت جو رضاعی ماں کی بیٹی ہو، یا وہ عورت جس نے خود اِس کی ماں سے دودھ پیا ہو، یا دونوں نے ایک عورت سے دودھ پیا ہو۔

اگر عورت نے کسی کی ماں سے دودھ پیا ہو تو وہ خود اس کے لیے اور اس کے تمام بھائیوں کے لیے حرام ہو جاتی ہے، البتہ اس عورت کی بہنیں اس کے لیے حرام نہیں ہے، کیوں کہ انھوں نے اِس کی ماں سے دودھ نہیں پیا ہے۔

اگر تم نے کسی عورت کی ماں کا دودھ پیا ہے تو وہ اور اس کی سبھی بہنیں تمھارے لیے حرام ہوجاتی ہیں، البتہ اس سے اور اس کی بہنوں سے تمھارے بھائی شادی کرسکتے ہیں، کیوں کہ تمھارے بھائیوں نے اِس عورت کی ماں سے دودھ نہیں پیا ہے۔

رضاعی ماں اور بہن کی حرمت کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: "**وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ**" (سورۂ نساء:۲۳) اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمھاری رضاعی بہنیں۔

۳۔ رضاعی بھتیجی

۴۔ رضاعی بھانجی

۵۔ رضاعی پھوپھی: وہ عورت جس نے تمھارے والد کے ساتھ دودھ پیا ہو۔

۶۔ رضاعی خالہ: وہ عورت جس نے تمھاری ماں کے ساتھ دودھ پیا ہو۔

۷۔ رضاعی دختر: وہ لڑکی جس نے تمھاری بیوی کا دودھ پیا ہو، اس صورت میں تم اس

کے رضاعی باپ بن جاتے ہو۔

ان عورتوں کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''رضاعت سے وہ تمام عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو ولادت یعنی رشتے داری کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں''۔ (بخاری ومسلم: یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے)

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی دختر کے سلسلے میں فرمایا: ''وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، نسب کی وجہ سے جو حرام ہے وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہے، یہ میری رضاعی بھتیجی ہے''۔ (بخاری: کتاب الشھادات ۲۵۰۲، ۲۵۰۳، مسلم: کتاب الرضاع ۱۴۴۴، ۱۴۴۷)

اسی طرح عورت کے لیے اس کا رضاعی باپ، رضاعی بیٹا، رضاعی بھائی، رضاعی بھتیجہ، رضاعی چچا اور ماموں حرام ہیں۔

رشتۂ مصاہرت میں بھی رضاعت کی وجہ سے مندرجہ ذیل عورتیں حرام ہو جاتی ہیں:

۱۔ رضاعی ماں: وہ عورت جس نے تمھاری بیوی کو دودھ پلایا ہو۔

۲۔ بیوی کی رضاعی دختر: وہ لڑکی جس نے تمھاری بیوی کا اس وقت دودھ پیا ہو، جب وہ دوسرے کی زوجیت میں تھی۔

۳۔ رضاعی باپ کی بیوی: اس شخص کی بیوی جس کی دوسری بیوی سے تم نے دودھ پیا ہو۔

۴۔ رضاعی بیٹے کی بیوی: اس شخص کی بیوی جس نے تمھاری بیوی سے دودھ پیا ہو۔

وقتی حرمت:

بعض عورتیں وقتی طور پر حرام رہتی ہیں، یہ وہ عورتیں ہیں جو کسی سبب کی بنیاد پر حرام ہو جاتی ہیں، جب سبب زائل ہو جاتا ہے تو ان کے ساتھ شادی کرنا جائز ہو جاتا ہے، اگر اس سبب کے ختم ہونے سے پہلے ایسی عورت سے شادی کرے تو شادی باطل ہو جاتی ہے۔

یہ عورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دو بہنوں کے ساتھ ایک ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے

چاہے یہ دو بہنیں حقیقی ہوں، یا رضاعی، چاہے ان کے ساتھ عقدِ نکاح ایک ہی ساتھ کیا جائے یا الگ الگ اوقات میں۔

اگر ان دونوں سے عقدِ نکاح ایک ہی ساتھ کرے تو دونوں عقد باطل ہو جائیں گے، اگر الگ الگ اوقات میں کرے تو دوسری کے ساتھ کی ہوئی شادی صحیح نہیں ہوگی۔

اگر ایک کا انتقال ہو جائے یا طلاق دی جائے اور اس کی عدت گزر جائے تو اپنی اس بیوی کی بہن کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ”وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا“ (سورہ نساء ۲۳) اور یہ کہ تم دو بہنوں کے درمیان جمع کرو (ان سے ایک ساتھ شادی کرو) مگر جو ہو چکا، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بڑا رحم فرمانے والا ہے۔

۲۔ عورت اور اس کی پھوپھی، عورت اور اس کی خالہ، عورت اور اس کی بھتیجی یا بھانجی یا نواسی یا پوتی کے ساتھ ایک ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے:

فقہائے کرام نے ایک قاعدہ اور اصول بنایا ہے جس سے کن عورتوں کے ساتھ ایک ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے واضح ہو جاتا ہے، وہ قاعدہ یہ ہے: ”ان دو عورتوں کو ایک ساتھ اپنی زوجیت میں لینا جائز نہیں ہے کہ اگر ان دو میں سے ایک کو مرد تصور کیا جائے تو دونوں کی شادی جائز نہ ہو“۔ اس میں وہ سبھی عورتیں آجاتی ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عورت اور اس کی پھوپھی، اور عورت اور اس کی خالہ کو ایک ساتھ اپنی زوجیت میں نہیں لیا جائے گا“۔ (بخاری: کتاب النکاح ح ۴۸۲۰، مسلم: کتاب النکاح ح ۱۴۰۸)

اس حرمت کی حکمت

مندرجہ بالا عورتوں کو ایک ساتھ اپنی زوجیت میں لینے کی ممانعت کی حکمت یہ ہے کہ

اس سے قریبی رشتے داروں میں دشمنیاں پیدا ہو جائیں گی، کیوں کہ سوکنوں کے درمیان آپس میں چپقلش پائی جاتی ہے اور وہ دوسرے کے تئیں غیرت رکھتی ہیں۔

ابن حبان نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھوپھی اور خالہ کی موجودگی میں ان کی بھتیجی اور بھانجی سے شادی کرنے سے منع کیا اور فرمایا: اگر تم اس طرح کروگے تو اپنی رشتے داریوں کو توڑ دوگے۔

ابو داود نے مراسیل میں عیسی بن طلحہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قطع تعلق کے اندیشے سے دو رشتے دار عورتوں کے ساتھ ایک ساتھ شادی کرنے سے منع فرمایا۔ (نیل الاوطار: ۶/ ۱۴۷)

اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے یا طلاق دی جائے اور اس کی عدت گزر جائے تو دوسری کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے۔

۴۔ چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنا جائز نہیں ہے

اگر کسی کی چار بیویاں موجود ہوں تو پھر پانچویں کے ساتھ شادی کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے، جب تک ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی عدت گزر نہ جائے، یا کسی کا انتقال ہو جائے، اگر کسی کا انتقال ہو جائے یا کسی کو طلاق دی جائے تو پانچویں کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ '' (النساء۴) (پس اپنی پسند کی دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے شادی کرو)

امام ابو داود نے قیس بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں اسلام لے آیا تو میری آٹھ بیویاں تھیں، چناں چہ میں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''ان میں سے چار کا انتخاب کرو''۔ (ابو داود: کتاب الطلاق)

۵۔ بت پرست مشرک عورت سے شادی جائز نہیں ہے

یہ وہ عورت ہے جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ ہو، یعنی وہ کسی آسمانی کتاب کی ماننے والی نہ ہو، اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اس کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک

وتعالی کا ارشاد ہے: "وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ" (سورہ بقرہ ۲۲۱) اور مشرک عورتوں کے ساتھ شادی نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، اور مومن باندی مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو پسند آجائے۔

۱۔ مسلم عورت کے لیے کسی بھی غیر مسلم سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، چاہے اس کا دین کوئی بھی ہو، کیوں کہ بیوی پر شوہر کو ولایت حاصل رہتی ہے، اور کافر کے لیے کسی مسلم پر ولایت حاصل نہیں ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غیر مسلم شوہر کی زوجیت میں رہنے کی صورت میں عورت کا دین باقی رہنے کا بھروسہ نہیں رہتا ہے، کیوں کہ وہ دینِ اسلام پر ایمان نہیں رکھتا ہے، اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا" (سورہ نساء ۱۴۱) اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر راہ نہیں بنائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: "وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ، أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ" (سورہ بقرہ ۲۲۱) اور تم مشرکوں کے ساتھ شادی نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، اور مومن غلام مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو پسند آجائے، وہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی اجازت سے جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے، اور لوگوں کے لیے اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اگر کافر اسلام لے آئے تو اس کے لیے مسلم عورت حلال ہوجاتی ہے، اگر اسلام لانے سے پہلے شادی کرلے تو یہ شادی باطل ہوجائے گی، اور فوراً ان دونوں کے درمیان جدائی کرنا ضروری ہے، اگر جماع ہوجائے تو زنا ہوگا۔

۲۔ مسلم مرد کے لیے یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرنا جائز ہے، کیوں کہ کبھی یہ اس عورت کے اسلام کا سبب بن جاتا ہے، اسی طرح اس عورت کے گھر والوں کے اسلام قبول کرنے اور اسلام سے واقف ہونے اور اس میں رغبت پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

یہودی یا عیسائی بیوی کو اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کرنا مسلمان شوہر کے لیے جائز نہیں

ہے، اسی طرح اُس کی عبادت میں روڑے ڈالنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے: "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ أَخْدَانٍ" (سورہ مائدہ ۵) اوران لوگوں کا کھانا جن کوکتاب دی گئی ہے تمھارے لیے حلال ہے اورتمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے، اور پاک دامن مومن عورتیں اورتم سے پہلے کتاب عطا کردہ پاک دامن عورتیں جب تم انہیں ان کا مہر دو، پاک دامن بناتے ہوئے، نہ کہ مستی نکالتے ہوئے اورنہ آشنا بناتے ہوئے۔

۵۔شادی شدہ عورت کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے

کسی شخص کے لیے اس عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہے جس کا شوہر موجود ہو اور وہ اس کی زوجیت میں باقی ہو، اگر پہلا شوہر مرجائے یا اس عورت کو طلاق دے اوراس کی عدت گزرجائے تو اس کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی نے ان عورتوں کے ضمن میں شادی شدہ عورت کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کے ساتھ شادی کرنا حرام ہے: "وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ" (سورہ نساء ۴) اورشادی شدہ عورتیں۔

۶۔عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے

کسی شخص کے لیے اس عورت کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے، جو ابھی عدت میں ہو اوراس کی عدت مکمل نہ ہوئی ہو، چاہے یہ عدت طلاق کی ہو یا شوہر کے انتقال کی، جب عدت ختم ہوجائے تو اس کے شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَه" (سورہ بقرہ ۲۳۵) اورتم عقدِ نکاح کا ارادہ مت کرو یہاں تک کہ کتاب اپنی مدت تک پہنچ جائے یعنی عدت ختم ہوجائے۔

۷۔ جس عورت کو تین طلاق دیا ہو اس کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو پھر اس کے ساتھ دوبارہ اس وقت تک شادی کرنا جائز نہیں ہے، جب تک مندرجہ ذیل شرطیں نہ پائی جائیں:

اس عورت کا نکاح دوسرے مرد سے ہو اور وہ اس سے جماع کر چکا ہو۔

پھر اس کو دوسرا شوہر طلاق دے اور اس کی عدت گزر جائے۔

اگر دوسرا شوہر اس کے ساتھ جماع نہ کرے اور طلاق دے دے تو پہلے شوہر کو اس عورت کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

اس صورت میں پہلے شوہر کو اس سے شادی کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ، وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ**'' (سورہ بقرہ ۲۳۰) پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو وہ اس کے لیے ابھی حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے مرد سے شادی کرے، پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوبارہ شادی کر لیں اگر وہ یہ گمان کر لیں کہ وہ اللہ کی حدود کا پاس ولحاظ رکھیں گے، اور یہی اللہ کے حدود ہیں جن کو وہ جاننے والوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رفاعہ قرظی کی بیوی نبی ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: میں رفاعہ کی زوجیت میں تھی تو اس نے مجھے طلاق دیا ہے، اور طلاق بتہ (تین طلاق) دیا ہے، پھر میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر سے شادی کی، اس کے پاس تو کپڑے کا کنارہ ہے۔ (یعنی ان میں جماع کی طاقت اور قوت ہی نہیں ہے) آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟ نہیں، یہاں تک کہ تم اس کا مزہ لو اور وہ تمہارا مزہ لے''۔ (یعنی تمہارے ساتھ وہ مکمل جماع نہ کر لیں) (بخاری: کتاب الشھادات ۲۴۹۶، مسلم: کتاب النکاح ۱۴۳۳)

تعدد زوجات اور اس کی مشروعیت کی حکمت

۱۔تعدد زوجات کا حکم

ایک سے زیادہ شادی کرنا مرد کے لیے اصلاً جائز ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''فَإِنْ خِفْتُمْ أَن لَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ '' (النساء۴) پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے سلسلے میں انصاف نہیں کرو گے تو اپنی پسند کی دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے شادی کرو۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو یتیم لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ انصاف نہ ہونے کا اندیشہ ہو تو تمھارے لیے ان کے علاوہ دوسری دو، تین اور چار عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔

لیکن شادی کرنے والے کے حالات کے اعتبار سے تعدد ازواج کا حکم بدلتا ہے، کبھی ایک سے زیادہ شادی مستحب ہے تو کبھی مکروہ، اور کبھی حرام، اس کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔اگر مرد کو دوسری بیوی کی ضرورت ہو، مثلاً ایک بیوی سے اس کی خواہش پوری نہ ہوتی ہو، یا اس کی پہلی بیوی بیمار ہو، یا بانجھ ہو اور اس کو بچے کی خواہش ہو، اور مرد کو غالب گمان یہ ہو کہ وہ دونوں بیویوں کے درمیان انصاف کرے گا تو اس صورت میں دوسری شادی کرنا مستحب ہے، کیوں کہ اس شادی میں شرعی مصلحت پائی جاتی ہے، اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک سے زیادہ شادیاں کی ہے۔

۲۔اگر تعدد ازواج کی کوئی ضرورت نہ ہو، صرف عیش وتنعم اور تفریح میں اضافے کے لیے ہو، اور اس کو اپنی بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی صلاحیت میں شک ہو تو اس

صورت میں دوسری شادی کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ یہ شادی بلاضرورت ہے، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انصاف نہ کرنے کی وجہ سے بیویوں کو نقصان ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "جس میں تم کو شک ہے، اس کو چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرو جس میں تم کو شک نہ ہو" (ترمذی: ابواب صفۃ القیامۃ ٦٠ ،٢٥ یہ روایت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ہے)

٣۔ اگر اس کا غالب گمان یا یقین ہو کہ وہ اپنی بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کر سکے گا، اس کا سبب فقیری ہو، یا جنسی کمزوری، یا خود اپنے اوپر سبھی بیویوں کی طرف میلان کا بھروسہ نہ ہو، تو اس صورت میں دوسری شادی کرنا حرام ہے، کیوں کہ اس میں دوسروں کو نقصان پہنچانا لازم آئے گا، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ"۔ (ابن ماجہ: کتاب الاحکام، باب من بنی فی حقہ ما یضر جارہ، موطا امام مالک: کتاب الاقضیہ، باب القضاء فی المرفق)

اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنىٰ أَلَّا تَعُوْلُوْا" (سورۂ نساء ٣) پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کرو گے تو ایک بیوی یا تمھاری باندیاں، یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو۔

اس بات سے واقف ہونا ضروری ہے کہ اگر دوسری یا تیسری صورت میں کوئی دوسری یا تیسری شادی کرے تو عقد صحیح ہو جائے گا، اور شادی کی سبھی ذمے داریاں اس پر عائد ہوں گی اور شادی کے سبھی اثرات بھی مرتب ہوں گے یعنی اس کے ساتھ جماع اور لطف اندوزی جائز ہو جائے گی، مہر اور نفقہ دینا ضروری ہو جائے گا، گرچہ دوسری صورت میں شادی کرنا مکروہ اور تیسری صورت میں حرام ہے، حرام ہونے کی صورت میں شادی کرنے سے گنہ گار ہو جائے گا، لیکن عقد باطل نہیں ہوگا۔

بیویوں کے درمیان مطلوبہ عدل کیا ہے؟

ایک سے زیادہ شادی کرنے والے مرد پر اسلام نے جس عدل وانصاف کو واجب قرار دیا ہے، وہ کھلانے پلانے، خرچ کرنے، گھربار، حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنے، رات گزارنے اور بیوی کے حقوق کی ادائیگی میں یکسانیت اور مساوات اور انصاف ہے۔

جہاں تک دلی محبت کا تعلق ہے جس سے کسی کے ساتھ عملی طور پر ظلم نہیں ہوتا ہے تو یہ اسلام کی طرف سے عائد کردہ مساوات اور عدل میں شامل نہیں ہے، کیوں کہ محبت میں انسان کو اپنے دل پر قابو نہیں رہتا ہے، شاید قرآن کریم کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ''وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ'' (سورۂ نساء ۱۲۹) تم بیویوں کے درمیان انصاف کر ہی نہیں سکتے چاہے تم کو اس کی شدید خواہش رہے۔

نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم اور معاملات میں انصاف کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ! یہ طاقت بھر میری تقسیم ہے، پس تو میری اس سلسلے میں ملامت مت فرما جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں''۔ (ابوداود: کتاب النکاح ۲۱۳۴، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۴۰، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے)

اس کا تعلق محبت اور میلانِ قلب سے ہے، آپ ﷺ کو اپنی بیویوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔

۲۔ تعدد ازدواج کو مشروع کرنے کی حکمت

اسلام نے اصلاً تعدد ازدواج کو جائز کیا ہے، اس کو فرض اور لازم قرار نہیں دیا ہے، اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز اس لیے قرار دیا ہے کہ اس میں معاشرتی اصلاح میں بڑے مقاصد پائے جاتے ہیں، اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی نگاہ دوربین ہو، اس کی بعض حکمتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جس مرد کی خواہش ایک عورت سے پوری نہیں ہوتی، اس کی حفاظت کی جائے، یہ فطری چیز ہے، اگر وہ دوسری شادی نہیں کرے گا تو حرام کاری میں مبتلا ہو جائے گا۔

چناں چہ ایسے شخص کے لیے حلال طریقے کے مطابق دوسری شادی کرنا خود اس کے لیے اور معاشرہ دونوں کے لیے بہتر ہے اور لازمی حقوق کی اس میں پاسداری ہے، اور عزت وشرافت کی حفاظت ہے کہ ایسے اشخاص کو زنا میں مبتلا ہونے سے روکا جائے۔

۲۔ اسلام نے تعدد ازدواج کو اس لیے بھی مشروع کیا تا کہ عورت کو شہوت پرستوں سے

محفوظ رکھا جائے، بجائے اس کے عورت بغیر عقد کے زنا اور حرام کاری کے ذریعے شہوت پرستوں کا سامانِ تفریح بنے اوران کے ہاتھ کھلواڑ بن کر رہ جائے، جس سے خود اس کی ذات محفوظ نہ رہے اور اس کی اولاد کا کوئی والد نہ ہو اوران کا نسب محفوظ نہ رہے، وہ کسی کی رکھیل بن جائے جس سے اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ کسی شریف شخص کی دوسری بیوی بن کر باعزت زندگی گزارے، جس سے اس کو معاشرتی سکون میسر ہو۔

چناں چہ تعدد ازدواج کو شروع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مرد کو زنا سے محفوظ رکھا جائے اور شہوت پرستوں کا شکار ہونے سے عورت کی حفاظت کی جائے، اس کو بدبختی اوراس کی زندگی کے اجیرن ہونے سے بچایا جائے، اور معاشرہ کو اخلاقی بے راہ روی اور بگاڑ سے محفوظ رکھا جائے۔

تعدد ازدواج کا جواز

کئی اسباب ایسے پائے جاتے ہیں جن سے تعدد ازدواج کی مشروعیت کا جواز بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے، اوراس کی حکمت اور فائدے واضح طور پر معلوم ہوجاتے ہیں، ذیل میں اس کی بعض مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔ کسی مرد کو عورت کی خواہش ہو، اوراس کی بیوی میں جنسی خواہش موجود نہ ہو، چاہے یہ فطری طور پر ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے۔ کیا اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ مرد زنا کرے اور اپنے دین، مال اور صحت کو برباد کردے؟ یا اپنی ضرورت کو دبائے رکھے اور خود کو عذاب میں مبتلا رکھے؟ یا یہ بہتر ہے کہ اس شرط کے ساتھ دوسری شادی کرلے کہ دونوں بیویوں کی کفالت کرے گا اور عدل وانصاف سے پیش آئے گا اور دونوں کے ساتھ سلوک وبرتاؤ میں ظلم نہیں کرے گا؟

اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ اس شخص کے حق میں تیسرا حل سب سے بہتر ہے اور معاشرے کے حق میں نفع بخش ہے اوراس کو پاکیزہ رکھنے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

۲۔ جنگ کی آگ بھڑکی ہوئی ہے (فی زمانہ جنگ تو روزمرہ کی بات بن گئی ہے) جس کے نتیجے میں بہت سے مرد جاں بحق ہوگئے، یا ناکارہ بن گئے، اور عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی تو کیا اس صورتِ حال میں یہ بہتر ہے کہ مرد صرف ایک بیوی پر اکتفا

کرے، اور عورتوں کی بڑی تعداد کفالت کرنے والے مرد اور بچوں کی پیدائش سے محروم ہوجائے، جو بچے عورت کے بڑھاپے میں سہارا بنتے ہیں، اگر اس طرح نہیں ہوگا تو عورتیں اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے گناہوں اور فحش کام کرنے پر مجبور ہوجائیں گی۔

یا یہ بہتر ہے کہ مرد کو قانونی طور پر ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کی اجازت دی جائے؟ اگر ہم یہ کہیں تو ناحق نہیں ہوگا کہ ان حالات میں تعدد ازدواج ایک انسانی عمل ہے، مروءت اور غیرت صرف اس کی اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ اس کو لازم قرار دیتے ہیں۔

اگر ہم یہ کہیں تو حقیقت کے خلاف نہیں ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے زیادہ تر شادیاں اسی پاکیزہ مقصد کے لیے کیا تھا۔

امہات المؤمنین میں سے کوئی تن تنہا ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائی اور اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا، کسی کا شوہر جنگ میں شہید ہوگیا اور وہ بے یار ومددگار بیوہ بن گئی، چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی مدد کی اور اس کو اپنے گھر میں شامل کر دیا، آپ اس کے بہترین کفالت کرنے والے بنے، اور اس عورت کو مومنین کی ماں بننے اور سید المرسلین ﷺ کے ساتھ ازدواجی نسبت کا شرف حاصل ہوا، جب عیسائی مذہب کا پیروکار یورپ تعدد ازدواج سے محروم رہا تو وہاں کی حالت کیا ہوگئی، اس کا نتیجہ صرف یہی نکلا کہ عورتیں بے راہ رو ہوگئیں، فحاشی میں مبتلا ہوگئیں، نفسیاتی مریض بن گئیں، اور بہت سی عورتیں پوری زندگی شادی سے ہی محروم رہ گئیں۔

۳۔ ایک شادی شدہ جوڑا ہے، میاں بیوی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، لیکن بیوی بانجھ ہے، اولاد ہونے کی کوئی امید نہیں ہے، شوہر کو بچوں کی خواہش ہے۔

کیا اس صورت میں یہ بہتر ہے کہ ہم اس شخص کو دوسری شادی سے محروم رکھیں، اور اس کے دل کو کڑھتا ہوا بغیر اولاد کے چھوڑ دیں؟ یا اپنی اس بیوی کو چھوڑنے کے لیے کہیں جس سے وہ محبت کرتا ہے؟ یا پہلی بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہوئے دوسری شادی کے لیے کہیں؟

یہ آخری حل سب سے بہتر ہے، کیوں کہ اس میں مرد اور عورت دونوں کی مصلحتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

۴۔جن قوموں میں تعدد ازدواج شجرہ ممنوعہ ہے، ان کی حالت کیا ہے؟ وہ تعدد ازدواج کے خیالی نقصانات سے زیادہ خطرناک نقصان میں پڑے ہوئے ہیں، ان قوموں میں بگاڑ عام ہے، ان کے یہاں شوہر بیوی کی خیانتیں عام بات ہے، یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کے عقل مند اور دانشور چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے ہیں کہ دوسری شادی کی اجازت دی جائے اور ان کی معاشرتی زندگی کو تباہ وبرباد کرنے والے بگاڑ پر روک لگائی جائے۔

تنبیہ:

اگر بعض جاہل اور ناواقف لوگ تعدد ازدواج کے حق کو پامال کرتے ہیں تو اس سے اسلام کی حکمتوں پر کوئی حرف نہیں آتا ہے اور ان جاہلوں کی کارستانی اور ان کی لاپرواہیوں کا الزام اسلام پر لگایا نہیں جا سکتا ہے۔

کیوں کہ اسلام نے تعدد ازدواج کو کسی کو ستانے یا ظلم وستم کرنے یا کسی کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے لیے جائز قرار نہیں دیا ہے، بلکہ ضرورت کی تکمیل، معاشرے کی حفاظت، افراد کی رعایت اور گندگیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مشروع کیا ہے۔

ان سبھی اسباب کی بنیاد پر شرعی شرائط کے ساتھ اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا ہے، صرف جائز کیا ہے، فرض نہیں کیا ہے، اور اس کو حقوق اور اخلاقی ضمانتوں کی بندشیں لگادی گئی ہیں۔چناں چہ اس معاملے میں اسلام کی مثال فارمیسی کی ہے، جس میں سبھی لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق دوائیں فراہم کی جاتی ہیں، ہر شخص اپنی ضرورت اور بیماری کے مطابق دوا لیتا ہے، یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ہم اس فارمیسی کی اہمیت کو گھٹادیں یا اس میں موجود دوائیوں کو اس طرح کم کردیں کہ سبھی لوگوں کی اس سے ضرورتیں پوری نہ ہوتی ہوں یا اس میں موجود سبھی دوائیاں ہر فرد کو دینے کی تجویز پیش کریں چاہے اس کو ضرورت ہی نہ ہو۔

اگر اعداے اسلام کو اپنے منحرف مزاج اور فاسد ذوق اور بے حیثیت شہوات کے ساتھ متفق نہ ہونے کی وجہ سے تعدد ازدواج کا یہ اسلامی حکم پسند نہیں ہے تو وہ اپنے غصے میں مرجائیں، ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، اللہ ان کو گھیرنے والا ہے۔

شادی سے پہلے

تمہید:

خاندان کی سعادت وخوش بختی، اولاد کی پیدائش اور بہترین ازدواجی زندگی کا دارو مدار بہترین رفیقِ حیات کا پورے ہوش وحواس کے ساتھ جذبات سے متاثر ہوئے بغیر اور کسی وقتی مصلحت کو مدنظر رکھے بغیر انتخاب ہے، اپنے رفیقِ حیات کا انتخاب ایسی بنیاد پر ہونا چاہیے جو باقی رہے اور دن بدن اس میں قوت وطاقت پیدا ہونا چاہیے، چوں کہ شادی ایک ایسا عقد ہے جس کے بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور یہ رشتہ موت تک سالہا سال رہتا ہے، اس میں بڑی ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، اس لیے لڑکے اور لڑکی کی طرف سے شادی سے پہلے کے چند قدم بڑے اہم ہوتے ہیں، تا کہ جب شادی کا وقت آئے تو دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اطمینان ہو اور جو صفات اپنے رفیقِ حیات میں چاہتا ہے اس میں مکمل طور پر پائے جانے کا یقین ہو اور اس کو اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ مستقبل میں گزارنے والی زندگی پر کامل اطمینان ہو۔

شادی سے پہلے کے چند اقدامات

۱۔ زوجین میں سے ہر ایک میں مطلوبہ صفات کو تلاش کیا جائے۔

۲۔ مخطوبہ کو دیکھا جائے۔

۳۔ پیغام بھیجا جائے۔

۱۔ زوجین میں سے ہر ایک میں مطلوبہ صفات کو تلاش کیا جائے

اسلام نے مخطوبہ میں چند صفات کو تلاش کرنے کی طرف رہنمائی کی ہے، اسی طرح

لڑکے میں بھی چند صفات کو متعین کیا ہے، اوران صفات کو تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے، یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔دین داری اور بہترین اخلاق

جس لڑکے کا انتخاب کیا جائے وہ دین دار اور با اخلاق ہو، اسی طرح لڑکی بھی دین دار اور با اخلاق ہو، نبی کریم ﷺ نے ان صفات کی طرف اپنے فرمان میں اشارہ کیا ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص پیغام بھیجے جس کے دین اور اخلاق سے تم راضی ہوتو اس کی شادی کرادو، ورنہ زمین میں بڑا فتنہ اور فساد ہوجائے گا''۔ (ترمذی: کتاب النکاح ۱۰۸۴)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''عورت کی شادی چار خصلتوں کو دیکھ کر کی جاتی ہے: اس کے مال، اس کے حسب ونسب، اس کے جمال اور اس کے دین کو دیکھ کر، پس تم دین دار کے ساتھ شادی کرکے کامیاب ہوجاؤ تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں''۔(بخاری: کتاب النکاح ۴۸۰۲، مسلم: کتاب الرضاع ۱۴۶۶) ''تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں'' عربی میں اس کا استعمال بہت عام ہے، یہ بد دعا نہیں ہے، بلکہ کسی چیز کی ترغیب دینے کے وقت یہ جملہ استعمال کیا جاتا ہے، اردو میں اس کا محاورتی ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے: ''تمھاری پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں''۔

دین داری اور اخلاق کو اہمیت دینے کی حکمت

اس کی حکمت یہ ہے کہ دین روز بروز طاقت ور ہوتا ہے اور دنوں کے گزرنے اور تجربات کے ساتھ اخلاق بہتر بن جاتے ہیں۔

اگر شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا انتخاب دین داری اور اخلاق کی بنیاد پر کریں تو محبت ومودت کی پائیداری اور استمرار کی ضمانت اور گیارنٹی رہتی ہے۔

گذشتہ تفصیلات کی بنیاد پر کوئی یہ نہ سمجھے کہ حسب ونسب اور خوبصورتی کو دیکھنا ہی نہیں چاہیے، یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اگر مخطوبہ میں چاروں صفات نہ پائی جائیں، صرف کوئی ایک صفت ہوتو دین داری کو دیکھنا افضل ہے، اگر یہ چاروں صفات کسی میں پائی

جائیں تو کیا کہنا، اس سے بہتر کوئی دوسری عورت نہیں ۔

۲۔ حسب ونسب

اس کی دلیل سابقہ روایت ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عورت کی شادی چار چیزوں کو دیکھ کر کی جاتی ہے، اس میں حسب ونسب کا بھی تذکرہ ہے ۔

رفیق حیات کے انتخاب میں حسب ونسب کو دیکھنا مسنون ہے، کیوں کہ ازدواجی زندگی کے بحسن وخوبی گزرنے میں اس سے بڑا تعاون ملتا ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے اور معاشرت میں خوش دلی پائی جاتی ہے، کیوں کہ یہ فطری بات ہے کہ جس کا حسب ونسب بہترین رہتا ہے، اس کا سلوک بھی بہتر رہتا ہے، اگر بہترین نسب والا محبت کرے گا تو اکرام سے پیش آئے گا، اگر ناپسند کرے گا تو کم از کم ظلم تو نہیں کرے گا۔

۳۔ دونوں کے درمیان قریبی رشتے داری نہ ہو

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مرد اپنے قریبی رشتے دار سے شادی نہ کرے۔

امام زنجانی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شادی کا مقصد مختلف قبیلوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جوڑنا ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کا تعاون کریں اور مدد فراہم کریں، یہ مقصد قریبی رشتے داری میں شادی نہ کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”قریبی رشتے دار سے شادی مت کرو، کیوں کہ بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے“۔ کیوں کہ قریبی رشتے داروں کے درمیان جنسی شہوت کمزور رہتی ہے، امام شربینی نے منہاج النووی کی شرح میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

لیکن ابن صلاح نے بیان کیا ہے کہ ان کو اس حدیث کی کوئی قابلِ بھروسہ اصل نہیں ملی ہے، ابن اثیر نے اس کو اپنی کتاب ”**النهاية في غريب الحديث والأثر**“ میں ذکر کیا ہے۔

اس حکم پر یہ اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کی، کیوں کہ آپ ﷺ نے بیانِ جواز کے لیے یہ شادی کی تھی، یا یہ کہ دونوں کے درمیان قریبی رشتے داری نہیں پائی جاتی ہے،

فاطمہ حضرت علی کی چچازاد بھائی کی لڑکی ہے، یہ رشتہ قریبی نہیں ہے، بلکہ دور کا ہے۔

۴۔زوجین کے درمیان کفو پایا جائے

کفو کا مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حالات میں مندرجہ ذیل امور میں مساوات اور برابری پائی جائے:

ا۔دین داری اور صلاح میں یکسانیت: چناں چہ فاسق مرد پاک دامن صالح عورت کا کفو نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ" کیا جو شخص مومن ہے وہ فاسق کے برابر ہے، وہ دونوں برابر نہیں ہیں۔(سورہ سجدہ ۱۸)

۲۔پیشے میں یکسانیت: چناں چہ گھٹیا پیشے سے منسلک مثلاً بھنگی، نائی، کسان اور صفائی ستھرائی کا کام کرنے والے عالم، قاضی اور تاجر کی بیٹی کا کفو نہیں ہے۔

۳۔جن عیوب سے نکاح توڑنا جائز ہوجاتا ہے ان سے پاک ہو: کوئی پاگل ہو یا برص کی بیماری ہو تو وہ ان بیماریوں سے پاک عورت کا کفو نہیں ہے۔

شادی میں کفو کا حق بیوی اور اس کے ذمے دار اولیاء کا ہے، اگر چہ شادی کے صحیح ہونے کے لیے کفو شرط نہیں ہے، لیکن بیوی اور اس کے ذمے داروں سے عار کو دور کرنے کے لیے یہ مقصود اور مطلوب ہے، اور اس میں زوجین کے درمیان زندگی صحیح ڈھنگ سے چلنے کی ضمانت اور گیارنٹی پائی جاتی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر دونوں کی زندگی کا ڈھنگ یکساں ہوگا، اور دونوں کے پیشے میں مماثلت پائی جائے گی تو دونوں میں قرب ہوگا اور دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں گے، پھر کسی کو دوسرے کی خاطر اپنی طبیعت بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

البتہ لڑکی اور اس کے ذمے داروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ کفاءت کے حق سے دستبردار ہوجائیں، اگر کوئی ولی لڑکی کی رضامندی سے غیر کفو سے اس کی شادی کرائے تو نکاح صحیح ہوگا، کیوں کہ یہ اس لڑکی اور اس کے اولیاء کا حق ہے، اگر وہ اس سے دست برداری پر راضی

ہوجائیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہے، کفو کی طرف نبی کریم ﷺ نے اپنے اس پاک ارشاد میں اشارہ کیا ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''اپنے نطفوں کے لیے بہترین انتخاب کرو، اور اپنا کفو رکھنے والوں کے ساتھ نکاح کراؤ، اور ان کے ساتھ نکاح کرو''۔ (مسند امام حاکم: کتاب النکاح ۲/۱۶۳، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے)

۵۔ باکرہ کا انتخاب کیا جائے:

باکرہ وہ لڑکی ہے جس کی پہلے شادی نہ ہوئی ہو، نبی کریم ﷺ نے باکرہ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی وجہ خود بیان کی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم باکرہ لڑکیوں کا انتخاب کرو، کیوں کہ ان کے منھ میں مٹھاس زیادہ رہتی ہے (یعنی وہ نرم گفتار رہتی ہے اور اس میں فحش کلامی اور بدتمیزی نہیں رہتی)، اور زیادہ بچے جننے والی رہتی ہے، اور کم پر راضی ہوجاتی ہے''۔ (سنن ابن ماجہ: کتاب النکاح ۱۸۶۰)

امام بخاری اور امام مسلم نے اسی معنی کی روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک عورت سے شادی کی، پھر میری ملاقات نبی کریم ﷺ سے ہوئی تو آپ نے دریافت فرمایا: ''جابر! تم نے شادی کی؟''، میں نے کہا: جی ہاں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''باکرہ سے یا ثیبہ سے؟''، میں نے کہا: ثیبہ سے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''باکرہ سے کیوں نہیں کی، تم اس کے ساتھ لطف اندوز ہوجاتے؟''، میں نے کہا: اللہ کے رسول! میری بہنیں ہیں، مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ میرے اور ان کے درمیان داخل ہوجائے گی۔ آپ نے فرمایا: ''تب تو یہ بہتر ہے، عورت کے ساتھ شادی اس کی دین داری، مال، جمال وخوبصورتی دیکھ کر کی جاتی ہے، پس تم دین دار کا انتخاب کرو، تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں''۔ (بخاری: کتاب النکاح، مسلم: کتاب الرضاع)

اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ لڑکے کی بھی پہلے شادی نہ ہوئی ہو، کیوں کہ انسانی دل کی یہ فطرت ہے کہ جس سے پہلے مانوس ہوجاتا ہے، اسی سے اس کا دل لگتا ہے۔

۶۔ زیادہ جننے والی ہو:

باکرہ لڑکی زیادہ جننے والی ہے یا نہیں؟ اس کا اندازہ اس کے قریبی رشتے داروں؛ بہن، پھوپھی، خالہ وغیرہ کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے، اسی طرح مرد میں یہ صفت پائی جاتی ہے یا نہیں، اس کو بھی اس کے قریبی رشتے داروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زیادہ جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی کے ساتھ شادی کرو، کیوں کہ قیامت کے دن میں دوسری امتوں پر اپنی امت کی زیادتی پر فخر کروں گا''۔ (مسند امام احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے: کتاب النکاح ۲/۱۶۲)

۲۔ مخطوبہ کو دیکھنا مسنون ہے

اسلام نے جن چیزوں کو مستحب قرار دیا ہے اور ان کی ترغیب دی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی مخطوبہ یعنی اس لڑکی کو دیکھا جائے جس کا پیام آیا ہو یا جس کو اس نے پیغام بھیجا ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اور اس کو قوی امید ہو کہ اس کا پیغام قبول کیا جائے گا، البتہ لڑکی کی اجازت یا اس کو مطلع کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ شریعت کی طرف سے دی ہوئی اجازت کافی ہے، تا کہ لڑکی پہلے ہی سے بج دھج کر نہ بیٹھے، جس سے لڑکی کو دیکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کا مقصود لڑکی کو اس کی فطری حالت میں دیکھنا ہے۔

اگر ضرورت پڑے تو دو تین بار دیکھنا بھی جائز ہے، تا کہ لڑکی کی شکل وصورت مکمل طور پر واضح ہو جائے، اور شادی کے بعد اس کو پچھتانا نہ پڑے، کیوں کہ پہلی مرتبہ دیکھنے سے عام طور پر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا ہے۔

امام ترمذی اور امام ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جب کہ انھوں نے ایک لڑکی کو پیغام بھیجنے کا ارادہ کیا تھا: ''اس کو دیکھو، کیوں کہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت ومودت برقرار رہنے کے لیے مناسب ہے''۔

(ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے: کتاب النکاح ۱۰۸۷، ابن ماجہ: کتاب النکاح: ۱۸۶۵)

امام بخاری اور امام مسلم نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا: میں خود کو آپ کے حضور ہبہ کرنے کے لیے آئی ہوں، آپ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر غور سے دیکھا، پھر اپنا سر نیچے کرلیا۔

(بخاری: کتاب النکاح ۴۸۳۳، مسلم: کتاب النکاح ۱۴۲۵)

(میں خود کو آپ کے حضور ہبہ کرنے آئی ہوں کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھ سے شادی کرلیجیے، مجھے مہر کی ضرورت نہیں ہے، یا آپ میری شادی جس کے ساتھ چاہیں کرا دیجیے)

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھا تھا، آپ کے پاس ایک شخص آیا اور بتایا کہ اس نے ایک انصاری عورت سے شادی کرلی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''کیا تم نے اس کو دیکھ لیا ہے؟''، اس نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: ''جاؤ اور اس کو دیکھو، کیوں کہ انصار کی آنکھوں میں کچھ رہتا ہے''۔ یعنی ان کی آنکھیں دوسری عورتوں سے مختلف رہتی ہیں، شاید تمھیں پسند نہ آئیں۔

(مسلم: کتاب النکاح ۱۴۲۴)

ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام بھیجے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اُس عورت کو دیکھے، اگر وہ اس کو پیغام بھیجنے کے لیے دیکھ رہا ہے، چاہے اُس عورت کو اس کا علم نہ ہو''۔ (احمد: ۴۲۴/۵)

اسی طرح لڑکی کو بھی لڑکے کو دیکھنے کا حق ہے، اگر وہ اس سے شادی کا ارادہ رکھتی ہو، تاکہ لڑکے کی شکل وصورت معلوم ہوجائے اور نکاح کے بعد اس کو پچھتانا نہ پڑے، کیوں کہ لڑکی کی بھی اپنی پسند رہتی ہے، جس طرح لڑکے کی پسند رہتی ہے۔

لڑکی کو دیکھنے کے حدود

پیغام بھیجنے والے لڑکے کے لیے لڑکی کا صرف چہرہ اور ہتھیلیاں اوپر نیچے دیکھنا جائز ہے، کیوں کہ یہ دو اعضاء ایسے ہیں جن سے زینت ظاہر ہوجاتی ہے، جس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: ''وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' (سورہ

نور ۳۱)اور وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوا اس کے جو ظاہر ہو جاتا ہے۔

چہرے اور ہتھیلیوں کو مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چہرے سے جمال وخوبصورتی کا پتہ چلتا ہے اور ہتھیلیوں سے جسم کے نازک ہونے یا نہ ہونے کا علم ہوتا ہے۔

اگر لڑکا دیکھ نہ سکے تو کسی اپنی رشتے دار عورت کو دیکھنے کے لیے بھیجے۔

کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے ام سلیم کو ایک عورت کو دیکھنے کے لیے بھیجا تھا، اور فرمایا تھا: ''اس کی ایڑی کی اوپر کی ہڈیوں کو دیکھو اور اس کے جسم کی بو کو سونگھو''۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ بھیجنے والے کے سامنے ان حدود سے زیادہ اوصاف بیان کر سکتی ہے جتنا خود مرد کو دیکھنے کی اجازت ہے، چناں چہ دوسروں کو بھیجنے کی صورت میں خود دیکھنے سے زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

غیر محرم عورت کو دیکھنے کا حکم

بالغ اور عاقل مرد چاہے وہ بوڑھا ہو یا عاجز ولاچار، اسی طرح مراہق (یعنی وہ بچہ جو بلوغت کے قریب ہو) کو غیر محرم بالغ عورت کے جسم کا کوئی بھی حصہ دیکھنا جائز نہیں ہے، بالغ عورت سے مراد وہ لڑکی ہے جو اس عمر کو پہنچی ہو جس کو دیکھنے کی صورت میں شہوت اور جنسی خواہشات بھڑکنے کا اندیشہ ہو، چاہے دیکھنے کا موقع ایسا ہو کہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو بھی صحیح قول کے مطابق غیر محرم عورت کو دیکھنا حرام ہے۔

اسی طرح عورت کے لیے بھی غیر محرم مرد کو بلاضرورت دیکھنا جائز نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ، وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَاحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ'' (سورہ نور ۳۰۔۳۱) مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے حق میں بہتر ہے، اللہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں، اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں میمونہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھی (یعنی رسول اللہ ﷺ بھی وہاں موجود تھے) اس وقت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سے پردہ کرو''، میں نے دریافت کیا: اللہ کے رسول! کیا وہ نابینا نہیں ہیں، وہ نہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ ہم کو پہچانتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم دونوں بھی اندھیاں ہوں؟ کیا تم ان کو دیکھ نہیں رہی ہو؟''۔(ترمذی: کتاب الادب ۲۷۷۹، امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے)

جس طرح دیکھنا حرام ہے، اسی طرح کسی بھی حصے کو چھونا بھی حرام ہے، کیوں کہ دیکھنے سے زیادہ چھونے سے لذت اندوزی ہوتی ہے اور جنسی شہوت بھڑکتی ہے۔

البتہ ایسی چھوٹی بچی کو دیکھنا جائز ہے جس کو دیکھنے سے جنسی خواہش نہ ابھرتی ہو، اسی طرح عورت کے لیے ایسے چھوٹے بچے کو دیکھنا جائز ہے جس کو دیکھنے سے شہوت نہ آتی ہو، البتہ چھوٹے بچوں کی شرمگاہ کو دیکھنا ہر صورت میں حرام ہے، کیوں کہ اس سے شہوت بھڑکنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

محرم عورت یا مرد کو دیکھنے کے احکام

محرم عورت کے ناف اور گھٹنے کے درمیان کے حصے کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں کو دیکھنا جائز ہے، اسی طرح عورت کے لیے بھی اپنے محرم مرد کا اتنا حصہ دیکھنا جائز ہے۔

غیر محرم کو کن صورتوں میں دیکھنا جائز ہے؟

غیر محرم عورت کو دیکھنا یا چھونا اس صورت میں حرام ہے جب بلا ضرورت ہو، اگر دیکھنے یا چھونے کی ضرورت پیش آئے تو جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دیکھنے اور چھونے کی کیا ضرورتیں ہوسکتی ہیں؟ ان کی شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ علاج معالجے کے وقت، کیوں کہ اس صورت میں دیکھنے اور چھونے کو حرام ہی رکھا جائے گا تو حرج پیدا ہو جائے گا، اور اسلام آسان دین ہے اور حرج کو دور کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'' (سورہ حج) اور اللہ نے تمھارے لیے دین میں کوئی حرج (تکلیف) نہیں رکھا ہے۔

چناں چہ نا محرم کے جسم کے ان حصوں کو دیکھنا یا چھونا جائز ہے جن کو دیکھنے یا چھونے کی ضرورت پیش آئے۔

امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے پچھکاری لگانے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ ﷺ نے ابو طیبہ کو پچھکاری لگانے کا حکم دیا۔(مسلم: کتاب السلام ۲۲۰۶) چناں چہ جب ضرورت ہو اور کوئی عورت معالجہ نہ ہو تو مرد عورت کا علاج کرسکتا ہے، اسی طرح عورت بھی مرد کا علاج کرسکتی ہے، اگر کوئی مرد ڈاکٹر نہ ہو، البتہ مرد عورت کا علاج کر رہا ہو تو کسی محرم یا شوہر یا ثقہ عورت کا ساتھ میں رہنا ضروری ہے۔

اگر مسلم ڈاکٹر موجود ہے تو غیر مسلم کے پاس جاکر علاج کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ خرید وفروخت کے وقت عورت کے بارے میں جاننا ضروری ہو تو دیکھے بغیر عورت کی پہچان ممکن نہ ہو تو دیکھنے کی اجازت ہے۔

۳۔ گواہی دیتے وقت، کیوں کہ جس کے حق میں گواہی دی جارہی ہے یا جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے، اس کو دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۴۔ تعلیم وتدریس کے وقت، صرف ان ہی علوم کی تعلیم میں جن کا حاصل کرنا فرض ہے یا کم از کم مستحب ہے، کیوں کہ اس میں شرعی فائدہ کا حصول ہے۔

جن صورتوں میں غیر محرم مرد یا عورت کو دیکھنا یا چھونا جائز ہے، ان صورتوں میں صرف بقدرِ ضرورت ہی جائز ہے، کیوں کہ اس کی اجازت صرف ضرورت کی بنیاد پر دی گئی ہے، جتنی ضرورت سے مقصد حاصل ہو جاتا ہو تو اسی قدر کا جواز ہے، اس سے زیادہ کا نہیں۔

۳۔ لڑکی کو پیغام بھیجنا

جب لڑکی کی تمام خصوصیات پسند آجائیں، اور اس کو دیکھنے کے بعد شادی کی خواہش پیدا ہو جائے تو پیغام بھیجنے کا مرحلہ آتا ہے۔

پیغام کا مطلب یہ ہے کہ لڑکے کی طرف سے لڑکی کا رشتہ مانگا جائے۔

کن صورتوں میں پیغام بھیجنا جائز ہے اور کن صورتوں میں حرام

ا۔اگر لڑکی کسی کے نکاح میں نہ ہو، یا عدت نہ گزار رہی ہو اور نکاح کی ان تمام رکاوٹوں سے خالی ہو جن کا تذکرہ محرم عورتوں میں ہو چکا ہے تو ایسی لڑکی کو صراحت کے ساتھ اور اشارے میں پیغام بھیجنا جائز ہے۔

۲۔اگر عورت طلاق بائن (یعنی طلاق کی جن صورتوں میں طلاق دینے والے کو رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا) اور شوہر کے وفات پانے کی وجہ سے عدت میں ہو تو صرف اشارے میں شادی کا پیغام دینا جائز ہے، صراحت کے ساتھ شادی کا پیغام دینا جائز نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ، عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا، وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ'' (سورہ بقرہ ۲۳۵) اور تم پر کوئی گناہ اس بات میں جو پردہ رکھ کر تم عورتوں کو نکاح کا پیام دو یا اپنے دل میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم ان سے تذکرہ کروگے اور ان سے خفیہ وعدہ نہ کرو، مگر یہ کہ تم بھلی بات کہو، اور نکاح کا ارادہ مت کرو یہاں تک کہ کتاب اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے (یعنی عدت ختم نہ ہو جائے) اور اس بات کو جان لو کہ اللہ تمھارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے پس اس سے چوکنا رہو اور اس بات کو جان لو کہ اللہ بڑا معاف فرمانے والا اور حلم والا ہے۔

۳۔ان کے علاوہ دوسرے موقعوں پر اور صورتوں میں نہ صراحت کے ساتھ پیغام بھیجنا جائز ہے اور نہ اشارے اور کنایے میں۔

چناں چہ اس عورت کو پیغام بھیجنا حرام ہے جو کسی دوسرے شخص کی زوجیت میں ہو، اسی طرح ہر اس عورت کو بھی پیغام بھیجنا حرام ہے جس کا تذکرہ محرم عورتوں میں ہوا ہے،

چاہے وہ عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی ہو یا اس کی حرمت عارضی ہو۔

طلاق رجعی کی عدت گزارنے والی عورت کو پیغام بھیجنا جائز نہیں ہے، نہ اشارے وکنایے میں اور نہ صراحت کے ساتھ، کیوں کہ وہ دوسرے شخص کی بیوی رہتی ہے، یا بیوی کے حکم میں رہتی ہے، کیوں کہ اس کے شوہر کو عدت کے دوران رجوع کرنے کا حق رہتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَبُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوْا إِصْلَاحًا" (سورہ بقرہ ۲۲۸) اوران کے شوہران کواس میں (عدت کے دوران) لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں اگرانھوں نے اصلاح کا ارادہ کیا ہے۔

پیغام دینے میں صراحت کا مطلب

پیغام میں صراحت کا مطلب یہ ہے کہ واضح انداز میں شادی کی خواہش کا اظہار کرے، مثلاً کہے: میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، یا یہ کہے کہ جب تمھاری عدت گزر جائے گی تو میں تم سے شادی کروں گا۔

پیغام دینے میں اشارے وکنایے کا مطلب

پیغام دینے میں اشارے وکنایے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کرے جس میں شادی کی رغبت ہونے اور رغبت نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو، مثلاً عدت گزارنے والی سے کہے: تم خوبصورت ہو، تم میں دلچسپی لینے والے بہت سے موجود ہیں، تم جیسا ملنا کس کو نصیب ہوگا، وغیرہ۔

پیغام پر پیغام بھیجنے کا حکم

اپنے مسلمان بھائی کے پیغام پر پیغام بھیجنا حرام ہے اگرلڑکی والوں کی طرف سے ہاں میں جواب مل چکا ہو، البتہ وہی خود اجازت دے تو دوسرے شخص کے لیے پیغام بھیجنا جائز ہے، اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے لڑکی کو پیغام بھیجا ہو اورلڑکی والوں کی طرف سے ہاں میں جواب بھی ملا ہو، پھر کوئی دوسرا پیغام بھیجے۔

اگر پہلے والے کے پیغام کا جواب ہاں میں نہ آیا ہو تو دوسرے کو پیغام بھیجنا جائز ہے۔
اس اعتبار سے یہ حرام ہے کہ اس سے گناہ لازم آئے گا، البتہ کوئی اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام بھیجے پھر شادی بھی ہو جائے تو عقدِ نکاح باطل نہیں ہوگا۔
حرام ہونے کی دلیل حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''آدمی اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام نہ بھیجے، یہاں تک کہ اس سے پہلے پیغام دینے والا چھوڑ دے یا وہی اس کو اجازت دے''۔ (بخاری: کتاب النکاح ۴۸۴۸، مسلم: کتاب النکاح ۱۴۱۲، یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہے)

شادی سے پہلے لڑکی یا لڑکے کے سلسلے میں مشورہ لینے کے احکام

جس کسی سے پیغام بھیجنے والے یا لڑکی کے بارے میں مشورہ کیا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ بھی عیوب اور برائیوں کو بطورِ نصیحت اور خیر خواہی کے بیان کرے، یہ حرام غیبت میں شمار نہیں ہوگا، عیوب کا تذکرہ اسی وقت جائز ہے، جب تذکرہ کرنے کی ضرورت ہو، اگر صرف اشارے وکنایے پر اکتفا کرسکتا ہو تو اکتفا کرنا لازم ہے، مثلاً یہ کہے: یہ لڑکا تمھارے لیے بہتر نہیں ہے، یہ لڑکی تمھارے مناسب نہیں ہے وغیرہ، اس حکم کی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ انھوں نے حضور اکرم ﷺ سے کہا: معاویہ بن ابو سفیان اور ابوجہم خطبانی نے مجھے پیغام بھیجا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جہاں تک ابوجہم کا تعلق ہے، وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے اتارتے ہی نہیں ہیں، اور معاویہ تو فقیر ہیں، ان کے پاس کچھ بھی مال نہیں ہے، تم اسامہ بن زید سے شادی کرلو''، میں نے ان کو پسند نہیں کیا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''اسامہ سے شادی کرو''، میں نے ان سے شادی کی تو اللہ نے ان میں برکت عطا فرمائی''۔ (مسلم: کتاب الطلاق ۱۴۸۰، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۳۵)

ولی کی طرف سے اپنی لڑکی کا پیغام نیکوکاروں اور پرہیزگاروں کو دینے کے احکام

لڑکی کے ولی کے لیے یہ سنت ہے کہ وہ اپنی لڑکی کا پیغام صالح اور نیک مرد کے پاس بھیجے، حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں اپنی لڑکیوں کا رشتہ اس وقت پیش کیا تھا، جب وہ موسیٰ علیہ السلام کی پاکدامنی اور امانت سے واقف ہو گئے تھے، اللہ

تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ، قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ، قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ" (سورہ قصص ۲۶-۲۸) ابا جان! اس کو اجرت پر رکھئے، بے شک بہتر شخص جس کو آپ اجرت پر رکھیں وہ طاقت ور اور امانت دار ہے، انھوں نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کی شادی تمھارے ساتھ کرا دوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میرے پاس مزدوری کرو، پس اگر تم دس مکمل کرلو تو یہ تمھاری طرف سے ہے، اور میں تم پر سختی کرنا نہیں چاہتا ہوں، تم مجھے ان شاء اللہ نیک لوگوں میں سے پاؤ گے۔ انھوں نے کہا: یہ میرے اور آپ کے درمیان ہے، میں جو بھی میعاد پوری کروں گا تو مجھ پر کوئی زبردستی نہیں ہے، اور اللہ ہماری باتوں پر گواہ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی دختر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضرت عثمان، پھر حضرت علی، پھر حضرت ابوبکر کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ شادی کی۔ (بخاری: کتاب النکاح)

پیغام بھیجنے کی سنتیں

پیغام دینے والے یا اس کے وکیل کے لیے پیغام سے پہلے خطبہ پڑھنا، اسی طرح عقد نکاح سے پہلے بھی خطبہ پڑھنا مسنون ہے، جس کی ابتدا اللہ کی حمد وثنا اور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام سے کرنا مستحب ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "ہر اہم کام جس کی ابتدا میں اللہ کی تعریف نہ کی گئی ہو تو وہ ناقص ہے"۔ (ابن ماجہ: کتاب النکاح ۱۸۹۴)

پھر اللہ عزوجل سے خوف کرنے کی وصیت کرے، پھر اپنی خواہش کا اظہار کرے اور کہے: میں آپ کی شریف زادی کو شادی کا پیغام دینے آیا ہوں۔

اسی طرح لڑکی کے ذمے دار اور ولی کے لیے بھی خطبہ پڑھنا اور اللہ کی حمد وثنا اور درود

شریف پڑھنے کے بعد یہ کہنا مسنون ہے کہ آپ غیر مرغوب نہیں ہیں۔

عقدِ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھنا سنت موکدہ ہے، کیوں کہ یہ بات ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوفاً اور مرفوعاً روایت سے اس کو اخذ کیا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی ضرورت مثلاً نکاح وغیرہ کے لیے خطبہ دے تو کہے: "إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران۱۰۲) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (سورہ نساء ۱) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (سورہ احزاب ۷۰ ۔ ۷۱)(شرح الشربینی علی المنھاج: کتاب النکاح ۳/۱۳۸)

شادی سے پہلے منگیتر سے تنہائی میں ملنے کا کیا حکم ہے؟

دینِ اسلام کی روح سے ناواقف مسلمانوں میں یہ بات عام ہوگئی ہے کہ جیسے ہی نسبت کا اعلان ہوتا ہے تو لڑکا اور لڑکی تنہائی میں ملاقات شروع کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اخلاق اور طبیعت سے واقف ہونا چاہتے ہیں، جب کہ وہ دونوں اپنے دل میں یہ ٹھانے ہوئے ہوتے ہیں کہ اپنے حقیقی اخلاق کا مظاہرہ نہیں کریں گے، بلکہ لڑکا ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ وہ خود کو لڑکی کے سامنے اس کے خوابوں کے بادشاہ کے روپ میں پیش کرے گا، اپنی سخاوت، دریادلی اور ذہانت کا اظہار کرے گا لڑکی

بھی لڑکے کے گمان سے زیادہ خوبصورت بننے کی کوشش کرتی ہے اور اس کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ میں وہی دوشیزہ ہوں جس کو تم نے اپنے خیالوں میں سجائے رکھا ہے۔

شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا ملنا حرام ہے، اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے، اور اللہ عزوجل اس سے ناراض ہوجاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مرد کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے، مگر یہ کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی محرم ہو''۔ (بخاری: کتاب النکاح ۴۹۳۵، مسلم: کتاب الحج ۱۳۴۱، یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے) شادی سے پہلے منگیتر اجنبی اور غیر محرم عورت ہی سمجھی جائے گی۔

عقل مند لڑکی وہ ہے جو پیغام کے وقت ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد شادی سے پہلے دوبارہ اپنے منگیتر کے سامنے آنے سے باز رہتی ہے، کیوں کہ اس کو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ضروری ہے اور شادی سے پہلے ہونے والی ملاقاتوں کے برے نتائج سے بھی واقف رہنا لازم ہے، کیوں کہ اگر وہ ملاقات شروع کرے گی تو ہوسکتا ہے کہ کسی وجہ سے منگنی ٹوٹ جائے، پھر کوئی دوسرا نوجوان اس کے پاس پیغام نہیں بھیجے گا، کیوں کہ ہر ایک کو معلوم ہوجاتا ہے کہ پہلے منگیتر کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، اس لیے احتیاط ضروری ہے، اور اسلام میں اس کی اجازت بھی نہیں ہے۔

البتہ جب عقدِ نکاح ہوجائے تو تنہائی میں ملنا جائز ہے، کیوں کہ اب وہ اس کی بیوی ہے، مرد اس سے اور عورت مرد سے جس طرح چاہے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، البتہ اس میں بھی حرام چیزوں سے بچنا لازمی ہے۔

عقدِ نکاح کے ارکان

ہر رکن کی وضاحت اور شرطوں کا بیان

نکاح کے پانچ ارکان ہیں:

صیغہ (ایجاب وقبول) بیوی، شوہر، ولی، دو گواہ۔

پہلا رکن: صیغہ (ایجاب وقبول)

صیغہ بیوی کے ولی کی طرف سے ایجاب کرنا مثلاً کہے: میں نے تمھاری شادی میری دختر سے کرادی۔

اور شوہر کا قبول کرنا، مثلاً وہ کہے: میں نے تمھاری بیٹی سے شادی کی۔ اگر شوہر پہلے کہے اور بعد میں ولی کہے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، مثلاً میں نے تمھاری بیٹی سے شادی کی، اس کے جواب میں ولی کہے: مجھے یہ شادی منظور ہے۔

ایجاب وقبول کی مشروعیت کی حکمت

اس کی حکمت یہ ہے کہ عقدِ نکاح کا شمار ان عقود اور معاملات میں ہوتا ہے جن میں دونوں کی رضامندی ضروری ہے، اور رضامندی پوشیدہ چیز ہے، اس سے یوں ہی واقف ہونا ناممکن ہے، اسی لیے شریعت نے ایجاب وقبول کو مشروع کیا، تا کہ دونوں کے دل میں موجود رضامندی کا اظہار زبان سے ہوجائے۔

ایجاب وقبول کی شرطیں

ایجاب وقبول کی مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

ا۔لفظِ شادی یا نکاح کا استعمال ہو

مثلاً کہے: میں نے تم سے شادی کرائی، میں نے تم سے نکاح کر کے دیا، میں نے اس کی شادی قبول کی، میں نے اس کا نکاح قبول کیا۔

ان دو الفاظ کی شرط اس لیے ہے کہ یہی الفاظ شریعت میں عقدِ نکاح کے لیے مشروع کیے گئے ہیں، اور ان ہی کا استعمال قرآن اور حدیث شریف کے نصوص میں ہوا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ'' (النساء۴) پس اپنی پسند کی دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے شادی کرو۔

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ''فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ'' (سورہ احزاب ٣٧) پس جب زید نے اس سے اپنی ضرورت پوری کر لی تو ہم نے تمھاری شادی اس سے کردی تا کہ اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے شادی کرنے) میں مومنوں کے لیے کوئی حرج نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جس میں طاقت ہو تو وہ شادی کرے۔

٢۔ایجاب اور قبول میں لفظِ نکاح یا شادی کو صراحت کے ساتھ ادا کرنا

اگر ولی یہ کہے: میں نے اپنی دختر کی شادی تم سے کرادی۔ اس کے جواب میں شوہر کہے: میں نے قبول کیا۔ تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اگر شوہر کہے: اپنی دختر کی شادی مجھ سے کرادیجیے، اس کے جواب میں ولی کہے: میں نے قبول کیا تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ لفظِ نکاح اور شادی کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں عقدِ نکاح کے احکام

عربی کے علاوہ دوسری سبھی زبانوں میں عقدِ نکاح صحیح ہو جاتا ہے، اگر کسی دوسری زبان میں ایجاب وقبول ہو جائے تو شادی منعقد ہو جائے گی، چاہے شوہر اور ولی دونوں

عربی سے واقف ہی کیوں نہ ہوں، کیوں کہ مطلب اور مقصود کا اعتبار ہوگا، کیوں کہ لفظِ زواج یا لفظِ نکاح کا ترجمہ کرنا کافی ہو جاتا ہے۔

اشارے اور کنایہ کے الفاظ میں عقد نکاح کا حکم

اشارے اور کنایے میں ایجاب وقبول سے نکاح صحیح نہیں ہوتا، چاہے کسی بھی زبان میں ہو۔

کنایہ کے الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جن میں شادی کے علاوہ دوسرے معنی بھی لیے جاسکتے ہوں، مثلاً کوئی کہے: میں نے اپنی دختر کو تمھارے لیے حلال کیا، یا کہے: میں نے اپنی دختر کو تمھیں ہدیے میں دے دیا، کیوں کہ کنایہ کے الفاظ میں نیت کے پتہ چلانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور نیت کا مقام دل ہے، اور عقدِ نکاح میں گواہوں کا ہونا ضروری ہے، اور گواہ کو دلوں کا حال معلوم نہیں رہتا، جب تک خود شوہر اور ولی اپنے دل کی بات کا اظہار نہ کردیں کہ انھوں نے نکاح کی نیت کی تھی یا کوئی دوسری نیت۔

تحریری ایجاب وقبول کے احکام

اسی طرح تحریر کے ذریعے بھی نکاح نہیں ہوتا ہے، چاہے شوہر اور ولی دونوں موجود ہوں یا موجود نہ ہوں۔

اگر لڑکی کا ولی کسی غیر موجود شخص یا حاضر شخص کو لکھ کردے کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی تمھارے ساتھ کردی، یہ تحریر لڑکے تک پہنچ جائے اور اس کو پڑھ کر وہ کہے: میں نے تمھاری بیٹی کی شادی قبول کی۔ تو یہ عقدِ نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ تحریر کنایہ ہے، اور نکاح کنایہ کے الفاظ سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔

گونگے کا سمجھ میں آنے والے اشارے کا حکم

گونگے کا سمجھ میں آنے والے اشارے سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے، اشارہ ایسا ہو کہ ہر کوئی سمجھ سکے، اس کو سمجھنے کے لیے ذہین اور فطین لوگوں کا سہارا لینا نہ پڑے، کیوں کہ یہ لفظ

صریح کے قائم مقام ہے۔
اگر گونگے کا اشارہ واضح نہ ہو، یعنی اس کو صرف ذہین اور فطین لوگ ہی سمجھ سکتے ہوں تو عقدِ نکاح نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ کنایہ کے قائم مقام ہے، اور کنایہ سے نکاح نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ ایجاب وقبول میں زیادہ وقفہ نہ ہو

ایجاب وقبول کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ولی کی طرف سے ایجاب کے بعد فوراً لڑکا قبول کرے، اگر لڑکی کا ولی کہے: میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرادی۔ اس کے بعد لڑکا لمبے وقفے تک خاموش بیٹھا رہے پھر کہے: میں نے تمھاری بیٹی کے ساتھ شادی کرلی۔ تو اس صورت میں نکاح منعقد نہیں ہوگا، کیوں کہ ایجاب وقبول کے درمیان بڑا وقفہ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دوران ولی کی طرف سے رجوع کرنے کا احتمال پایا جاتا ہے۔ البتہ تھوڑا سا وقفہ پایا جائے مثلاً لڑکا سانس لے، یا چھینکے تو عقدِ نکاح ہوجائے گا۔

۴۔ ایجاب وقبول مکمل ہونے تک دونوں کی اہلیت باقی رہے

اگر ولی کہے: میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرادی۔ لیکن لڑکے کی طرف سے قبول ہونے سے پہلے ہی ولی پاگل ہوجائے یا بیہوش ہوجائے، پھر لڑکا قبول کرے تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔
اسی طرح اگر لڑکا کہے: میری شادی اپنی بیٹی سے کرادیجئے۔ پھر لڑکی کے ولی کے یہ کہنے سے پہلے کہ میں نے تمھارے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرادی۔ لڑکا بیہوش ہوجائے تو عقد صحیح نہیں ہوگا، اگر چہ قبول ہوچکا ہے، کیوں کہ عقد مکمل ہونے سے پہلے لڑکے اور ولی میں سے کسی ایک کی اہلیت باقی نہیں ہے۔

۵۔ ایجاب وقبول میں کوئی شرط نہ ہو

عقدِ نکاح کو مستقبل کے ساتھ معلق کرے یا کوئی شرط لگائے تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔
اگر لڑکی کا ولی کہے: جب رمضان آئے تو میں نے اپنی بیٹی کی شادی تمھارے ساتھ کردی۔ اس کے جواب میں لڑکا کہے: میں نے اس کے ساتھ شادی کرلی تو یہ عقد صحیح نہیں ہوگا۔

اگر لڑکی کا ولی کہے: اگر میری لڑکی امتحان میں کامیاب ہوگئی تو میں نے اس کا نکاح تمھارے ساتھ کر دیا، اس کے جواب میں لڑکا کہے: میں نے اس کے ساتھ شادی قبول کرلی۔ تو اس صورت میں بھی نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ عقدِ نکاح میں اسی وقت نکاح کا مکمل ہونا ضروری ہے، اور نکاح ہوتے ہی اس کے اثرات ونتائج کا ظاہر ہونا بھی لازم ہے، مستقبل کی طرف نکاح کی اضافت کرنا یا کسی شرط سے اس کو مشروط کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ نکاح کے احکام کو مستقبل تک موخر کیا جائے یا اس وقت تک موخر کیا جائے جب تک لگائی ہوئی شرط مکمل نہ ہوجائے، یہ عقدِ نکاح کے تقاضوں کے منافی ہے۔

۶۔ ایجاب وقبول مطلق ہو

نکاح میں کوئی مدت متعین کرنا صحیح نہیں ہے، مثلاً ایک مہینہ، یا ایک سال یا کسی چیز کے ہونے یا کسی کے آنے تک کے لیے شادی کرنے سے عقدِ نکاح صحیح نہیں ہوتا، اگر لڑکی کا ولی کہے: میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے ایک مہینے، یا ایک سال، یا فلاں کے آنے تک کے لیے کردی۔ لڑکا جواب میں کہے: میں نے اس کی شادی قبول کی۔ تو اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ متعہ کی شکل ہے جو اسلام میں حرام ہے۔

حضرت سبرۃ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! میں نے تم کو عورتوں سے لطف اندوز ہونے (متعہ) کی اجازت دی تھی، اب اللہ تعالی نے قیامت تک کے لیے اس کو حرام کردیا ہے، پس جس کسی کے پاس ایسی عورتیں ہوں تو اپنا راستہ خالی کرے، اور ان کو دی ہوئی کوئی بھی چیز نہ لے''۔ (مسلم: کتاب النکاح ۱۴۰۶)

نکاح شغار

نکاحِ شغار یہ ہے کہ لڑکی کا ولی کسی شخص سے کہے: میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے اس شرط پر کی کہ تم اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کردو اور ہر ایک دوسرے کے لیے مہر معاف کردے۔ اس کے جواب میں دوسرا کہے: میں نے تمھاری بیٹی کے ساتھ شادی کی اور اپنی بیٹی کے ساتھ تمھاری شادی مذکورہ شرط کے ساتھ کردی۔

اس شادی کے منعقد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کی شادی کے ساتھ شرط لگائی گئی ہے، اور شرط لگانے سے نکاح باطل ہو جاتا ہے، جیسا کی اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

یہ بھی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نکاحِ شغار سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شغار سے منع فرمایا، شغار یہ ہے کہ آدمی اپنی بیٹی کی شادی اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ بھی اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرے اور دونوں کے درمیان مہر نہ ہو۔ (بخاری: کتاب النکاح ۴۸۲۲، مسلم کتاب النکاح ۱۴۱۵)

اس شادی کو نکاحِ شغار عربوں کے اس قول کی وجہ سے کہا گیا ہے: "**شغر البلد من السلطان**" یعنی شہر حاکم سے خالی ہو گیا۔

یہ شادی مہر سے خالی ہے، اس لیے اس کو نکاحِ شغار کہا گیا۔

دوسرا رکن: بیوی

لڑکی کا نکاح صحیح ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ لڑکی کا نکاح کی رکاوٹوں (موانع) سے پاک رہنا ضروری ہے، جن کا تذکرہ محرم عورتوں اور پیغام کے باب میں کیا جا چکا ہے۔

۲۔ لڑکی متعین ہو، اگر ولی کہے: میں نے اپنی بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ تمھاری شادی کرا دی۔ تو نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ جس کی شادی کرا رہا ہے وہ متعین نہیں ہے۔

۳۔ لڑکی حج یا عمرہ کے احرام میں نہ ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "احرام پہنا ہوا شخص نہ نکاح کرے گا اور نہ اس کا نکاح کرایا جائے گا، اور نہ اس کو پیغام بھیجا جائے گا"، یعنی حالتِ احرام میں نہ شادی کرے گا، اور نہ کوئی دوسرا کسی احرام والی یا غیر احرام والی عورت کے ساتھ اس کی شادی کرائے گا، چاہے ولی خود کرے یا وکیل بنا کر کرے، اور نہ کسی عورت سے شادی کا مطالبہ کرے گا یعنی نہ پیغام بھیجے گا۔

تیسرا رکن: شوہر

شوہر میں مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔جس کے ساتھ لڑکی کا نکاح صحیح ہو، یعنی وہ لڑکی کا محرم نہ ہو۔

۲۔شوہر متعین ہو، اگر ولی کہے: میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تم میں سے ایک کے ساتھ کردیا تو نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ شوہر متعین نہیں ہے۔

۳۔شوہر حالتِ احرام میں نہ ہو، کیوں کہ احرام کی نیت کرنے کے بعد شادی کرنا اور کرانا، اسی طرح پیغام بھیجنا حرام ہوجاتا ہے، اور نکاح صحیح بھی نہیں ہوتا۔

چوتھا رکن: ولی

ولی عربی لفظ "ولایۃ" سے اسمِ فاعل ہے، اس کے معنی محبت اور نصرت کے ہیں، اس معنی میں اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "وَمَن يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ" (سورہ مائدہ ٥٦) اور جو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے محبت ونصرت کرتا ہے تو اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔

شریعت میں ولایت کہتے ہیں: دوسرے پر اپنی بات نافذ کرنا اور اس کے معاملات کی نگرانی کرنا۔

بعض فقہاء نے یہ تعریف کی ہے: دوسرے پر اپنی بات نافذ کرنا چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو، اس میں اجباری ولایت شامل ہے۔

ولی اس کو کہتے ہیں جس کو شریعت نے حق ولایت دیا ہو۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "فَإِنْ كَانَ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا أَوْ ضَعِيْفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ" (سورہ بقرہ ٢٨٢) پس جس پر حق ہے وہ بیوقوف یا کمزور ہو یا ایسا ہو جو املا نہ کراسکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔

حقِ ولایت مشروع کرنے کی حکمت

چھوٹے بچوں اور نا اہلوں پر ولایت مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان کی مصلحتوں اور مفادات کی حفاظت کی جائے، تاکہ ان کے مفادات ضائع نہ ہوجائیں اور ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے اوران کے حالات کو منظم کیا جائے۔

نکاح میں ولی کا پایا جانا ضروری ہے

عورت کی شادی میں ولی کا ہونا ضروری ہے جو عقدِ نکاح میں ولایت کے فرائض انجام دے، چاہے عورت چھوٹی ہو یا بڑی بالغہ، باکرہ ہو یا ثیبہ۔

کسی عورت کو خود اپنی شادی کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح وہ دوسرے کی بھی شادی اجازت کے ساتھ اور اجازت کے بغیر بھی نہیں کراسکتی، چاہے وہ ایجاب وقبول کیوں نہ کرلے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی دوسری عورت کی شادی نہیں کرے گی، اور نہ وہ خود اپنی شادی کرے گی''۔ ہم کہا کرتے تھے: جس نے خود اپنی شادی کرائی وہ فاسق ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ زانی ہے۔ (کتاب النکاح:٣/٢٢٧)

عورت کی شادی میں ولی کی شرط رکھنے کی حکمت

اس موقع پر ولی کی شرط رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت حیا کا پتلا ہوتی ہے، اس لیے یہ اچھی عادات اور اخلاق میں سے نہیں ہے کہ وہ نکاح کی محفل میں داخل ہوجائے۔

عورت کی شادی میں ولی رہنے کے وجوب کی دلیل

ولی کی موجودگی ضروری ہونے میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے استدلال کیا گیا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ** '' (سورۂ بقرہ ٢٣٢)

اور جب تم بیویوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو تم ان کو مت روکو کہ وہ اپنے

شوہروں کے ساتھ شادی کرلیں جب وہ اپنے درمیان بھلے طریقے پر راضی ہوجائیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: یہ آیت ولی کا اعتبار کرنے میں سب سے واضح دلیل ہے، کیوں کہ اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا تو ولی کی طرف سے عورت کو شادی سے روکنے کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔

ابن حبان نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نکاح صحیح نہیں ہوتا، مگر ولی اور دو عادل گواہوں کی موجودگی میں، جو نکاح ان کے بغیر ہو تو وہ باطل ہے''۔(موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان: کتاب النکاح، باب: ماجاء فی الولی والشھود، ابوداود: کتاب النکاح ۲۰۸۵، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۱) حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ولی کے بغیر نکاح نہیں''۔

ولی کے بغیر نکاح کا حکم اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات

اگر عورت ولی کے بغیر اپنی شادی خود کرے تو اس کا نکاح باطل ہوجائے گا، اگر اس کے بعد جماع ہوجائے تو بھی دونوں کے درمیان تفریق کی جائے گی، کیوں کہ عقدِ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا ہے، اس صورت میں مرد پر مہرِ مثل واجب ہوجاتا ہے، چاہے نکاح کرتے وقت مہر متعین کیا ہو یا نہ ہو۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''جو بھی عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے (آپ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی) اگر مرد اس کے ساتھ جماع کرے تو اس پر عورت کے لیے اس کی شرمگاہ حلال کرنے کی وجہ سے مہر ہے، اگر آپس میں جھگڑا کریں تو سلطان اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو''۔(ابوداود: کتاب النکاح ۲۰۸۳، ابن ماجہ: کتاب النکاح ۱۸۸۱، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۲، یہ روایت حضرت عائشہ سے ہے)

ولی کے بغیر کیے ہوئے اس باطل نکاح میں وطی کرنے والے مرد پر زنا کی سزا نافذ نہیں ہوگی، کیوں کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔

حدود اور سزائیں شبہ اور شک کی بنیاد پر نافذ نہیں کی جاتی ہیں، البتہ اس صورت میں

تعزیر کی جائے گی، یعنی ہلکی سزا دی جائے گی۔
تعزیر چھوٹی سے چھوٹی حد سے کم سزا ہے، جس کو قاضی اپنے صوابدید پر متعین کرتا ہے۔

شادی میں اولیاء کی ترتیب

عورت کی شادی میں ولی کی ترتیب مندرجہ ذیل ہوگی:

باپ
پھر دادا
پھر حقیقی بھائی
پھر علاتی بھائی
پھر حقیقی بھتیجہ
پھر علاتی بھتیجہ
پھر حقیقی چچا
پھر علاتی چچا
پھر حقیقی چچازاد بھائی
پھر علاتی چچازاد بھائی

اسی طرح سب عصبات ہوں گے، اگر عصبات نہ پائے جائیں تو قاضی ولی ہوگا، اس کی دلیل سابقہ حدیث ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کا کوئی ولی نہیں ہے اس کا ولی سلطان ہے''۔

شادی میں بیٹے کو ولایت حاصل ہے یا نہیں؟

بیٹے کو شادی میں ولایت حاصل نہیں رہتی، اور نہ پوتے کو، چناں چہ کوئی اپنی ماں کی شادی بیٹا ہونے کی حیثیت سے نہیں کرا سکتا، کیوں کہ بیٹے اور ماں کے نسب میں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے، عورت کا انتساب اس کے باپ کی طرف ہوتا ہے، اور بیٹے کا انتساب اس کے اپنے باپ کی طرف ہوتا ہے، مگر یہ کہ بیٹا اپنی ماں کے چچا زاد بھائی کا بیٹا ہو، اگر وہ

اپنی ماں کے بھتیجے کا بیٹا ہو تو قریبی ولی نہ پائے جانے کی صورت میں اس کو اپنی ماں کا اس حیثیت سے رشتہ ہونے کی وجہ سے شادی کرانا جائز ہے۔

ولی کے لیے شرطیں

ولی والد ہو یا کوئی دوسرا، مندرجہ ذیل شرطوں کا اس میں پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ وہ مسلمان ہو: کافر مسلم عورت کی شادی نہیں کرا سکتا، کیوں کہ کسی کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَلَن يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا'' (سورہ نساء ۱۴۱) اور اللہ ہرگز مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دے گا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شادی کی ولایت کا دارومدار وراثت میں عصبہ ہونے پر ہے، اور مسلمان اور کافر کے درمیان وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہے۔

کافر شخص کافر عورت کی شادی کرا سکتا ہے، چاہے دونوں کے درمیان اعتقادی اور مذہبی اختلاف پایا جائے، مثلاً یہودی مرد اپنی ولایت میں موجود عیسائی عورت کی شادی کرا سکتا ہے، اور نصرانی یہودی عورت کی شادی کرا سکتا ہے، کیوں کہ کفر ایک ہی ملت ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ'' (سورہ انفال ۷۲) اور جنھوں نے کفر کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

۲۔ عادل ہو: عدالت سے مراد یہ ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو اور صغیرہ گناہ پر اصرار نہ کرتا ہو، اسی طرح مروءت کے خلاف کوئی کام نہ کرتا ہو، مثلاً راستوں پر پیشاب نہ کرتا ہو، اور بغیر جوتے چپل کے نہ چلتا ہو وغیرہ۔

چناں چہ فاسق شخص ولی بن کر مومن عورت کا نکاح نہیں کرا سکتا، بلکہ شادی کرانے کا حق اس کے بعد والے ولی میں منتقل ہو جائے گا، اگر دوسرا عادل ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مرشد یعنی عادل ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں''۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اس کو صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حدیث میں مرشد سے مراد عادل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فسق وفجور گواہی دینے میں رکاوٹ بنتا ہے، چناں چہ شادی میں بھی ولی بننے میں یہ چیز رکاوٹ اور مانع ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ شادی میں عدالت شرط نہیں ہے، کیوں کہ شادی میں ولایت عصبی رشتے داری پر موقوف ہے، عصبی رشتے دار میں اپنی لڑکی کے مفادات کو تلاش کرنے کے لیے شفقت اور رحم دلی پائی جاتی ہے، عادل اور غیر عادل شخص میں اس شفقت ومحبت میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر شادی میں عادل ہونے کی شرط لگائی جائے تو بڑی مصیبت پیدا ہو جائے گی اور بڑا احرج ہوگا، کیوں کہ عادل لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں، خصوصاً ان دنوں میں عادل کا پایا جانا بہت ہی مشکل ہے، یہ بات تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ملتی کہ فاسقوں کو اپنی بچیوں کی شادی سے روکا گیا ہو۔

۳۔بالغ ہو: چناں چہ بچے کو دوسرے کی شادی کرانے میں حقِ ولایت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ اس کو خود اپنی ذات پر ولایت حاصل نہیں ہے، پھر وہ دوسرے کا کیسے ولی بن سکتا ہے۔

۴۔عاقل ہو: پاگل کو ولایت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ اس کو خود اپنی ذات پر ولایت حاصل نہیں ہے، پھر وہ دوسرے کا کیسے ولی بن سکتا ہے۔

۵۔کوتاہ بین نہ ہو: بوڑھاپے یا عقل کی کمی کی وجہ سے کوتاہ بین شخص کے لیے حقِ ولایت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ وہ کفو رشتے کا انتخاب کرنے سے قاصر رہتا ہے، اگر کوئی بیمار ہو جس کی وجہ سے وہ بیہوش ہو جاتا ہو تو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے گا، کیوں کہ بے ہوشی نیند کی طرح ہے، جو جلدی ختم ہو جاتی ہے۔

۶۔بیوقوفی کی وجہ سے اس پر پابندی نہ لگائی گئی ہو: یہ وہ شخص ہے جو اپنے مال کو بے دریغ خرچ کرتا ہو، کیوں کہ بیوقوف کو خود اپنے اوپر ولایت حاصل نہیں ہے تو دوسرے کی ولایت اس کو کیسے حاصل رہے گی۔

۷۔ولی حالتِ احرام میں نہ ہو: جو شخص حج یا عمرہ کی نیت سے حالتِ احرام میں ہو تو اس کو

شادی کرانا جائز نہیں ہے،اس کی دلیل سابقہ حدیث ہے،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:''احرام والا شخص نہ خود شادی کرے گا اور نہ دوسرے کی شادی کرائے گا''۔(مسلم:کتاب النکاح ۱۴۰۹)

قریبی ولی میں مذکورہ بالا سبھی شرطیں نہ پائی جائیں تو حقِ ولایت اس کے بعد والے ولی میں منتقل ہو جائے گی،جس میں یہ سبھی شرطیں پائی جائیں،سوائے احرام والے شخص کے،کیوں کہ احرام کی وجہ سے ولایت کا حق چھینا نہیں جا سکتا،اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دوسری سبھی شرطیں پائی جاتی ہیں،بس نکاح کرانے کی ممانعت رہتی ہے،اس صورت میں شادی کرانے کا حق سلطان یا حاکمِ وقت کو حاصل رہے گا۔

ولایت کی قسمیں

ولایت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔اجباری ولایت

۲۔اختیاری ولایت

اجباری ولایت

اجباری ولایت صرف باپ اور دادا کو حاصل رہتی ہے،ان کے علاوہ دوسرے کسی بھی ولی کو اجباری ولایت حاصل نہیں ہے۔

اجباری ولایت صرف باکرہ لڑکی کی شادی میں ہوتی ہے،چاہے وہ چھوٹی ہو یا بالغہ،عقل مند ہو یا پاگل۔

باپ اور دادا کو یہ حق رہتا ہے کہ وہ اپنی باکرہ لڑکی کی شادی اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کرا دے،کیوں کہ وہ اپنی بیٹی کے مفادات کو زیادہ جانتا ہے اور اس سے زیادہ شفیق لڑکی کے حق میں کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا،وہ اپنی بیٹی کے حق میں اسی کا انتخاب کرے گا جس میں لڑکی کا مفاد ہو گا۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے دی گئی ہے:''ثیبہ اپنے ولی سے زیادہ اپنی ذات کی حق دار ہے''۔اس کے مفہوم سے دلیل لی گئی ہے کہ باکرہ لڑکی کا ولی اس

کی ذات کا اِس سے زیادہ حق دار ہے۔

لیکن اجباری ولایت کے لیے تین شرطیں ہیں:

۱۔ولی اور اس کی لڑکی کے درمیان کوئی ظاہری دشمنی نہ ہو۔

۲۔لڑکا کفو ہو۔

۳۔لڑکا مہر نقد دے سکتا ہو۔

شادی میں باکرہ سے اجازت لینے کی ترغیب

والد اور دادا کے اجباری ولی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑکی کو اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ شادی پر مجبور کرنا اور لڑکی کی رائے کو ٹھکرانا افضل ہے، بلکہ افضل اور مستحب یہ ہے کہ شادی میں لڑکی کی بھی اجازت لی جائے، تاکہ اس کا احترام اور قدر کی جائے اور اس کے دل کو مطمئن کیا جائے۔

اس کی دلیل نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''ثیبہ کی شادی اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک اس کی اجازت نہ لی جائے، اور باکرہ کی شادی اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک اس کی اجازت نہ لی جائے''، صحابہ نے دریافت کیا: اللہ کے رسول! اس کی اجازت کیسے لی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ وہ خاموش رہے''۔(مسلم: کتاب النکاح ۱۴۱۹، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۷، امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ثیبہ اپنے ولی سے زیادہ اپنی ذات کی حق دار ہے، اور باکرہ سے اس کے بارے میں اجازت لی جائے گی، اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے۔ کتاب النکاح ۱۴۲۱، امام ترمذی نے بھی یہ روایت کی ہے: کتاب النکاح ۱۱۰۸)

باکرہ کے سلسلے میں یہ دونوں حدیثیں سنت پر محمول کی جائیں گی۔

اختیاری ولایت

اختیاری ولایت ان سبھوں کو ترتیب وار حاصل ہے جو اولیاء کی فہرست میں شامل ہیں۔

اختیاری ولایت ثیبہ عورت کے سلسلہ میں ہے، چناں چہ کسی بھی ولی کو چاہے وہ باپ دادا ہی کیوں نہ ہو، اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر شادی کرانے کا حق نہیں ہے۔

اس کی دلیل امام مسلم کی روایت کردہ سابقہ حدیث ہے: ''ثیبہ کی شادی اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک اس کی اجازت نہ لی جائے''۔

مسلم اور ترمذی کی یہ روایت بھی ہے: ''ثیبہ اپنے ولی سے زیادہ اپنے ذات کی حق دار ہے''۔ ثیبہ وہ عورت ہے جس کا پردۂ بکارت حرام یا حلال وطی کے ذریعے زائل ہو چکا ہو، البتہ جس کا پردۂ بکارت بیماری، گرنے یا کسی دوسری وجہ سے زائل ہو گیا ہو تو وہ ثیبہ نہیں ہے، بلکہ وہ باکرہ ہی ہے۔

ثیبہ سے اجازت لینے کی حکمت

ثیبہ کی شادی اس کی اجازت اور رضامندی کی صورت میں ہی کرنے کی حکمت یہ ہے کہ وہ شادی کا مقصد جانتی ہے، اس لیے اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا، اور پہلے شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ صراحت کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتی ہے، جب کہ باکرہ کو شرم محسوس ہوتی ہے۔

نابالغ ثیبہ کی شادی

نابالغ ثیبہ کی شادی بالغ ہونے سے پہلے کرنا نہ اس کے باپ کے لیے جائز ہے اور نہ کسی دوسرے ولی کے لیے، کیوں کہ نابالغ کی اجازت کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، چناں چہ بالغ ہونے تک اس کی شادی نہیں کی جائے گی، بالغ ہونے کے بعد اس کی اجازت کا اعتبار ہوگا۔

اگر ولی عورت کو شادی سے روکے

اگر بالغ اور عاقل عورت کسی کفو سے شادی کا مطالبہ کرے تو اس کے ولی کے لیے ضروری ہے کہ وہ شادی کرائے، اگر ولی شادی سے انکار کردے تو حاکمِ وقت اس کی شادی کرائے گا، چاہے انکار کرنے والا ولی باپ ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اگر کوئی کفو مرد اس لڑکی سے شادی کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کی شادی کرنا ضروری ہے، اگر وہ اپنا یہ حق ادا نہ کرے تو حاکم اپنی طرف سے یہ حق ادا کرے گا۔

اس کی دلیل امام ابوداود اور ترمذی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”حاکم اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو“۔ (ابوداود: کتاب النکاح ۲۰۸۳، ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۲)

اگر کوئی لڑکی کسی کفولڑکے کا انتخاب کرے اور ولی کسی دوسرے کفولڑکے کا انتخاب کرے تو ولی کو لڑکی کے متعین کردہ لڑکے سے شادی کو روکنے کا حق ہے، جب کہ وہ باکرہ ہو، کیوں کہ ولی زیادہ واقف رہتا ہے۔

ولی موجود نہ ہو

اگر متعدد ولی ہوں اور سب سے قریبی ولی موجود نہ ہو، تو اس صورت میں اگر ولی دو مرحلے یعنی ایک دن اور رات کی پیدل مسافت یا اس سے زیادہ دور ہو تو ولایت کا حق بعد والے ولی کی طرف منتقل نہیں ہوگا، بلکہ حاکمِ شہر اس لڑکی کا نکاح کرائے گا، کیوں کہ ولی موجود نہیں ہے، اور شادی کرانا اس کا حق ہے، اگر وہ اپنی غیر موجودگی کی وجہ سے اپنا حق ادا کرنے سے قاصر ہو تو حاکم اس کا نائب ہوگا۔

اگر وہ دو مرحلے کے اندر موجود ہو تو حاکم اس کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرا سکتا، کیوں کہ مسافت کم ہے اور اس سے رجوع ہونا بھی ممکن ہے، یا تو وہ خود ہو جائے یا کسی کو وکیل بنائے، جس طرح کوئی موجود ہوتا ہے تو خود نکاح کراتا ہے یا کسی کو وکیل بناتا ہے۔

ایک ہی درجے کے کئی ولی موجود ہوں

اگر ایک ہی درجے کے کئی ولی موجود ہوں مثلاً کئی حقیقی بھائی موجود ہیں، یا کئی علاتی بھائی، تو مستحب یہ ہے کہ ان میں جو نکاح کے باب کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو، وہ شادی کرائے، کیوں کہ وہ نکاح کے شرائط سے سب سے زیادہ واقف رہے گا۔

اس کے بعد سب سے زیادہ متقی حق دار ہوگا، کیوں کہ وہ سب سے زیادہ شفیق ومہربان رہے گا اور اس بات کا سب سے زیادہ حریص رہے گا کہ لڑکی کے لیے سب سے زیادہ بہتر لڑکے کو تلاش کرے۔

ان میں سے ہر ایک دوسروں کی رضامندی سے لڑکی کی شادی کرائے گا تاکہ بھوں

کی رائے یکساں ہو، اور کسی کو تشویش نہ ہو، اگر ان اولیاء میں اختلاف ہو جائے اور ہر کوئی کہے کہ میں اس لڑکی کی شادی کراؤں گا تو جھگڑا ختم کرنے کے لیے قرعہ اندازی کرنا ضروری ہے، جس کے نام قرعہ نکلے گا وہی لڑکی کی شادی کرائے گا۔

اگر غیر افضل ولی یا وہ شخص جس کے نام قرعہ نہ نکلا ہو، وہ لڑکی کی شادی کرائے اور لڑکی نے ہر ایک کو اپنی شادی کی اجازت دی ہو تو اجازت کی بنیاد پر یہ شادی صحیح ہو جائے گی، اگر لڑکی نے کسی ایک کو شادی کرنے کی اجازت دی ہو، اور دوسرا شادی کرائے تو لڑکی کی اجازت اور رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے شادی صحیح نہیں ہوگی۔

کوئی ولی نہ پایا جائے

اگر کوئی بھی ولی نہ پایا جائے تو قاضی ولی بن جائے گا، کیوں کہ اس کو مسلمانوں کے مفادات پورا کرنے کی ذمے داری دی گئی ہے۔

جس کا کوئی ولی نہ ہو، اس کی شادی کرانے میں اس کے مفادات کا خیال رکھنا ضروری ہے، نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان گزر چکا ہے: "جس کا کوئی ولی نہیں، اس کا ولی حاکم ہے"۔ (ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۲)

نکاح میں وکیل بنانے کے احکام ومسائل

ولی اجباری یعنی باپ اور دادا کے لیے باکرہ کی شادی میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شادی کا وکیل بنانا صحیح ہے۔

اس وکالت کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ ولی وکیل کے لیے شوہر متعین کرے، کیوں کہ ولی کو وکالت میں لڑکا متعین کرنے کا حق ہے تو اس کو مطلقاً وکیل بنانے کا بھی حق ہے، جب ولی مطلقاً وکیل بنائے تو وکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ لڑکی کے مفاد کا خیال رکھے، چناں چہ وہ لڑکی کی شادی کسی غیر کفو سے نہ کرائے، کیوں کہ مطلقاً وکیل بنانے کی صورت میں کفو کی شرط خود بخود نافذ ہو جائے گی۔

غیر اجباری ولی یعنی باپ اور دادا کے علاوہ اولیاء کے لیے عورت کی اجازت کے بغیر

اس کی شادی میں وکیل بنانا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کرنے کا حق نہیں ہے، چناں چہ اس کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کا وکیل بنانے کا بھی حق نہیں ہے۔

پانچواں رکن: دو گواہ

تمہید:

شادی کا عقد اگر چہ دوسرے عقود کی طرح ہے جن میں رضامندی اور ایجاب وقبول شرط ہے، لیکن اسلام نے اس عقد کو عظمت عطا کی ہے اور اس کی شان بڑھائی ہے، اور اس کو دینی رنگ میں رنگ دیا ہے اور عبادت کی چھاپ عطا کی ہے، لہذا شادی کرنے کو اللہ عزوجل کی اطاعت اور ثواب کا کام بتایا ہے۔

چوں کہ عقد نکاح کے بڑے عظیم نتائج مرتب ہوتے ہیں؛ شوہر اور بیوی کے لیے ایک دوسرے سے لطف اندوزی حلال ہو جاتی ہے، مہر اور نفقہ واجب ہو جاتا ہے، نسب ثابت ہو جاتا ہے، وراثت کے حق دار بن جاتے ہیں، پیروی واجب ہو جاتی ہے اور اطاعت ضروری ہو جاتی ہے، یہ نتائج اور احکام جو داور انکار کے بھی شکار ہوتے ہیں، اس لیے اسلام نے ان کو محفوظ بنا دیا ہے اور کم از کم دو گواہوں کو لازم قرار دیا ہے جو نکاح کے عقد کے وقت موجود رہیں اور ان کے لیے ایسی شرطیں بتائی ہیں جن سے وہ ان نتائج کو ثابت کرنے کے لیے بھروسہ اور اطمینان کے لائق رہیں، جب ان کو گواہی دینے کی اس وقت ضرورت پڑے جب میاں بیوی کے درمیان اختلافات رونما ہو جائیں یا اس عقد کے حقوق اور نتائج کا دونوں میں سے کوئی ایک انکار کر دے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ”نکاح معتبر نہیں مگر ایک ولی اور دو عادل گواہوں کی موجودگی میں، اور جو اس کے علاوہ ہو تو وہ نکاح باطل ہے“۔ (ابن حبان: موارد الظمآن إلی زوائد ابن حبان: النکاح ۱۲۷)

گواہوں کی شرطیں

گواہوں میں مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ مسلمان ہو:

غیر مسلم کے گواہ بننے سے عقدِ نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ نکاح ایک دینی کام ہے، اس لیے دینِ اسلام کو ماننے والے کی گواہی ضروری ہے، اس لیے بھی کہ غیر مسلم کی گواہی مسلمانوں کے خلاف نہیں مانی جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ گواہی ولایت ہے اور مسلمان کے خلاف غیر مسلم کی گواہی قبول نہیں ہے، کیوں کہ غیر مسلم کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ'' (توبہ ۷۱) اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا'' (سورہ نساء ۱۴۱) اور اللہ ہرگز مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دے گا۔

۲۔ مرد ہو:

عورتوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے اور نہ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت ہے کہ حدود، نکاح اور طلاق میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے''۔ زہری تابعی ہیں، تابعی کی طرف سے اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کی مرفوع حدیث کے حکم میں ہے جیسا کہ علماء نے بیان کیا ہے۔

۳۔ عاقل اور بالغ ہو

صرف پاگلوں اور بچوں کی موجودگی میں نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ نکاح کی بڑی اہمیت اور اس کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، اسی وجہ سے صرف پاگلوں اور بچوں پر اکتفا کرنا اس کی شان گھٹاتا ہے۔

۴۔ عادل ہو چاہے ظاہراً ہی کیوں نہ ہو

گواہوں کے لیے عادل ہونا ضروری ہے، چاہے ظاہری طور پر ہی کیوں نہ ہو یعنی ان کا حال پوشیدہ ہو اور ان کا فسق ظاہر نہ ہوا ہو۔

گناہوں کو علی الاعلان کرنے والوں کی گواہی سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ان کی گواہی معتبر نہیں ہے۔

۵۔ بہرا نہ ہو

بہروں کی گواہی یا سوئے ہوئے شخص کی گواہی سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس طرح کے لوگوں سے گواہی کا مقصد حاصل نہیں ہوتا ہے، یہ بھی وجہ ہے کہ جس کے خلاف گواہی دی جاتی ہے وہ قول ہے جس کا سننا ضروری ہے۔

٦۔ اندھا نہ ہو

اندھوں کی گواہی سے بھی نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے کیوں کہ اقوال دیکھ اور سن کر ہی ثابت ہوتے ہیں۔

لڑکی کی رضامندی پر گواہی

عقدِ نکاح میں لڑکی کی رضامندی پر گواہ بنانا مستحب ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہ (مذکورہ بالا شرطوں کے پائے جانے والے افراد) لڑکی کی رضامندی اور اجازت کو سنیں، مثلاً لڑکی کہے: میں اس شادی پر راضی ہوں یا کہے: میں اس شادی کی اجازت دیتی ہوں، یہ احتیاطی اقدام ہے تا کہ وہ نکاح کے بعد انکار نہ کردے۔

باپ یا دادا کو پاک دامن بنانے کی کوشش

بچوں کو چاہیے چاہے وہ نرینہ اولاد ہوں یا زنانہ، مسلمان ہوں یا کافر، باپ کو پاکدامن بنانا ضروری ہے، اسی طرح دادا اور نانا کا بھی مسئلہ ہے، چاہے باپ، دادا یا نانا مسلمان ہوں یا کافر، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد، دادا یا نانا کو آزاد عورت کا مہر دے

یا اس سے کہے: آپ شادی کیجیے، میں آپ کا مہر دوں گا۔
لیکن بچوں پر اس کے واجب ہونے کے لیے مندرجہ ذیل تین شرطیں ہیں:
۱۔ بچہ میں مہر دینے کی طاقت ہو۔
۲۔ باپ، اسی طرح دادا یا نانا مہر دینے سے عاجز اور تنگ دست ہو۔
۳۔ باپ، دادا یا نانا کو شادی کی ضرورت ہو۔

باپ، دادا یا نانا کو پاک دامن بنانا اس کی ضرورتوں میں سے ہے جیسا کہ اخراجات اور کپڑے وغیرہ فراہم کرنا ضرورت ہے؛ تا کہ وہ ہلاکت تک پہنچانے والے زنا کا شکار نہ ہو جائے، یہ والد کے احترام کے لائق اور مناسب نہیں ہے اور یہ بھلائی کے ساتھ ان سے برتاؤ کرنے کا طریقہ نہیں ہے، جس کا حکم اللہ تبارک وتعالی نے دیا ہے: "**وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا**" (لقمان ۱۵) اور دنیا میں ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

کفار کی شادیاں

کافروں کی آپس میں شادی صحیح ہے، اس کی دلیل غیلان وغیرہ کی حدیثیں ہیں، جو اسلام لے آئے اور ان کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں تو نبی کریم ﷺ نے چار کو اپنے ساتھ رکھ کر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے غیلان سے ان عورتوں کے ساتھ کی ہوئی شادی کے شرائط کے بارے میں دریافت نہیں کیا، اسی لیے اس کی تحقیق کرنا ضروری نہیں ہے۔

اگر وہ ہمارے پاس مقدمہ لے آئیں تو ہم ان کی شادی باطل نہیں کہیں گے، اگر وہ اسلام لے آئیں گے تو ہم ان کا نکاح باقی رکھیں گے۔

اگر کوئی شخص کافر تھا، اور اس کی بیوی بھی کافر تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ اسلام لے آئیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا، کیوں کہ جدائی دین کے اختلاف کی صورت میں ہوتی ہے، اور اس صورت میں دونوں کا دین نہ حالتِ کفر میں مختلف تھا اور نہ حالت اسلام میں۔

امام ترمذی (النکاح ۱۱) اور امام ابو داود (الطلاق ۲۲۳۸) نے حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اسلام لے آیا پھر اس کی بیوی بھی مسلمان ہو کر آئی تو اس شخص نے کہا: اللہ کے رسول! اس نے میرے ساتھ اسلام قبول کیا تھا، پس آپ اس کو میرے پاس واپس کر دیجئے۔ چناں چہ آپ نے اس عورت کو اس کے پاس واپس کر دیا۔ یعنی ان کا نکاح باقی رکھا۔

اگر مرد اسلام لے آئے اور عورت کافر ہی ہو تو اس میں تفصیل ہے:

اگر بیوی اہلِ کتاب میں سے ہے تو یہ نکاح باقی رہے گا، کیوں کہ مسلمان مرد کو اہلِ کتاب عورت سے شادی کرنا جائز ہے۔

اگر عورت بت پرست ہے یا ملحدہ ہے اور عدت کے دوران وہ اسلام نہ لے آئے تو شوہر کے اسلام قبول کرنے کے وقت سے جدائی مانی جائے گی۔

اگر وہ عدت کے دوران اسلام لے آئے تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔

اگر عورت اسلام لے آئے اور شوہر کفر پر باقی رہے تو عورت کے اسلام لاتے ہی دونوں کے درمیان جدائی کرائی جائے گی، البتہ اگر وہ بھی اسلام لے آئے اور عورت ابھی عدت میں ہو تو سابقہ نکاح باقی رہے گا۔

اگر مرد عدت گزرنے کے بعد اسلام لے آئے تو نیا نکاح کرنا ضروری ہے۔

عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے، انھوں نے عمرو کے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب کو ابوالعاص بن ربیع کے پاس نئے مہر اور نئے نکاح سے لوٹایا۔ (ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۴۲) ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں کلام ہے اور اہلِ علم کے نزدیک اس حدیث پر عمل یہ ہے کہ عورت جب اپنے شوہر سے پہلے اسلام لے آئے پھر اس کا شوہر عدت کے دوران اسلام لے آئے تو اس کا شوہر اس کا زیادہ حق دار ہے۔

مہر

مہر کی تعریف

مہر وہ مال ہے جس کا دینا شوہر پر اپنی بیوی کو عقدِ نکاح کی وجہ سے ضروری ہے۔

مہر کے احکام

مہر کے بہت سے احکام ہیں جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے:

ا۔مہر کا حکم

نکاح ہوتے ہی مہر دینا شوہر پر فرض ہے چاہے عقد کے وقت مال کی مقدار متعین کی جائے مثلاً ایک ہزار روپے، یا متعین نہ کی جائے، چاہے مہر نہ دینے یا متعین نہ کرنے پر دونوں متفق ہو جائیں، کیوں کہ یہ اتفاق باطل ہے اور مہر دینا فرض ہے۔

۲۔مہر فرض ہونے کے دلائل

مہر فرض ہونے کی دلیل قرآن اور حدیث کے نصوص اور امت کا اجماع ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً'' (نساء۴) اور عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی کے ساتھ دو۔

اس آیت کے مخاطب شوہر ہیں، اللہ عز وجل کا یہ بھی فرمان ہے: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ، فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً'' (نساء۲) پس تم نکاح کے ذریعے ان سے جو لطف اٹھاؤ تو ان کو ان کا مہر بطور فرض دے دو۔

یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے: ''لا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً'' (بقرہ۲۳۶) تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب

تک تم ان کو نہ چھوؤ یا ان کے لیے مہر متعین کرو۔

امام بخاری (فضائل القرآن ۴۷۴۱) اور امام مسلم (کتاب النکاح ۱۴۲۵) نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ اس نے خود کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہبہ کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے عورتوں کی ضرورت نہیں ہے''۔ ایک شخص نے کہا: میری شادی اس سے کرا دیجئے۔ آپ نے فرمایا: ''اس کو کپڑا دو''۔ اس نے کہا: میرے پاس نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اس کو دو چاہے لوہے کی انگھوٹی ہی کیوں نہ ہو''۔ اس نے اپنی مجبوری بیان کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں کتنا قرآن یاد ہے؟'' اس نے کہا: مجھے یہ یہ یاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی اس کے بدلے جو تمہارے پاس قرآن ہے''۔

اجماع: کسی بھی عالم یا فقیہ کے اختلاف کے بغیر سبھی علماء کا اس کے واجب ہونے پر اتفاق ہے۔

۳۔ مہر مشروع کرنے کی حکمت

مہر مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ شوہر کی طرف سے اپنی بیوی کے ساتھ بہترین معاشرت اور بہتر طریقہ پر اس کے ساتھ رہنے کی سچی خواہش اور رغبت کا اظہار ہو۔

اسی طرح مہر دے کر عورت کو شادی کے لیے ضروری ساز وسامان؛ کپڑا اور اخراجات وغیرہ دینا ہے۔

۴۔ نکاح کے وقت مہر متعین کرنا

نکاح کے وقت مہر متعین کرنا سنت ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے مہر متعین کیے بغیر کوئی نکاح نہیں کیا اور مہر متعین کرنے میں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کا سدباب ہے۔

علماء نے آپ ﷺ کے عمل کو واجب ہونے پر محمول نہیں کیا ہے، کیوں کہ نکاح کے وقت مہر متعین نہ کرنے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے، اگر چہ علماء نے اس کو مکروہ کہا ہے، کیوں کہ اس میں نبی کریم ﷺ کے عمل کی مخالفت ہے۔

۵۔ مہر کی ملکیت

مہر صرف بیوی کی ملکیت ہے، اس کے اولیاء میں سے کسی کو بھی اس میں کوئی حق نہیں ہے، اگر چہ ان کو لڑکی کی طرف سے قبضہ کرنے کا حق ہے، لیکن وہ لڑکی کو دینے کے لیے ہی قبضہ میں لیں گے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُوْنَهُ بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِيْنًا '' (نساء ۲۰) پس تم اس میں سے کچھ بھی مت لو، کیا تم اس کو بطور بہتان اور بڑے گناہ کے طور پر لیتے ہو۔

اللہ عزوجل کا یہ بھی فرمان ہے: ''فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا '' (نساء ۴) پس اگر وہ تم کو اس (مہر) میں سے کچھ خوش دلی کے ساتھ دے تو اس کو رغبت کے ساتھ کھاؤ۔

٦۔ مہر کی حد

نہ کم سے کم مہر کی کوئی مقدار متعین ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی مقدار، جس کو بھی مال کہنا صحیح ہے یا اس کو کسی مال کا مقابل بنانا صحیح ہے تو اس کا مہر بنانا جائز ہے، چاہے کم ہو یا زیادہ، عین ہو یا قرض، یا کوئی منفعت ہو؛ مثلاً جاے نماز، ایک ہزار روپے، کسی گھر میں رہنا یا کسی پیشہ کی تعلیم وغیرہ۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ'' (نساء ۲۴) اور تمھارے لیے ان کے علاوہ حلال کردیا گیا ہے کہ تم اپنے مالوں کے ذریعے (روزی) تلاش کرو۔

اللہ نے مطلقاً مال کہا ہے اور اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اس کو دو چاہے لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو''۔

(بخاری: فضائل القرآن ۴۷۴۱، مسلم: النکاح ۱۴۲۵)

امام ترمذی (النکاح ۱۱۱۳) نے حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بنو فزارہ کی ایک عورت نے دو چپلوں کے عوض شادی کرلی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ

نے دریافت کیا: ''کیا تم اپنی جان اور دو چپلوں پر راضی ہو؟''۔ اس نے کہا: جی ہاں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے اس نکاح کی اجازت دے دی۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ''(نساء ۲۰) اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بنانا چاہو اور تم نے ان کو ڈھیر سارا سامان دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی مت لو۔

اللہ نے شوہر کے لیے اپنی بیوی کو ایک ڈھیر مال دینے کو حلال قرار دیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مہر میں زیادتی کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔

لیکن مستحب یہ ہے کہ مہر دس درہم سے کم نہ ہو، تا کہ اس مقدار کو واجب قرار دینے والوں کی مخالفت نہ ہو، جیسا کہ احناف کا یہ مسلک ہے۔

اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ پانچ سو درہم سے زیادہ نہ ہو، کیوں کہ آپ ﷺ کی بیٹیوں اور بیویوں کے مہر میں یہی مقدار روایت کی گئی ہے۔

امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے (النکاح ۱۱۱۴) کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو، اگر دنیا میں یہ عزت اور آخرت میں تقوی کی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کے تم میں سب سے زیادہ حق دار تھے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بیوی اور اپنی کسی بیٹی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے زیادہ نہیں دیا''۔

ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، اس طرح مجموعی طور پر ۴۸۰ درہم ہو گئے، یہ مقدار تقریباً زکوۃ کی ڈھائی گنا زیادہ مقدار ہے کہ چاندی میں زکوۃ دوسو درہم پر واجب ہوتی ہے۔ (دس درہم 33.6 گرام کے برابر ہوتا ہے، 480 درہم کا وزن 1612.8 گرام ہو جائے گا اور پانچ سو درہم کا وزن 1680 گرام ہو جائیں گے)

٦۔ مہر کو فوری اور تاخیر سے دینے کے مسائل

مہر کو فوری دینا شرط نہیں ہے، بلکہ جماع سے پہلے پورے مہر کو دینا بھی صحیح ہے اور بعد میں

دینا یا مہر کے ایک حصے کو جماع کے بعد تک تاخیر کرنا بھی صحیح ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مدت متعین ہو، کیوں کہ مہر بیوی کی ملکیت ہے، چناں چہ اسی کو جلدی لینے یا موخر کرنے کا حق اور اختیار ہے۔

اگر مہر معجّل (جلدی دیا جانے والا) ہو تو بیوی کو اپنا مہر لینے تک خود کو شوہر سے دور رکھنا جائز ہے۔

اگر مہر بعد میں دینا طے ہو جائے تو عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود کو شوہر سے روکے رہے، کیوں کہ وہ تاخیر سے لینے پر راضی ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے اس کا خود کو روکے رکھنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

۷۔ مکمل مہر کب واجب ہوتا ہے، نصف کب اور مہر کب ساقط ہو جاتا ہے

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ عقدِ صحیح کی صورت میں شوہر پر بیوی کے حق میں مہر واجب ہو جاتا ہے۔

اب ہم ان حالتوں کو بیان کر رہے ہیں کہ کن صورتوں میں شوہر پر پورا مہر لازم ہوتا ہے اور کن صورتوں میں نصف مہر، اور کن صورتوں میں مہر ساقط ہو جاتا ہے۔

اَ۔ پورا مہر واجب ہونے کی صورتیں

دو صورتوں میں پورا مہر واجب ہو جاتا ہے:

ا۔ جب شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جماع کر لے، چاہے جماع حلال شکل میں ہو مثلاً عورت پاک ہو، یا حرام حالت میں مثلاً عورت حالتِ حیض میں ہو اور شوہر اس کے ساتھ جماع کر لے، جب شوہر اس کے ساتھ جماع کر لے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے، کیوں کہ جس غرض سے نکاح ہوا تھا اس نے اس کو پورا کر لیا ہے یعنی وہ لطف اندوز ہو چکا ہے، اس لیے اس کا بدل اور عوض دینا ضروری ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ، فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً '' (نساء ۲۴) پس تم نکاح کے ذریعے ان سے جو لطف اٹھاؤ تو ان کو ان کا مہر بطور فرض دے دو۔

یہاں استمتاع سے مراد جماع اور اس سے لذت حاصل کرنا ہے اور اجرت سے مراد مہر ہے، یہاں مہر کو اجرت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کا استحقاق منفعت کے مقابلے میں ہے جس کا یہاں تذکرہ لذت اور لطف اندوزی سے کیا گیا ہے۔

امام مالک (موطأ: کتاب النکاح ۲/۵۲۶) نے حضرت عمر رضی اللہ سے روایت کیا ہے: ''جو شخص بھی کسی عورت سے شادی کرے...... پھر اس کے ساتھ جماع کرے تو اس کے لیے مکمل مہر ہے''۔

۲۔ میاں بیوی میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، چاہے جماع سے پہلے انتقال کر جائے یا جماع کے بعد۔

اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔

ب۔ نصف مہر واجب ہونے کی صورتیں

صرف ایک صورت میں شوہر پر نصف مہر واجب ہوتا ہے:

صحیح عقدِ نکاح کے بعد بیوی کو جماع سے پہلے طلاق دے اور نکاح کے وقت مہر بھی متعین کیا گیا ہو۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُم'' (بقرہ ۲۳۷) اور اگر تم نے ان کو جماع سے پہلے طلاق دیا اور تم نے ان کے لیے مہر مقرر کیا ہے تو مقرر کیا ہوا آدھا ان کو دیا جائے گا۔

ج۔ پورا مہر ساقط ہونے کی صورتیں

شوہر سے اس وقت پورا مہر ساقط ہو جاتا ہے جب بیوی اپنے شوہر کو جماع سے پہلے چھوڑ دے، یہ جدائی بیوی کی طرف سے ہو، مثلاً جب لڑکی اسلام لے آئے تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے، یا لڑکی مرتد ہو جائے، یا شوہر میں کسی عیب کی پائے جانے کی وجہ سے قاضی کے ذریعے نکاح کو فسخ کر دے، یا اس لڑکی میں کوئی عیب پائے جانے کی وجہ سے شوہر نکاح فسخ کرا دے،

ان تمام صورتوں میں پورا مہر ساقط ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس جدائی کا سبب لڑکی ہے۔

۸۔مہر مثل

مہر مثل کی تعریف:

مہر مثل وہ مال ہے جو شادی میں عام طور پر اس کی ہونے والی بیوی کی خاندان کی دوسری عورتوں کے لیے طلب کیا جاتا ہو۔

مہر مثل عورت کے والد کی طرف سے رشتہ دار عورتوں کو دیکھ کر متعین کیا جاتا ہے۔

چناں چہ جس عورت کا مہر مثل طلب کیا جائے تو اس کی عصبہ بننے والی سب سے قریبی عورت کا مہر دیکھا جائے گا۔

مثلاً حقیقی بہن پھر علاتی بہن پھر بھتیجیاں پھر پھوپھیاں۔

اسی طرح ان صفات میں بھی یکساں ہونے کی رعایت رکھی جائے گی جن اوصاف کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

اگر عصبہ بننے والی عورتیں نہ ہوں یا ان کی شادی نہ ہوئی ہو تو ماں کی طرف سے سب سے قریبی رشتے دار کے مہر کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً ماں، نانی، خالہ، بھانجیاں، کیوں کہ یہ عورتیں غیر رشتے دار عورتوں کے مقابلے میں زیادہ حق دار ہیں۔

اگر ماں کی طرف سے بھی رشتے دار عورتیں نہ پائی جائیں تو اس کے شہر کی عورتوں کا مہر معتبر مانا جائے گا، جو مندرجہ ذیل صفات میں اس کے برابر ہوں۔

مہر مثل کی تعیین میں معتبر صفات

مہر مثل متعین کرنے میں نسب کے ساتھ مندرجہ ذیل صفات میں بھی یکسانیت ہونے کا اعتبار کیا جائے گا:

عمر، عقل، خوبصورتی، مالداری، عفت وپاکدامنی، دین داری، تقوی، علم، باکرہ یا ثیبہ اوران تمام امور کا جن سے صحیح عقد میں اختلاف ہوتا ہو، کیوں کہ ان صفات میں اختلاف

سے بھی مہر پر اثر پڑتا ہے۔

مہرِ مثل کے مشروع ہونے کی دلیل

امام ابوداود (النکاح ۲۱۱۴) اور امام ترمذی (النکاح ۱۱۴۵، انھوں نے کہا ہے کہ یہ روایت حسن صحیح ہے) وغیرہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے ایک عورت سے شادی کی اور اس کا مہر متعین نہیں کیا اور اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لیے اس جیسی عورتوں کا مہر ہے، نہ اس میں زیادتی ہے اور نہ ظلم، اور اس پر عدت ہے اور اس کے لیے وراثت ہے"۔ معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوگئے اور کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہم میں سے ایک عورت بروع بنت واشق کے سلسلے میں بھی ویسا ہی فیصلہ کیا تھا جیسا آپ نے کیا ہے۔ اس پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ خوش ہوگئے۔

کن صورتوں میں مہرِ مثل واجب ہوجاتا ہے

مندرجہ ذیل اسباب پائے جانے کی صورت میں مہرِ مثل واجب ہوجاتا ہے:

۱۔ جب عقدِ نکاح فاسد ہوجائے، مثلاً عقد کی کوئی شرط مفقود ہوجائے، اس کی مثال یہ ہے کہ عورت کی شادی گواہوں کے بغیر یا ولی کی عدم موجودگی میں ہوجائے، پھر اس عقدِ فاسد کے بعد بیوی سے جماع کرے تو اس کو مہرِ مثل دینا واجب ہے، کیوں کہ عقد اور متعین کردہ مہر فاسد ہوجاتا ہے، اسی طرح ان دونوں کو جدا کرنا بھی ضروری ہے۔

جماع کے وقت مہرِ مثل کا اندازہ لگایا جائے گا، عقدِ نکاح کے وقت نہیں، کیوں کہ عقدِ فاسد کا اعتبار ہی نہیں ہے۔

۲۔ جب شوہر اور بیوی کے درمیان مہر کی مقدار میں اختلاف ہوجائے اور مہر کو منسوخ کردیا جائے۔

اگر میاں بیوی کے درمیان مہر کی تعیین میں اختلاف ہوجائے، مثلاً بیوی کہے: تم نے عقدِ نکاح میں مہر مقرر کیا تھا۔ شوہر کہے: میں نے مہر متعین نہیں کیا تھا۔ بیوی اپنے دعوی پر قسم

کھائے اور شوہر اپنے دعوے پر قسم کھائے۔اس صورت میں مہر کالعدم ہوجائے گا اور مہر مثل دینا واجب ہوجائے گا۔

۳۔جب مہر کو غلط طور پر متعین کیا جائے:

مندرجہ ذیل شکلوں میں مہر فاسد ہوجاتا ہے:

أ۔متعین کردہ مہر شرعی طور پر مال ہی نہ ہو،مثلاً شراب،خنزیر،آلات لہو اور اس طرح کی دوسری وہ چیزیں جن کو شریعت میں مال شمار نہیں کیا جاتا،کیوں کہ شریعت نے ضروری قرار دیا ہے کہ مہر مال ہو یا مال کا مقابل ہو،جب کہ یہ چیزیں شرعی طور پر مال ہیں ہی نہیں۔

ب۔مہر میں جو مال متعین کیا ہو وہ اس کی ملکیت نہ ہو،مثلاً غصب کی ہوئی کوئی چیز مہر میں دے۔

ج۔ایک ہی مہر سے دو یا زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کرے،کیوں کہ نکاح تو صحیح ہوجاتا ہے لیکن مہر فاسد ہے،ہر عورت کو مہر مثل دینا واجب ہے،کیوں کہ یہ معلوم نہیں ہے کہ عقد کے وقت ان میں سے مہر کس کے ساتھ مخصوص تھا۔

د۔ولی چھوٹے بچے کا نکاح اسی کے مال سے مہر مثل سے زیادہ مقدار دے کر کرے،یا چھوٹی بچی یا بڑی باکرہ لڑکی کی شادی اس کی اجازت کے بغیر مہر مثل سے کم میں کرے،ان صورتوں میں مقرر کردہ مہر فاسد ہوجائے گا اور مہر مثل واجب ہوگا،کیوں کہ ولی کے لیے لڑکی کے مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہے اور یہاں مفاد کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

ھ۔کوئی عقل مند عورت چاہے وہ باکرہ ہو یا ثیبہ،اپنے ولی سے کہے:مہر کے بغیر میری شادی کرادیجیے۔چناں چہ اس کا ولی اس کی شادی کرائے اور مہر کی نفی کرے،یا اس کی شادی کرائے اور مہر کے بارے میں خاموش رہے تو اس کے لیے مہر مثل واجب ہوجاتا ہے،صرف نکاح کرنے سے مہر مثل واجب نہیں ہوتا،بلکہ جماع کے بعد واجب ہوتا ہے۔

اس صورت میں عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جماع سے پہلے مہر متعین کرنے کا مطالبہ کرے اور مہر مثل متعین کرنے تک شوہر کو جماع سے باز رکھے۔

و۔شادی اور نکاح میں یہ شرط لگائی جائے کہ مہر کا ایک حصہ بیوی کے علاوہ کسی اور کے لیے ہو مثلاً اس کے بھائی یا والد کے لیے، اس صورت میں نکاح صحیح ہو جاتا ہے اور مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے۔

تنبیہ

نکاح میں تین قسم کی شرطیں ہوتی ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ شرط نکاح کے تقاضے کے مطابق ہو: مثلاً یہ شرط لگائی جائے کہ شوہر اس پر خرچ کرے گا اور اس کے لیے باری تقسیم کرے گا۔

کیوں کہ یہ شرط لغو ہے، البتہ عقدِ نکاح اور مقرر کردہ مہر صحیح ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ شرط نکاح کے تقاضے کے مخالف ہو، لیکن وہ نکاحِ اصلی یعنی جماع کے مقصود و مطلوب میں خلل ڈالنے والی نہ ہو، مثلاً عورت عقدِ نکاح میں یہ شرط لگائے کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا یا مرد عورت کے لیے یہ شرط لگائے کہ وہ اس پر خرچ نہیں کرے گا۔

اس صورت میں عقدِ نکاح صحیح ہے کیوں کہ اس کے مقصودِ اصلی میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے، اور یہ شرط فاسد ہے، اس کا اعتبار نہیں ہوگا، چاہے شرط مرد لگائے یا عورت، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ”ہر وہ شرط جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہے باطل ہے“۔(بخاری: کتاب المساجد ۴۴۴)

شرط کے فاسد ہونے کی وجہ سے مہر بھی فاسد ہوگا، کیوں کہ مہر پر رضامندی شرط کے ساتھ معلق ہے، چناں چہ جب شرط فاسد ہوگئی تو مہر بھی فاسد ہو جائے گا، کیوں کہ شرط کے مہر پر رضامندی کی نفی ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ شرط نکاح کے مقصودِ اصلی یعنی جماع میں خلل ڈالنے والی ہو، مثلاً عقد میں یہ شرط لگائی جائے کہ شوہر اس کے ساتھ جماع نہیں کرے گا یا نکاح کے بعد طلاق دے گا۔

اس صورت میں نکاح باطل ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ شرط نکاح کے مقصود کے ہی منافی ہے جس کی وجہ سے یہ نکاح ہی باطل ہو جائے گا۔

متعہ

متعہ ''متاع'' سے مشتق ہے، متعہ وہ چیز ہے جس سے لطف اٹھایا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہاں مراد وہ مال ہے جو شوہر پر طلاق یا جدائی کی وجہ سے اپنی چھوڑی ہوئی بیوی کو دینا ضروری ہے۔

متعہ کس پر واجب ہے؟

مندرجہ ذیل صورتوں میں شوہر پر بیوی کو متعہ دینا ضروری ہے:

۱۔ جب جماع کے بعد اس کو طلاق دی جائے۔

۲۔ جب جماع سے پہلے اس کو طلاق دیا جائے اور اس کے لیے نکاح میں مہر متعین نہ کیا گیا ہو۔

۳۔ جب بیوی کو چھوڑنے کا فیصلہ سنایا جائے اور یہ جدائی شوہر کی وجہ سے ہو مثلاً شوہر مرتد ہو جائے، یا وہ لعان کرے، یہ جدائی جماع کے بعد ہو یا جماع سے پہلے، لیکن شرط یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر متعین نہ کیا گیا ہو۔

جماع سے پہلے عورت کو طلاق دیا جائے اور نکاح کے وقت اس کے لیے مہر متعین کیا گیا ہو تو اس کے لیے متعہ نہیں ہے، کیوں کہ اس کو نصف مہر مل چکا ہے اور اس نے اپنے شوہر کے لیے کچھ بھی خرچ نہیں کیا ہے۔

متعہ واجب ہونے کی دلیل

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ

تَمَسُّوْهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ''(بقرہ۲۳۶)تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک تم ان سے جماع نہ کرو یا ان کے لیے مہر مقرر کرو، اور ان کو متعہ دو، مالدار پر اس کی حیثیت کے بقدر اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے بقدر بھلے طریقے پر، یہ احسان کرنے والوں پر واجب ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا یہ بھی فرمان ہے:''وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ''(بقرہ۲۴۱)اور مطلقہ عورتوں کے لیے بھلے طریقے پر متعہ ہے، یہ متقیوں پر واجب ہے۔

متعہ کی مقدار

متعہ کی مقدار متعین کرتے وقت یا تو میاں بیوی دونوں متفق ہوتے ہیں یا دونوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے۔

اگر مال کی متعین مقدار پر میاں بیوی متفق ہو جائیں چاہے وہ مال کم ہو یا زیادہ، وہ مال عورت کو دیا جائے گا اور دونوں جس پر متفق ہوئے ہیں وہ متعہ صحیح ہے۔

اگر دونوں کے درمیان مقدار میں اختلاف ہو جائے تو قاضی شوہر کی مالداری اور تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے مقدار متعین کرے گا، اس میں بیوی کے نسب اور صفات کا بھی خیال میں رکھا جائے گا، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ''(بقرہ۲۳۶)اور ان کو متعہ دو، مالدار پر اس کی حیثیت کے بقدر اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے بقدر۔

اللہ تبارک وتعالی کا یہ بھی فرمان ہے:''وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ ''(بقرہ ۲۴۱)اور مطلقہ عورتوں کے لیے بھلے طریقے پر متعہ ہے۔

لیکن متعہ میں مستحب یہ ہے کہ تیس درہم یا اس کی قیمت سے کم نہ ہو یا مہر مثل کے آدھے حصے سے کم نہ ہو۔

متعہ مشروع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ شوہر سے علیحدگی اختیار کرتے وقت مطلقہ عورت کی دل جوئی کی جائے اور اپنے شوہر کو چھوڑنے کی وجہ سے لاحق ہونے والی وحشت کو کم کیا جائے اور اس جدائی کی وجہ سے آنے والی تکلیف اور غم کی شدت کو ختم کیا جائے۔

مہر میں غلو

بہت سے لوگوں نے مہر کو عورت کی قیمت بنادیا ہے، ان کا گمان ہے کہ مہر میں اضافہ کرنے سے عورت کے خاندان کی رفعت وبلندی اور اس کے مقام ومرتبے کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، اسی وجہ سے یہ لوگ مہر کی مقدار میں بہت زیادہ اضافہ کرتے ہیں اور اس کو بڑھانے میں غلو کرتے ہیں تاکہ مخطوبہ کی قیمت کا اظہار کیا جائے، اس کے خاندان کے مقام ومرتبے کو معزز بنایا جائے اور لڑکی کو تیار کرنے اور اس کے گھر کو ساز وسامان دینے میں اس طرح کی عورتوں پر فخر کیا جائے۔

ان لوگوں کے ذہن سے یہ بات غائب ہوگئی ہے کہ مہر کا ان چیزوں سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ شادی کی سچی رغبت وخواہش کی نشانی ہے اور کریمانہ ازدواجی زندگی کی تعمیر میں عورت کی عزت وشرافت اور اس سے محبت ومودت کا عطیہ ہے۔

اسی طرح ان کے ذہنوں سے اس ظالمانہ رسم سے پیدا ہونے والے معاشرتی بگاڑ اور مفاسد اور معاشرہ کو لاحق ہونے والے نقصان، بلکہ اس ظالمانہ غلو کے نتیجے میں خود مرد اور عورت کو لاحق ہونے والے نقصانات غائب ہیں۔

ان کے ذہنوں سے یہ بات بھی غائب ہوگئی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی سنت کی مخالفت کررہے ہیں، یہ لوگ برکت کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چل رہے ہیں جو برکت مہر کی آسانی اور سادگی سے حاصل ہوتی ہے۔

مہر میں غلو کرنے سے پیدا ہونے والے معاشرتی بگاڑ بہت سے ہیں، ہم ان میں سے بعض مفاسد کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

مہر میں غلو سے نوجوان شادی سے بھاگتے ہیں خصوصاً غریب نوجوان، یہ چیز نوجوانوں

کی شادی میں رکاوٹ بنتی ہے، جس کی وجہ سے وہ شیطان کے راستے پر چلتے ہیں اور فحاشی کی پناہ لیتے ہیں، گھٹیا چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جس کی وجہ سے صلاح کے بجائے بگاڑ، طمانینت کے بجائے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں عزتیں پامال ہوجاتی ہیں، نسب خلط ملط ہوجاتا ہے اور بیماریاں عام ہوجاتی ہیں۔

اگر ان نوجوانوں کے پاس بیویاں ہوتیں تو یہ اپنے اخلاق کی حفاظت کرتے اور اپنے دین کو محفوظ رکھتے اور اپنے معاشرے کو گناہ اور فسق وفجور سے تحفظ فراہم کرتے۔

مہر میں غلو کے نتیجے میں لڑکیاں بھی بہت سی برائیوں کا شکار ہوجاتی ہیں، ہم ان میں سے بعض کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کررہے ہیں:

بہت سی عورتیں شادی کے بغیر رہتی ہیں اور وہ اپنے فطری تقاضوں سے محروم رہتی ہیں، وہ اپنی فطری خواہش کو پورا کرنے کے شوق میں جلتی رہتی ہیں اور ان کو تکلیف دہ خلا کا احساس ہونے لگتا ہے جس سے ان کی نیند اڑجاتی ہے اور وہ ایسے گھر کی مشتاق رہتی ہیں جو ان کے وسوسوں کو ختم کردے اور ان کو اطمینان وسکون کا احساس دلائے، لیکن وہ ایسا گھر نہیں پاتی ہیں کیوں کہ ان کے والدین ایسے مہر کا مطالبہ کرتے ہیں جن کو ادا کرنے سے محروم رہنے کی وجہ سے نوجوان ان کو رشتہ بھیجنے سے قاصر ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب وہ راستوں پر نہیں نکلتی ہیں اور اپنی عصمت کی حفاظت میں گھروں سے نہیں نکلتی ہیں اور اپنے فتنوں کو مردوں کے سامنے پیش نہیں کرتی ہیں اور اپنے معاشروں کو بگاڑ میں مبتلا نہیں کرتی ہیں۔

اگر وہ راستوں پر نکل آتی ہیں جیسا کہ عام طور پر ایسی عورتیں سڑکوں کی زینت بنتی ہیں تو ان کا بڑا نقصان ہوتا ہے اور اس کا ضرر عمومی اور بڑا خطرناک ہے۔

اس میں سنتِ رسول ﷺ کی مخالفت بھی ہے، چناں چہ مہر کے سلسلے میں ہم رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو سنیں:

امام احمد (٦/٨٢) نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو''۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہتر نکاح وہ ہے جو سب سے آسان ہو'' (ابو داود: النکاح ۲۱۱۷، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے)

چناں چہ جب مہر تجارت بن جائے جس کے ذریعے مالداری حاصل کی جائے اور دوست واحباب کے درمیان فخر اور کثرت ثابت کرنے کا ذریعہ بن جائے تو اس میں نہ کوئی برکت باقی رہتی ہے اور نہ کوئی خیر۔

امام بخاری (النکاح ۴۸۶۰) اور امام مسلم (النکاح ۱۴۲۷) نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر پیلے پن کا اثر دیکھا تو فرمایا: ''یہ کیا ہے؟''۔ انھوں نے کہا: میں نے کھجور کی گٹھلی کے بقدر وزن سونے کے بدلے ایک عورت سے شادی کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تم کو برکت عطا فرمائے، ولیمہ کرو چاہیے ایک بکری سے ہی کیوں نہ ہو''۔

آپ ﷺ نے ان کے حق میں برکت کی دعا دی۔ (برکت خیر کی کثرت کو کہتے ہیں) جب کہ اس میں مہر کی مقدار صرف کھجور کی ایک گٹھلی کے بقدر سونا تھا۔

مہر میں غلو کرنے والوں کو اس برکت کا کون سا حصہ ملے گا؟

ابو عوجاء سے روایت ہے کہ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: عورتوں کے مہر میں غلو مت کرو، کیوں کہ اگر یہ دنیا میں عزت یا آخرت میں تقوی ہوتا تو رسول اللہ ﷺ تمھارے مقابلے میں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہوتے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کو (۱۲) اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں دیا اور نہ کسی بیٹی کو اس سے زیادہ مہر دیا''۔ (ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے: کتاب النکاح ۱۱۱۴)

خلاصہ کلام یہ کہ مہر میں غلو کرنا شرعی حیثیت سے مکروہ ہے اور مہر میں آسانی کرنا مستحب ہے اور یہ مردوں اور عورتوں اور معاشرے کے لیے خیر وبرکت کا سبب ہے۔

عقد نکاح اور اس کے اثرات

شادی کا مطلب

لفظِ زواج کے لغوی معنی ملنے اور خلط ملط ہونے کے ہے، کہا جاتا ہے: ''زوج فلان إبله'' یعنی اونٹوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: ''زوجه النوم'' یعنی اس کو نیند آ گئی۔ اس معنی میں اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان بھی ہے: ''اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَأَزْوَاجَھُمْ'' (صافات ۲۲) ظلم کرنے والوں اور ان کے ساتھیوں کو جمع کرو۔

یہاں ازواج کے معنی قرین (ساتھی) کے ہیں۔

شریعت میں زواج ایک عقد ہے، جس سے شرعی طور پر میاں بیوی کو ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونا جائز ہو جاتا ہے۔

شادی کی قسمیں

شادی کی دو قسمیں ہیں: باطل شادی اور صحیح شادی۔

باطل شادی وہ ہے جس میں نکاح کے ارکان میں سے کوئی رکن یا اس کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے۔

اس شادی کا حکم یہ ہے کہ اس صورت میں لطف اندوزی حرام ہے اور اس پر شادی کا کوئی بھی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے، البتہ نکاح باطل ہونے کی بعض صورتوں میں مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص ولی کے بغیر شادی کرے اور اس کے ساتھ جماع کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: 'جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے''۔ (آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی، اگر وہ اس

کے ساتھ جماع کرے تو اس کی شرمگاہ کو حلال کرنے کی وجہ سے اس کے لیے مہر مثل ہے"۔
(ترمذی: کتاب النکاح ۱۱۰۲)

صحیح نکاح وہ ہے جس میں تمام ارکان اور نکاح صحیح ہونے کی تمام شرطیں پائی جائیں، صحیح نکاح کی صورت میں مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

عقدِ نکاح کے احکام

عقدِ نکاح کے بہت سے احکام ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ نکاح اور اس کے ارکان کے تذکرہ میں ہو چکا ہے۔

صحیح عقدِ نکاح کی صورت میں واجب ہونے والے حقوق اور ذمے داریاں

جب عقدِ نکاح صحیح ہو جائے تو اس صورت میں بہت سے حقوق اور ذمے داریاں بیوی اور شوہر دونوں پر واجب ہو جاتے ہیں۔

ہر ایک کے چند حقوق اور چند ذمے داریاں ہیں جن کو موقع بموقع بیان کیا جائے گا۔

ہم یہاں صرف ان حقوق وواجبات کو دلیل کے ساتھ شمار کر رہے ہیں اور ان کی تفصیلات ان کے مواقع پر پیش کی جائیں گی۔

یہ حقوق وواجبات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔میاں بیوی کو ایک دوسرے سے شرعی طور پر لطف اندوز ہونا جائز ہو جاتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ" (بقرہ ۲۲۳) تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتیاں ہیں پس اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہے جاؤ۔

۲۔بیوی کے لیے اپنے شوہر کے حکم کی بجا آوری، اطاعت، اپنے جسم پر قابو دینا اور اس کے گھر کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

امام مسلم (کتاب النکاح ۱۴۳۶) اور امام بخاری (کتاب النکاح ۴۸۹۷) نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب عورت اپنے شوہر کے بستر کو چھوڑ دیتی ہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں"۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: ''اور تمھارے لیے ان (عورتوں) پر ضروری ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ بٹھائے جس کو تم ناپسند کرتے ہو''۔ (مسلم: کتاب الحج ۱۲۱۸)

۳۔مہر: یہ شوہر پر عورت کا حق ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**وآتوا النساء صدقاتهن نحلة**'' (نساء ۴) اور عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے دو۔

۴۔نفقہ: مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ بیوی کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''**وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** '' (بقرہ ۲۳۳) اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا یہ بھی ارشاد ہے: ''**أَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ**'' (طلاق ۶) عورتوں کو وہاں رکھو جہاں تم رہتے ہو اپنی طاقت بھر، اور ان کو نقصان نہ پہنچاؤ کہ ان پر تنگی کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''ان عورتوں کے لیے تم پر ان کا رزق اور لباس بھلائی کے ساتھ ضروری ہے'' (مسلم ۱۲۱۸) نفقہ میں کھانا پینا، لباس اور گھر شامل ہے۔اس کی تفصیل انشاءاللہ آئے گی۔

۵۔بیویوں کے درمیان تقسیم: اگر کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے مساوات اور برابری کرنا ضروری ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب مرد کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا پہلو گرا ہوا ہوگا'' (ترمذی: النکاح ۱۱۴۱، ابن ماجہ: النکاح ۱۹۶۹، ابوداود: النکاح ۲۱۳۳، ابوہریرہ سے یہ روایت ہے)

امام ترمذی (النکاح ۱۱۴۰) اور امام ابوداود (النکاح ۲۱۳۴) وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم کرتے تو انصاف کرتے اور فرماتے: ''اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے ان چیزوں میں جس کا میں مالک

ہوں پس تو اس میں میری ملامت نہ فرما جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں"۔
یعنی رات گزارنے اور نفقہ دینے میں یہ میری تقسیم ہے، پس تو اس میں ملامت نہ فرما جس کا تو مالک ہے اور میں اس کا مالک نہیں ہوں یعنی محبت ومودت میں۔

۶۔نسب: اپنی بیوی سے جماع کے بعد اولاد کا نسب والد سے ثابت ہو جاتا ہے، جب بیوی کو حمل کی مشہور مدت کے درمیان بچے ہوں، حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ چار سال ہے، اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں، چناں چہ صحیح نکاح میں بیوی کی اولاد کا نسب اس کے شوہر کی طرف کیا جائے گا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "بچہ بستر والے کا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہے"۔ (مسلم: الرضاع ۱۴۵۷)

۷۔میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:
"وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّاتَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ" (نساء ۱۲) اور تمھارے لیے نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑے اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، پس اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے ایک چوتھائی ہے اس میں سے جو انھوں چھوڑا ہے، وصیت کے پورا کرنے کے بعد جو انھوں نے کی ہے یا قرض ادا کرنے کے بعد، اور ان کے لیے تمھارے چھوڑے ہوئے میں سے ایک چوتھائی ہے اگر تمھاری کوئی اولاد نہ ہو، پس اگر تمھاری اولاد ہو تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم نے چھوڑا ہے، وصیت کے بعد جو تم نے کی ہے یا قرض کے بعد۔

عقدِ نکاح کی سنتیں

عقدِ نکاح کی بہت سی سنتیں ہیں جن کو بروے کار لانا اس عقد کی عظمت اور اس کے اظہار کے لیے مسنون ہے:

نکاح کی سنتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔عقد زواج سے تھوڑی دیر قبل خطبہ دینا: یہ خطبہ شوہر یا اس کے نائب کی طرف سے دینا مستحب ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نکاح وغیرہ کے لیے خطبہ دینا چاہے تو کہے......"۔ خطبہ یعنی لڑکی کو پیغام دینے کے باب میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

۲۔میاں بیوی کے لیے دعا کرنا: شادی کے وقت میاں بیوی کے لیے دعا کرنا سنت ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کو شادی پر مل جل کر رہنے کی دعا دیتے تو فرماتے: "بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ وَبَارَکَ عَلَیْکَ وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِي الْخَیْرِ" (ترمذی: النکاح ۱۰۹۱، ابوداود: النکاح: ۱۹۰۵)

۳۔نکاح کا اعلان کرنا اور دف بجا کر اس پر خوشی کا اظہار کرنا:

شادی کا اعلان کرنا اور لوگوں کو جمع کرنا مستحب ہے اور اس کو پوشیدہ رکھنا مکروہ ہے۔

اسی طرح خوشی کا اظہار کرنا، دف بجانا اور بہترین معانی پر مشتمل گیت گانا بھی مستحب ہے۔

ابن ماجہ (النکاح ۱۸۹۵) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس نکاح کا اعلان کرو اور اس موقع پر دف بجاؤ"۔

آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے: "اس نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مسجدوں میں کرو اور اس موقع پر دف بجاؤ"۔ (ترمذی: النکاح ۱۰۸۹)

اسی طرح خوش ہونا اور فرحت وشادمانی کا اظہار کرنا اور شریفانہ کھیل کا انعقاد کرنا مستحب ہے۔

امام بخاری (النکاح ۴۸۶۷) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت کی شادی انصار کے ایک شخص سے ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "عائشہ! تمھارے ساتھ کیا کھیل ہے، کیوں کہ انصار کو کھیل پسند ہے"۔

فحش گوئی پر مشتمل گانے گانا اور فسق وفجور، خوبصورتی اور فتنوں کی چیزوں کا اظہار،

شہوتوں کو بھڑ کانا وغیرہ فحش چیزیں بلا شک وشبہ ان موقعوں پر حرام ہیں۔

۴۔بیوی کے پاس جاتے وقت دعا کرنا: بیوی کے پاس جاتے وقت اور جماع کا ارادہ کرتے وقت یہ دعا کرنا مستحب ہے: **بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَارَزَقْتَنَا** ۔اللہ کے نام سے شروع، اے اللہ! ہم کو شیطان سے دور رکھ اور جو تو نے ہم کو عطا کیا ہے اس کو شیطان سے دور رکھ۔

امام بخاری (الوضوء ۱۴۱) اور امام مسلم (النکاح ۱۴۳۴) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو کہے: **بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَارَزَقْتَنَا** ۔اگر اس جماع میں ان کے لیے بچہ مقدر ہوگا تو اس کو شیطان ہرگز نقصان نہیں پہنچائے گا“۔

۵۔ولیمہ: مستحب ہے:

ولیمہ کے معنی: ولیمہ ”ولم“ سے مشتق ہے، اس کے معنی اجتماع کے ہے، اس کو ولیمہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی اس موقع پر جمع ہوتے ہیں۔

القاموس میں لکھا ہے: ولیمہ شادی کا کھانا ہے یا ہر وہ کھانا ہے جو دعوت وغیرہ کے لیے پکایا جائے۔

ولیمہ کا حکم: ولیمہ شوہر کے لیے سنت موکدہ ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل سے یہ ثابت ہے۔

امام بخاری (النکاح ۴۸۷۷) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک بیوی کا ولیمہ دو مد جو سے کیا۔

امام ترمذی (النکاح ۱۰۹۵) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صفیہ بنت حیی کا ولیمہ سویق اور کھجور سے کیا۔ (ابوداود: الاطعمۃ ۳۷۴۴، ابن ماجہ: النکاح ۱۹۰۹ نے بھی یہ روایت کی ہے)

امام مسلم (النکاح ۱۴۲۸) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کا ولیمہ گوشت اور روٹی سے کیا۔ اور آپ ﷺ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "ولیمہ کرو چاہے ایک بکری سے ہی کیوں نہ ہو" (بخاری: النکاح ۴۸۷۲، مسلم: النکاح ۱۴۲۷)

علماء نے آپ ﷺ کے قول وعمل کو سنت پر محمول کیا ہے۔

ولیمہ کی مقدار: مالدار کے لیے کم سے کم ولیمہ ایک بکری ہے اور زیادہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے اور غیر مالدار کے لیے جو بھی کھانا میسر آئے۔

ولیمہ کا وقت: ولیمہ کا وقت شادی کے وقت سے جماع کے بعد تک ہے، البتہ جماع کے بعد ولیمہ کرنا افضل ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کا ولیمہ جماع کے بعد ہی کیا ہے، آپ ﷺ کی بیویوں کے سلسلے میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ جماع کیا پھر قوم کو دعوت دی۔ (بخاری: النکاح، باب الولیمۃ، مسلم: کتاب النکاح، باب فضیلۃ إعتاق أمۃ ثم یتزوجھا)

ولیمہ مشروع کرنے کی حکمت

ولیمہ کو شرعی حیثیت دینے کی وجہ شادی کی توفیق دینے پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کرنا اور لوگوں کو شادی میں جمع کرنا ہے، کیوں کہ اس طرح کے اجتماع سے آپس میں محبت والفت پروان چڑھتی ہے اور شادی علانیہ طور پر ہوتی ہے تاکہ شرعی نکاح اور ممنوع زنا کے درمیان فرق ہو جائے۔

ولیمہ کی دعوت قبول کرنے کا حکم

ولیمہ کی دعوت قبول کرنا ہر مدعو کے لیے فرض ہے، اس کی دلیل امام بخاری (النکاح ۴۸۷۸) اور امام مسلم (النکاح ۱۴۲۹) کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کسی کو ولیمہ کے لیے بلایا جائے تو وہ دعوت میں شریک ہو"۔

مسلم کی دوسری روایت (النکاح ۱۴۳۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے: "جس نے دعوت قبول نہیں کی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی"۔

دعوت ولیمہ قبول کرنا واجب ہونے کی شرائطیں

علماء نے دعوت ولیمہ قبول کرنا واجب ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں رکھی ہیں:

۱۔ دعوت صرف مالداروں کے ساتھ مخصوص نہ ہو، اگر دعوت صرف مالداروں کے لیے ہو تو یہ دعوت قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

امام مسلم (النکاح ۱۴۳۲) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے: ''ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے جس میں مالداروں کو بلایا جائے اور مسکینوں کو نہ بلایا جائے، پس جس نے دعوت میں شرکت نہیں کی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی''۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس بات کی خبر دینا مقصود ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد لوگ ولیمہ میں صرف مالداروں کی رعایت رکھنے اور ان کو مخصوص طور پر دعوت دینے کی برائی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بہترین کھانوں میں ان کو ترجیح دینے میں پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ داعی اور مدعو دونوں مسلمان ہوں، اگر دونوں میں سے کوئی غیر مسلم ہو تو دعوت قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

۳۔ پہلے دن کی دعوت میں شریک ہونے کے لیے مدعو کرے جب ولیمہ ایک سے زیادہ دن کیا جا رہا ہو، اگر اس کو دوسرے دن بلایا جائے تو دعوت قبول کرنا مستحب ہے، اگر تیسرے دن بلایا جائے تو قبول کرنا مکروہ ہے۔

امام ترمذی (النکاح ۱۰۹۷) نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے دن کا کھانا حق ہے، دوسرے دن کا کھانا سنت ہے اور تیسرے دن کا کھانا شہرت ہے، اور جو شہرت کرتا ہے تو اللہ اس کو مشہور کر دیتا ہے'' یعنی فخر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا چرچا ہو۔

امام احمد (۵/۲۸) وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے دن کا ولیمہ حق ہے اور دوسرے دن کا معروف ہے اور تیسرے دن کا ریاکاری اور شہرت ہے''۔

۴۔محبت اور قربت کی بنیاد پر اس کو بلائے، اگر اس سے خوف اور منصب کی طمع میں بلائے تو یہ دعوت قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔

۵۔دعوت دینے والا ظالم، فتنہ پرور یا حرام مال کمانے والا نہ ہو، ان صورتوں میں دعوت قبول کرنا واجب نہیں ہے۔

۶۔دعوت کی جگہ کوئی منکر اور برائی نہ ہو مثلاً شراب، عورتوں اور مردوں کا اختلاط، انسان یا جاندار کی تصاویر دیواروں پر لٹکی ہوئی نہ ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو وہ ایسے دستر خوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب پیش کی جارہی ہو'' (حاکم نے یہ روایت کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے: مستدرک حاکم ۴/۲۸۸)

اگر اس کے جانے سے منکر اور برائی ختم ہو جاتی ہو تو اس کا جانا، دعوت قبول کرنا اور منکر کو ختم کرنا ضروری ہے۔

دعوت ولیمہ میں کھانے کا حکم

دعوت قبول کرنے والے کے لیے ولیمہ میں سے کھانا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف حاضر ہونا واجب ہے، پھر اگر وہ چاہے تو کھائے، چاہے تو نہ کھائے۔

امام مسلم (النکاح ۱۴۳۰) نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کرے، اگر چاہے تو کھائے، چاہے تو نہ کھائے''۔

ایک قول یہ ہے کہ روزے سے نہ ہو تو کھانا ضروری ہے۔

امام مسلم (النکاح ۱۴۳۱) کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو دعوت دی جائے تو قبول کرے، اگر وہ روزے سے ہو تو مغفرت اور برکت کی دعا دے، اگر روزے سے نہ ہو تو کھائے''۔

دعوت قبول کرنے والے کے لیے پیش کی ہوئی چیز کھانا مستحب ہے، اور کھانے کے

علاوہ دوسرا تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر صاحبِ مکان اور داعی کی رضامندی کا علم ہو تو ساتھ لینا بھی جائز ہے۔

شکر، اخروٹ، بادام اور روپے وغیرہ نکاح میں پھیلانا جائز ہے اور اس کو اٹھانا بھی حلال ہے، البتہ اس کو نہ اٹھانا افضل ہے۔

بیویوں کے درمیان عادلانہ تقسیم

تقسیم کی تعریف

فقہی اصطلاح میں تقسیم یہ ہے کہ جس کی ایک سے زیادہ بیوی ہو اور ان میں سے کسی کے پاس رات گزارے تو باقی بیویوں کے پاس بھی رات گزارنا واجب ہے۔

بیویوں کے درمیان تقسیم کے احکام ومسائل

ابتدا ہی سے بیویوں کے درمیان تقسیم کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، چناں چہ جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے لیے تقسیم کرنا، ان کے پاس رات گزارنا اور ان کو معطل بنا کر نہ چھوڑنا مستحب ہے، یہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ رات گزارنے کا حق مرد کا ہے جس کو وہ چھوڑ بھی سکتا ہے، البتہ قرعہ یا بغیر قرعہ کے کسی ایک کے پاس رات گزارے تو باقی بیویوں کے پاس بھی رات گزارنا واجب ہے، اور ان کے درمیان انصاف کرنے کے لیے تقسیم کرنا ضروری ہے۔

تقسیم وغیرہ میں بیویوں کے درمیان انصاف کرنا واجب ہونے کی دلیل

اللہ عز وجل کا فرمان ہے: "فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ" (نساء ۳) یعنی اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم راتوں کی تقسیم اور خرچ کرنے میں انصاف نہیں کر سکتے ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا اپنی باندیوں پر۔

آیت سے بیویوں کے درمیان راتوں کی تقسیم میں انصاف کے واجب ہونے کی دلیل ملتی ہے۔

امام ابو داود (۲۱۳۳) اور امام ترمذی (۱۱۴۱) وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف

مائل ہو (ترمذی کی روایت میں ہے: ان دونوں کے درمیان انصاف نہ کرے) تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک بازو گرا ہوا ہوگا"۔ یہ واجب چھوڑنے کی سزا ہے۔

امام ابوداود (۲۱۳۴) اور امام ترمذی (۱۱۴۰) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: رسول اللہ ﷺ تقسیم کرتے تو انصاف کرتے اور فرماتے: "اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے میری ملک میں موجود امور میں، پس تو میری اس بارے میں ملامت نہ فرما جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں"۔

تقسیم کی مستحق کون ہے؟

تقسیم ان بیویوں کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنے شوہر کی فرماں بردار ہوں، چاہے ان میں سے کوئی بیمار ہو یا حائضہ ہو یا حالتِ نفاس میں ہو۔

اگر عورت نافرمان ہو تو وہ تقسیم کی حق دار نہیں بنتی ہے کیوں کہ نافرمانی سے اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے، نافرمانی کی تفصیلات اور احکام اگلے صفحات میں آرہے ہیں۔

بیویوں کے درمیان تقسیم کی کیفیت

شوہر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ہر بیوی کے لیے ایک رات اور اس سے پہلے یا بعد کا دن متعین کرے، اصل رات ہے اور دن اس کے تابع، البتہ اگر شوہر رات کو کام کرتا ہو مثلاً چوکیدار ہو تو اس کے لیے دن اصل ہے اور رات اس کے تابع۔

اگر شوہر کسی گھر میں تنہا رہتا ہو تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کو اس کی باری کے دن اپنے گھر بلائے۔

افضل یہ ہے کہ مرد اپنی بیویوں کے گھر جائے۔

اگر کسی ایک بیوی کے پاس رات گزارے تو ہر بیوی کے پاس اس کی باری کے دن اس کے گھر جانا شوہر کے لیے ضروری ہے۔

کسی ایک بیوی کے گھر میں رات گزارے تو باقی بیویوں کو اس بیوی کے گھر بلانا حرام ہے کیوں کہ عورت سوکن کے گھر جانے سے تکلیف محسوس کرتی ہے اور اس پر یہ بات

شاق ہوتی ہے۔

اسی طرح ان سبھوں کو ایک ہی گھر میں ان کی اجازت کے بغیر رکھنا بھی حرام ہے، کیوں کہ اس سے ان کے درمیان دشمنی پیدا ہوسکتی ہے۔

تقسیم کی مدت دو یا تین دن رکھنا بھی جائز ہے۔

اس سے زیادہ مدت رکھنا حرام ہے، کیوں کہ زیادہ مدت سے عورتوں کو وحشت ہوتی ہے، کسی ایک کے پاس رات گزارنا ہو تو قرعہ نکال کر ابتدا کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے اجتناب ہوتا ہے، پھر باقی بیویوں کے درمیان قرعہ نکالے گا۔

جس کی باری نہ ہو اس کے گھر دن کے وقت جانا جائز ہے، البتہ زیادہ دیر نہ رکنا ضروری ہے۔

امام ابوداود (النکاح ٢١٣٥) اور امام حاکم (النکاح ٢/١٨٦، انھوں نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہت کم ایسا کرتے کہ ہم سبھوں کے پاس نہ آئے ہوں، چناں چہ آپ ہر بیوی سے قریب ہوتے، البتہ جماع نہیں کرتے، یہاں تک کہ اس کے پاس پہنچ جاتے جس کی باری ہوتی تو اس کے پاس رات گزارتے۔

کسی ضرورت کے بغیر رات کے وقت اس بیوی کے پاس جانا جائز نہیں ہے جس کی باری نہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ مثلاً بیوی کو خطرناک بیماری لاحق ہو، آگ لگی ہو، اس طرح کی دوسری بڑی ضرورتیں۔

نئی بیوی باکرہ ہو تو اس کے لیے مسلسل سات راتوں کو مخصوص کرنا واجب ہے۔

اگر نئی بیوی ثیبہ ہو تو مسلسل تین راتیں اس کے لیے مخصوص کرنا ضروری ہے۔

امام بخاری (النکاح ٤٩١٦) اور امام مسلم (الرضاع: ١٤٦١) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: جب ثیبہ کی موجودگی میں باکرہ لڑکی سے شادی کرے تو سنت یہ ہے کہ اس کے پاس سات دن رہے پھر باری مقرر کرے، اگر ثیبہ کے ساتھ شادی کرے تو اس کے پاس تین دن رہے پھر باری شروع کرے۔ اس حدیث کے

ایک راوی ابو قلابہ کہتے ہیں: اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ انس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

امام مسلم (الرضاع ۱۴۶۰) نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "باکرہ کے لیے سات دن اور ثیبہ کے لیے تین دن"۔

اگر کوئی بیوی اپنی رات اپنی سوکن کو ہبہ کر دے تو جس کے لیے ہبہ کیا ہے اس کے پاس دو راتیں گزارے گا، ایک رات خود اس کی باری کی اور دوسری رات ہبہ کرنے والی بیوی کی باری کی رات، دونوں رات ان کی باری کے دنوں میں ہی گزارے گا، اگر دونوں راتیں مسلسل ہوں تو ایک ساتھ دو راتیں گزارے گا، اگر دونوں راتیں الگ الگ ہوں تو الگ الگ گزارے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کیا جب سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی۔

امام بخاری (النکاح ۴۹۱۴) اور امام مسلم (الرضاع ۱۴۶۳، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے سودہ بن زمعہ کے علاوہ کسی عورت کو نہیں دیکھا کہ میرے نزدیک یہ بات پسندیدہ ہو کہ میں اس کی طرح بن جاؤں، اس میں تختی ہے۔ انھوں نے کہا: جب وہ بوڑھی ہوگئی تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی باری عائشہ کو ہدیہ میں دے دی۔ اس نے کہا: اللہ کے رسول! میں نے اپنا دن عائشہ کو دے دیا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ عائشہ کے پاس دو دن گزارتے تھے، ایک اسی کا دن اور ایک سودہ کا دن۔

جب سفر کا ارادہ کرے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ نکالے، جس کے نام قرعہ نکلے اس کو ساتھ لے جائے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا یہی معمول تھا۔

امام بخاری (المغازی ۳۹۱۰) اور امام مسلم (التوبۃ ۲۷۷۰) نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ نکالتے، جس کے نام قرعہ نکلتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

بیوی کی نافرمانی کے احکام ومسائل

لفظ ''نشوز'' کی تعریف

''نشوز'' نافرمانی کو کہتے ہیں، یہ ''النشز'' سے ماخوذ ہے۔

عورت کا نشوز یہ ہے کہ اپنے شوہر کی نافرمانی کرے اور اللہ نے شوہر کی جس میں اطاعت واجب کی ہے اس سے خود کو بلند تصور کرے۔

ابن فارس کہتے ہیں: ''نشزت المرأة ''عورت نے اپنے شوہر کی نافرمانی کی۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ''وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ'' (نساء ٣٤) اور جن کی تم نافرمانی کا اندیشہ کرتے ہو۔

نافرمانی کا حکم

عورت کے لیے اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب مرد اپنی بیوی کو بستر پر بلائے اور وہ نہ آئے، جس کی وجہ سے مرد ناراض ہو کر رات گزارے تو صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے ہیں'' (امام بخاری اور امام مسلم نے ابوہریرہ سے یہ روایت کی ہے)

مسلم کی روایت میں ہے: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! جو بھی مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلاتا ہے اور وہ انکار کرتی ہے تو آسمان والا اس سے ناراض رہتا ہے یہاں تک کہ شوہر اس سے راضی ہو جاتا ہے''۔ (بخاری: النکاح، باب: إذا باتت المرأة مھاجرة فراش زوجھا۔ مسلم: النکاح: باب تحریم امتناعھا عن فراش زوجھا)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے!

عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے" (احمد ۳۸۱/۴، ابن ماجہ: النکاح ۱۸۵۳)

عورت نافرمان کب کہلاتی ہے؟

جب عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہیں کرتی اور اس کی بات نہیں مانتی تو وہ نافرمان ہو جاتی ہے، مثلاً عورت شوہر کے گھر سے کسی ضرورت کے بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلے یا اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر سفر کرے، یا اس کو اندر آنے کے لیے دروازہ نہ کھولے یا کسی عذر مثلاً بیماری کے بغیر جماع کرنے سے روکے یا شوہر اس کو بلائے تو اپنی دوسری ضرورتوں میں مشغول ہو جائے وغیرہ۔

نافرمانی کا علاج

اگر عورت سے نافرمانی کی علامتیں ظاہر ہو جائیں مثلاً نرمی کے بجائے سختی یا ہنسی خوشی کے بعد اعراض اور منہ بسورنے جیسی عادتوں سے واسطہ پڑے یا اس کی عادت کے برخلاف سخت کلامی سنے تو شوہر کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ اللہ عزوجل کی کتاب قرآن کریم کے ذریعے اس کو نصیحت کرے اور عورت کے لیے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ذمے داریوں، بہترین معاشرت، بہترین سلوک اور شوہر کے لیے اسلام کی طرف سے عطا کردہ مقام کو یاد دلائے، اللہ تعالی کے غضب اور سزا سے چوکنا کرے، یہ بتانا مستحب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس کسی عورت کا اس حال میں انتقال ہو جائے کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گی"۔ (ترمذی: الرضاع ۱۱۶۱، ابن ماجہ: النکاح ۱۸۵۴)

بیوی سے یہ بھی کہے: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: 'جب عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ ہو کر رات گزارتی ہے تو فرشتے صبح تک اس پر لعنت کرتے ہیں"۔ (بخاری: النکاح، باب **إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها**، مسلم: النکاح، باب **تحريم امتناعها من فراش زوجها**) اگر وہ سدھر جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔

اگر اس کی نافرمانی ثابت ہو جائے اور وہ اعراض پر مصر رہے تو بستر پر اس کے ساتھ

سونا چھوڑ دے، کیوں کہ بستر چھوڑنا عورت کو ادب سکھانے میں بڑا موثر ہے۔

اگر اس صورت میں وہ سدھر جائے تو بہتر ہے، اگر وہ نافرمانی کرنے پر مصر رہے تو ہلکی مار مارے کہ اس پر مارنے کا کوئی ظاہری اثر نہ ہو، نہ ہڈی ٹوٹے، چہرے پر نہ مارے اور ایسی جگہ نہ مارے جس سے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو۔

اسی صورت میں مارے جب اس کے ذریعے عورت کے سدھرنے کی امید ہو اور اس کو غالب گمان ہو کہ مارنے سے وہ سیدھی ہو جائے گی۔

ان تمام احکام و مسائل کی دلیل تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''**وَاللَّاتِي تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا**'' (نساء ۳۴) اور جن کی نافرمانی کا تم کو خوف ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو بستروں سے الگ کرو اور ان کو مارو، پس اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ بہت بلند اور بڑا ہے۔

اگر اختلاف گہرا ہو جائے اور شوہر و بیوی خود سے اس کو حل کرنے سے قاصر ہوں اور معاملہ حاکم کے پاس پیش ہو تو حاکم کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کے لیے دو عادل اور اصلاح کے طریقوں کو جاننے والے مسلمان حکم متعین کرے۔

مستحب یہ ہے کہ ایک حکم شوہر کے گھر سے تعلق رکھتا ہو اور دوسرا بیوی کے گھر سے۔

یہ دو حکم میاں بیوی کے وکیل ہوں گے، چناں چہ دونوں کا اپنے وکیل پر راضی ہونا ضروری ہے، دونوں حکم میاں بیوی کے درمیان صلح کے کام کی شروعات کریں اور دونوں کے درمیان صلح کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں، اگر صلح کرانے میں کامیاب ہو جائیں تو اچھی بات ہے، اگر ناکام ہو جائیں تو شوہر اپنے حکم کو بیوی کو طلاق دینے یا اس کی طرف سے خلع دینے کی صورت میں عوض قبول کرنے کا وکیل بنائے۔

بیوی اپنے حکم کو عوض دینے اور اس کی طرف سے طلاق قبول کرنے کا وکیل بنائے۔

اگر دونوں حکم جدائی اور تفریق کو صحیح سمجھیں تو میاں بیوی کے درمیان جدائی کرائی جائے۔

اگر دونوں حکم کے درمیان اختلاف ہو جائے اور کسی ایک فیصلہ پر نہ پہنچیں تو قاضی ان کے علاوہ دو حکم روانہ کرے گا، یہاں تک کہ دونوں ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں، اگر میاں بیوی حکم بھیجنے پر راضی نہ ہوں اور دونوں کسی چیز پر متفق بھی نہ ہوں تو قاضی ان دونوں میں سے ظالم کو ادب سکھائے گا اور مظلوم کو اس کا حق دلائے گا، اور دونوں حکم کی گواہی پر عمل کرے گا، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا" (نساء ۳۴) اور اگر تم کو ان (میاں بیوی) کے درمیان جدائی کا اندیشہ ہو تو اس (شوہر) کے گھر والوں میں سے کسی حکم اور اس (بیوی) کے گھر والوں میں سے کسی حکم کو بھیجو، اگر وہ اصلاح چاہتے ہیں تو اللہ ان میں میل کر دے گا، بے شک اللہ بڑے علم والا باخبر ہے۔

اگر شوہر کی طرف سے اعراض اور حکم الہی کی نافرمانی ہو؛ مثلاً وہ تقسیم میں بیوی کا حق نہ دے یا نفقہ نہ دے یا سخت کلامی کرے یا برا سلوک کرے تو عورت اس کو وعظ ونصیحت کرے اور اپنا حق یاد دلائے، مثلاً اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا" (نساء ۱۹) اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو، پس اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو شاید تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت سا خیر رکھ دے۔

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کو یاد دلائے: "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم میں اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے اور میں تم میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں"۔ (ترمذی: المناقب ۳۸۹۲) یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی یاد دلائے: "عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو" (بخاری: النکاح ۴۸۹۰، مسلم: الرضاع ۱۴۶۸) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے۔

عورت اپنے شوہر کو ظلم کے نتائج سے چوکنا کرے، اگر وہ سدھر جائے تو بڑی اچھی بات ہے، اگر نہ سدھرے تو بیوی یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کرے تا کہ قاضی اس کا حق

دلائے، کیوں کہ قاضی حقوق کو ان کے حق داروں تک پہنچانے کا ذمے دار ہے اور وہ خود سے اپنا حق نہیں لے سکتی ہے۔

قاضی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر پر باری کی تقسیم،اس کے حقوق کی ادائیگی اور اس پر ظلم کرنے سے باز رہنا ضروری قرار دے۔

اگر اس کے اخلاق برے ہوں اور وہ بیوی کو مار کر تکلیف دیتا ہوں یا کسی سبب کے بغیر گالی دیتا ہو تو قاضی شوہر کو اس سے منع کرے گا،اگر دوبارہ یہی حرکت کرے اور بیوی قاضی سے اس کی تعزیر (سزا دینے) کا مطالبہ کرے تو قاضی جس طرح مناسب سمجھے گا اس کی تعزیر کرے گا۔

اگر دونوں کے درمیان اختلاف بڑھ جائے تو قاضی دو حکم روانہ کرے گا تا کہ ان دونوں کے درمیان صلح کرائی جائے یا صلح ممکن نہ ہو تو طلاق کے ذریعے ان کے درمیان تفریق کرائی جائے،اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:''وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ''(نساء۱۲۷)اورعورت کو اپنے شوہر سے نافرمانی یا اعراض کا خوف ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کریں اور صلح بہتر ہے۔

کن عیوب سے نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے؟

۱۔عیوب

جن عیوب سے نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم ان عیوب کی ہے جو جماع میں رکاوٹ بنتے ہیں مثلاً شوہر میں نامردی اور عضو تناسل کا کٹا ہونا، اور عورت کی شرمگاہ میں ہڈی یا گوشت کا پایا جانا۔

دوسری قسم ان عیوب کی ہے جو جماع میں رکاوٹ نہیں بنتے ہیں، لیکن یہ نفرت اور گھن پیدا کرنے والی بیماریاں ہیں یا نقصان دہ امراض ہیں، جن کی موجودگی میں نقصان اور ضرر کا امکان ہوتا ہے، مثلاً جذام، برص اور پاگل پن۔

جذام ایک بیماری ہے جس میں جسمانی عضو لال ہو جاتا ہے پھر کالا پڑ جاتا ہے پھر کٹ کر گر جاتا ہے، برص بھی ایک بیماری ہے جس میں عضو بہت ہی زیادہ سفید ہو جاتا ہے جس سے چمڑے پر گھٹے پڑتے ہیں اور اس کا خون ختم ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی کی طرف نسبت کے اعتبار سے ان عیوب کی قسمیں

میاں بیوی کی طرف نسبت کے اعتبار سے ان عیوب کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ جو میاں بیوی کے درمیان مشترک ہوتے ہیں، وہ جذام، برص اور جنون ہے۔

۲۔ جو بیوی کے ساتھ خاص ہے، مثلاً شرمگاہ میں ہڈی یا گوشت کا پایا جانا۔

۳۔ جو شوہر کے ساتھ مخصوص ہے مثلاً نامردی یا عضو تناسل کا کٹا ہونا۔

مشترکہ عیوب

اگر میاں بیوی میں سے کسی کو پاگل پن، جذام (کوڑھ) یا برص کی بیماری ہو تو

دوسرے کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار رہے، چاہے وہی بیماری یا ان میں سے کوئی دوسری بیماری اس میں بھی پائی جائے، کیوں کہ انسان دوسرے میں یہ بیماری دیکھتا ہے تو گھن کرتا ہے، جب کہ وہی بیماری اس میں ہو تو اس کو محسوس نہیں کرتا ہے۔

ان عیوب کی موجودگی میں فسخِ نکاح کی دلیل

امام بیہقی (۲۱۴/۷) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے بنوغفار کی ایک عورت سے شادی کی، جب اس کو آپ کے پاس داخل کیا گیا تو آپ نے اس کے پہلو پر سفیدی (برص) کو دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے کپڑے پہنو اور اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ"۔ اور اس سے گھر والوں سے فرمایا: "تم نے مجھ سے عیب کو چھپایا"۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے جذام، برص اور جنون کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان تفریق کرائی۔

صحیح حدیث سے حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ثابت ہے: "کوڑی والے سے اس طرح بھاگو جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو" (بخاری: الطب ۵۳۸۰)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الام" میں تحریر کیا ہے: جہاں تک جذام اور برص کا تعلق ہے تو یہ دونوں متعدی امراض ہیں، اور کسی کا دل اس پر راضی نہیں ہوتا کہ وہ اس شخص سے جماع کرے جس میں یہ بیماری ہو۔

عورت میں پائے جانے والے عیوب

جب شوہر اپنی بیوی کی شرمگاہ میں گوشت یا ہڈی پائے تو اس کو شادی فسخ کرنے کا اختیار رہے، کیوں کہ یہ بیماری نکاح کے مقصد میں ہی رکاوٹ ہے یعنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا نکاح کا مقصدِ اصلی ہے۔

شوہر میں پائے جانے والے عیوب

اگر بیوی اپنے شوہر کی شرمگاہ کو کٹا ہوا پائے یا وہ نامرد ہو تو اس کو شادی فسخ کرنے کا

حق حاصل ہے۔

ماوردی نے بیان کیا ہے کہ نامردی اور عضو تناسل کے کٹے رہنے کی صورت میں عورت کو فسخ کا اختیار ہونے پر اجماع ہے، کیوں کہ ان بیماریوں سے نکاح کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، جیسا کہ عورت کی شرمگاہ میں ہڈی یا گوشت پائے جانے کی صورت میں ہے۔

عقدِ نکاح کے بعد عیب پیدا ہوجائے

اگر میاں اور بیوی میں سے کسی میں عقدِ نکاح کے بعد سابقہ عیوب اور امراض میں سے کوئی عیب یا مرض پیدا ہوجائے چاہے جماع کے بعد ہو یا جماع سے پہلے، چاہے یہ عیب جماع میں رکاوٹ بنتا ہو مثلاً شوہر نامرد ہو یا اس کا عضو کٹا ہوا ہو، یا بیوی کی شرمگاہ میں ہڈی یا گوشت ہو، یا جماع میں رکاوٹ نہ بنتا ہو مثلاً جذام، برص یا جنون ہو تو ان صورتوں میں بھی نکاح فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے، جس طرح عیب پہلے ہی سے پائے جانے کی صورت میں اختیار حاصل ہوتا ہے۔

لیکن ان میں صرف نامردی مستثنیٰ ہے، اگر نامردی جماع کے بعد پیدا ہو تو عورت کو شادی فسخ کرنے کا حق نہیں رہتا ہے، کیوں کہ اس کو شادی کا مقصد حاصل ہوچکا ہے، وہ ہے مہر اور جماع، اور یہ دونوں نامردی کے پیدا ہونے سے پہلے مکمل ہوچکے ہیں۔

عیب کو ختم کرنا ممکن ہو

اگر سرجری وغیرہ سے شرمگاہ کی ہڈی یا گوشت کو ہٹانا ممکن ہو اور بیوی اس پر راضی ہو تو پھر شوہر کو اس وقت فسخ کا اختیار نہیں رہتا ہے کیوں کہ فسخ کی کوئی علت نہیں پائی جاتی ہے۔

اسی طرح اگر جنون، برص اور جذام کو دوا سے ختم کرنا ممکن ہو تو بھی فسخ کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے، کیوں کہ فسخ کی علت ہی باقی نہیں ہے۔

نکاح فسخ کرنے میں بیوی کے ولی کا حق

عورت کے ولی کو لڑکی کے نکاح کو فسخ کرنے کا حق حاصل ہے جب شوہر میں عقدِ

نکاح سے پہلے مذکورہ عیوب میں سے کوئی عیب پایا جائے، چاہے بیوی اس فسخ پر راضی ہو یا نہ ہو، کیوں کہ ولی کو اس عیب کی وجہ سے عار لاحق ہوتا ہے۔

اگر جماع کے بعد کوئی عیب پیدا ہو جائے تو اس صورت میں بیوی کے ولی کو اختیار نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں عام طور پر عار لاحق نہیں ہوتا ہے، برخلاف ابتدا میں کوئی عیب پایا جائے اور اس کے بارے میں معلوم ہو جائے۔

اسی طرح اگر شوہر میں عقدِ نکاح ہونے کے ساتھ عضو کے کٹنے اور نامردی کا عیب پیدا ہو جائے تو ولی کو فسخ کا اختیار نہیں ہے، کیوں کہ اس میں نقصان صرف بیوی کو ہوتا ہے اور وہ اس پر راضی ہے، عرف میں اس صورت میں کوئی عار ولی پر نہیں آتا ہے۔

فوراً فسخ کرنا ضروری ہے

ان عیوب کی صورت میں نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار فی الفور ہے، کیوں کہ یہ عیب کی وجہ سے اختیار ہے، جس کی وجہ سے اس شادی پر راضی نہ ہونے کے اظہار میں جلدی کرنا ضروری ہے، چناں چہ بیوی شوہر میں کوئی عیب دیکھے تو فوراً قاضی یا حاکم کے سامنے مقدمہ پیش کرے اور نکاح فسخ کرنے کا مطالبہ کرے، اسی طرح شوہر بھی عیب دیکھنے کی صورت میں ایسا ہی کرے، اگر ان میں سے کوئی دوسرے میں عیب دیکھے پھر خاموش رہے تو فسخ کا حق ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ وہ فسخ کے حق سے ہی ناواقف ہو، اس صورت میں یہ حق باقی رہتا ہے۔

فسخ میں مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے

مذکورہ عیوب میں سے کوئی عیب پایا جائے تو شوہر یا بیوی خود سے نکاح فسخ نہیں کرسکتے ہیں، بلکہ اس مقدمہ کو قاضی کے سامنے پیش کر کے فسخ نکاح کا مطالبہ کرنا ضروری ہے، جب قاضی کے یہاں عیب ثابت ہو جائے تو وہ نکاح فسخ کرے گا۔

نامردی کی صورت میں مہلت

اگر قاضی کے نزدیک شوہر کی نامردی ثابت ہو جائے تو قاضی اس کو ایک قمری سال

کی مہلت دے گا، کیوں کہ موسم کی تبدیلی سے نامردی کے ختم ہونے کا امکان رہتا ہے، اگر یہ علت ختم ہوجائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ قاضی نکاح فسخ کردے گا۔

امام بیہقی (النکاح ۷/۲۲۶) نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نامرد کو ایک سال کی مہلت دی، اگر وہ بیوی کے ساتھ جماع پر قادر ہوگیا تو ٹھیک، ورنہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرائی جائے گی، عورت کو مہر ملے گا اور اس کے لیے عدت بھی ضروری ہے۔

نامردی کیسے ثابت ہوگی؟

تمام عیوب اقرار یا ڈاکٹر کے معائنے سے ثابت ہوں گے، البتہ صرف نامردی قاضی کے سامنے شوہر کے اقرار یا جب قاضی شوہر سے نامرد نہ ہونے کی قسم کھانے کے لیے کہے تو شوہر کے قسم نہ کھانے کی صورت میں بیوی کی قسم سے ثابت ہوگی۔

۲۔ ان عیوب کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کی صورت میں مرتب ہونے والے احکام

مذکورہ عیوب میں سے کسی عیب کی وجہ سے شوہر یا بیوی کی طرف سے نکاح فسخ کیا جائے تو فسخ جماع سے پہلے ہوگا یا جماع کے بعد، اور عیب جماع سے پہلے ہی سے ہوگا یا جماع کے بعد شروع ہوگا۔

۱۔ جماع سے پہلے نکاح فسخ ہوجائے تو مہر ساقط ہوجائے گا اور بیوی کو متعہ بھی نہیں ملے گا، کیوں کہ اگر شوہر میں عیب پایا جائے تو نکاح فسخ کرنے والی بیوی ہوگی، اس صورت میں عورت کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

اگر عیب بیوی میں ہو تو بھی اس کو کچھ نہیں ملے گا، کیوں کہ اس میں عیب پائے جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہوا ہے، گویا وہی نکاح فسخ کرنے والی ہے۔

۲۔ اگر جماع کے بعد نکاح فسخ ہوجائے، لیکن عقدِ نکاح کے وقت ہی سے عیب

موجود ہو یا عقد اور جماع کے درمیانی وقفہ میں عیب پیدا ہو جائے جس سے جماع کرنے والا ناواقف ہو تو اس صورت میں مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے۔

۳۔اگر جماع کے بعد فسخ ہو جائے اور جماع کے بعد ہی عیب پیدا ہو جائے تو بیوی کے لیے متعین کردہ پورا مہر دینا واجب ہے، کیوں کہ فسخ کے اختیار کا سبب پائے جانے سے پہلے ہی جماع ہو چکا ہے تو مہر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

ولی یا بیوی کی طرف سے دھوکہ دیے جانے کی صورت میں شوہر مہر میں رجوع نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ اس نے عورت سے فائدہ اٹھالیا ہے، دھوکہ دینے کی شکل یہ ہے کہ خود بیوی یا اس کا ولی شوہر کے سامنے عیب بیان کرنے سے خاموش رہے جب عیب جماع سے پہلے پیدا ہوا ہو۔

طلاق کے احکام ومسائل

طلاق کے اصطلاحی معنی لفظِ طلاق وغیرہ سے نکاح کی گرہ کو کھولنے کے ہیں۔

طلاق کے مشروع ہونے کے دلائل

قرآن اور حدیث میں اس کے بہت سے دلائل ہیں اور اس پر اجماع بھی ہے۔

اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ" (بقرہ ۲۲۹) طلاق دو مرتبہ ہے، پھر اس کے بعد بھلے طریقے پر روکے رکھنا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" (طلاق ۱) اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اللہ تعالی کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال چیز طلاق ہے"۔ (ابوداود: الطلاق ۲۱۷۸، ابن ماجہ ۲۰۱۸)

امام ترمذی (الطلاق ۱۱۸۹) ابن ماجہ (الطلاق ۲۰۸۸) اور ابو داود (الادب ۵۱۳۸) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میری ایک بیوی تھی، اس سے میں محبت کرتا تھا، اور میرے والد اس کو ناپسند کرتے تھے، چناں چہ انھوں نے حکم دیا کہ میں اس عورت کو طلاق دوں، میں نے انکار کیا تو انھوں نے اس کا تذکرہ نبی کریم ﷺ سے کیا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "عبداللہ بن عمر! اپنی بیوی کو طلاق دو"۔

سبھی علماء طلاق کے مشروع ہونے پر متفق ہیں، کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔

طلاق مشروع کرنے کی حکمت

شادی کی اصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ازدواجی زندگی جاری وساری رہے، اللہ تبارک وتعالی نے شادی کے جاری رہنے اوراس کے باقی رہنے کی ضمانت کے لیے اس کے بہت سے احکام اورآداب مشروع کیے ہیں، البتہ میاں بیوی یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے ان آداب اور احکام کی رعایت نہیں رکھی جاتی ہے مثلاً شوہر بہترین انتخاب پرتوجہ نہ دے یا میاں بیوی یا ان دونوں میں سے کوئی ان معاشرتی آداب کی پابندی نہ کرے جو دینِ حنیف اسلام نے ان دونوں کے حق میں مقرر کیے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان دونوں کے درمیان نفرت پیدا ہوجاتی ہے پھر اس نفرت میں اضافہ ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اصلاح کی کوئی صورت اور گنجائش باقی نہیں بچتی ہے اور میاں بیوی کے درمیان مفاہمت اور ساتھ میں رہنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا ہے، اسی وجہ سے ان حالات کے لیے احتیاطی تدبیر اختیار کرنا ضروری تھا، جس کو ان جیسی حالتوں اورصورتوں میں روبعمل لایا جائے ،تا کہ شادی کا بندھن ایسے انداز میں کھول دیا جائے کہ میاں بیوی میں سے کسی کے حقوق پامال نہ ہوں، یہ اسی صورت میں کیا جاتا ہے جب معاشرت اور ساتھ میں رہنے کے تمام اسباب ختم ہوجاتے ہیں، اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے: ''وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا '' (نساء ۱۳۰) اگر وہ دونوں جدا ہوجائیں گے تو اللہ ان دونوں کو اپنی وسعت سے بے نیاز کردے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔

اگر شوہر اس طرح کے حالات میں طلاق کا استعمال کرے تو یہ ضروری علاج ہے، اسے مفر اور چارۂ کار نہیں ہے، اگر چہ بہت سے موقعوں پر اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، البتہ اگر اپنے تکبر کے لیے اوراپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے طلاق دے تو اس کے حق میں یہ اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ حلال ہے۔

اللہ تعالی اصلاح کرنے والے اور فساد مچانے والے کو جانتا ہے۔

طلاق کی مشروعیت شریعتِ اسلامیہ کے مفاخر میں سے ہے

گذشتہ تفصیلات سے ہمارے سامنے یہ بات موکد ہو جاتی ہے کہ اسلامی شریعت کی طرف سے منظم کردہ احکام اور نتائج کے طریقے کے مطابق طلاق کی مشروعیت اسلامی شریعت کے مفاخر اور امتیازات میں سے ہے اور یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ اس شریعت کے احکام انسان کی فطرت کے پوری طرح مطابق اور انسانی طبیعت کی فطری ضروریات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

یہ حقیقت اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم بہت سی قوموں کو دیکھتے ہیں کہ وہ طلاق کو حرام قرار دیتے ہیں اور شادی کو عمر قید سمجھتے ہیں، جس میں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے باندھ کر رکھا جاتا ہے، چاہے وہ ایک دوسرے کو پسند کریں یا ناپسند، ایک دوسرے سے محبت کریں یا نفرت، ان قوموں نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا ہے کہ اس پابندی سے معاشرے میں بڑے برے نتائج سامنے آئے ہیں اور جرم کے بڑے مظاہر رونما ہوئے ہیں، یہ قومیں اس بات سے واقف ہوگئی ہیں کہ ایک دوسرے کو مربوط رکھنے کا عمل مجبور کرکے بالکل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی شریعت نے آپسی مفاہمت اور میاں بیوی کے درمیان دائمی محبت ومودت اور دائمی معاشرت کے بہت سے اسباب متعین کیے ہیں۔

لیکن اسلامی شریعت نے اس کا علاج تنبیہ اور مختلف مثبت ضمانتوں کی طرف رہنمائی کرکے کیا ہے جو میاں بیوی کے درمیان محبت کو غذا فراہم کرتی ہیں اور دشمنی ونفرت کے اسباب کو ختم کرتی ہیں، ان اہم ضمانتوں میں سے ایک میاں بیوی میں صحیح دین کا پایا جانا ہے اور ہر ایک کا اپنے اوپر عائد ذمے داریوں کو پورا کرنا ہے اور اللہ عزوجل کی شریعت کے مطابق صحیح اور مثبت اخلاقی برتاؤ کی پابندی کرنا ہے۔

یہی ضمانتیں ازدواجی زندگی کو منہدم ہونے سے بچاتی ہیں اور یہی طلاق کے اصول کو ایک جانب رکھ دیتی ہیں، صرف ضرورت کے وقت ہی اس سے مدد لی جاتی ہے، جب میاں

بیوی میں سے کوئی ازدواجی زندگی کی حفاظت کے لیے اور میاں بیوی کے درمیان محبت ومودت کی رعایت کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے مقرر کردہ ضمانتوں اور آداب کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس دوا کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جو صالح خاندان اور گھرانے اسلامی احکام وآداب کی پابندی کرتے ہیں ان میں طلاق کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس طرح کے واقعات کثرت سے ان خاندانوں میں رونما ہوتے ہیں جو اسلام کی پابندیوں سے خود کو آزاد سمجھتے ہیں اور اسلامی نظام اور آداب سے بغاوت کرتے ہیں۔

طلاق کی قسمیں

مختلف اعتباروں سے طلاق کی تین طرح کی تقسیم ہے۔

استعمال کردہ الفاظ کی دلالت اور وضاحت کے اعتبار سے طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔

بیوی کی حالت؛ طہر اور حیض، بالغ اور نابالغ ہونے کے اعتبار سے طلاق کی تین قسمیں ہیں: بدعی، سنی اور جو بدعی بھی نہ ہو اور سنی بھی نہ ہو۔

مال بدل میں دینے اور نہ دینے کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں: خلع اور طلاق۔

پہلی تقسیم: صریح اور کنایہ

طلاق کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، یہ الفاظ یا تو طلاق پر قطعی طور پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں جن میں طلاق کے علاوہ کوئی دوسرے معنی کا امکان نہیں پایا جاتا ہے، ان الفاظ کو صریح کہا جاتا ہے۔

یا یہ الفاظ اپنی دلالت میں قطعی نہیں ہوتے ہیں کہ ان میں طلاق کے علاوہ دوسرے معانی اور مطلب کا بھی احتمال رہتا ہے، ان الفاظ کو کنایہ کہا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ صریح ۲۔ کنایہ

۱۔صریح طلاق:

وہ ہے جس میں لفظ کے ظاہر سے طلاق کے علاوہ دوسرے معنی کا احتمال ہی نہ ہو، اس کے تین الفاظ ہیں: طلاق، سراح اور فراق۔ اوران تین الفاظ کے دیگر مشتقات مثلاً کہا جائے: 'أنتِ طالق یا أنت مسرحة یا کہے: طلقتک، فارقتک، سرحتک

یہ الفاظ طلاق پر دلالت کرنے میں صریح ہیں، کیوں کہ شریعت میں ان الفاظ کا کثرت سے استعمال طلاق ہی کے معنی میں ہوا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ" (طلاق ۱) اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو۔

فرمانِ الٰہی ہے: "وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا" (احزاب ۲۸) اور میں تم کو بہتر طریقے پر چھوڑ دوں گا۔

اللہ سبحانہ وتعالی کا فرمان ہے: "اَوْ فَارِقُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ" (طلاق ۲) یا ان کو بھلے طریقے پر جدا کر دو۔

صریح الفاظ میں سے عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں لفظِ طلاق کا ترجمہ بھی ہے، اس کا اعتبار ان زبانوں میں الفاظ کے استعمال پر ہوگا۔

۲۔کنایہ

وہ ہر لفظ ہے جس میں طلاق اور دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو، اس کے الفاظ بہت سے ہیں مثلاً کہے:

۔تم مجھ سے خالی ہو

۔تم مجھ سے جدا ہو

۔تیرا میرا رشتہ ٹوٹ گیا

۔اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ

۔تم جہاں چاہے جاؤ

۔مجھ سے دور ہو جاؤ

۔مجھ سے دفع ہو جاؤ

۔میں نے تمھارا راستہ صاف کر دیا

۔تو مجھ پر حرام ہے

یہ تمام الفاظ اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے الفاظ ہیں جو طلاق پر دلالت کرنے میں کنایہ شمار ہوتے ہیں، کیوں کہ ان میں طلاق کے معنی کا بھی احتمال ہے اور دوسرے معانی کا بھی۔

طلاق میں کنایہ الفاظ استعمال کرنے کی دلیل

امام بخاری (الطلاق ۴۹۵۵) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ''جون'' کی دختر کو جب رسول اللہ ﷺ کے پاس داخل کیا گیا اور آپ اس سے قریب ہوئے تو اس نے کہا: میں تم سے اللہ کے حضور پناہ مانگتی ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''تم نے بڑی عظیم ذات کی پناہ مانگی ہے، تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ''۔

صریح اور کنایہ الفاظ کا حکم

صریح الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے چاہے طلاق کی نیت ہو یا نہ ہو، کیوں کہ لفظ کی صراحت اور معنی پر اس کی قطعی دلالت کی وجہ سے اس کو بولتے وقت نیت شرط نہیں ہے۔

کنایہ کے الفاظ سے اسی وقت طلاق واقع ہوتی ہے جب شوہر ان الفاظ سے طلاق دینے کی نیت کرے، چاہے ان الفاظ کا استعمال عرف میں طلاق دینے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، مثلاً کہے: تم مجھ پر حرام ہو۔

اگر اس سے طلاق کے علاوہ کوئی دوسرے معنی مراد لے یا اس سے کوئی معنی ہی مقصود نہ ہو بلکہ یوں ہی کہہ دے تو طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔

امام بخاری (المغازی ۴۱۵۶) اور امام مسلم (التوبۃ ۲۷۶۹) نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ کی قبولیت کی روایت میں نقل کیا ہے جب وہ غزوہ تبوک میں شریک نہیں

ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی سے الگ رہیں، انھوں نے دریافت کیا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلکہ اس سے الگ رہو، اس کے قریب مت جاؤ''۔ راوی کہتے ہیں: میں نے اپنی بیوی سے کہا: اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ۔

جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو ان کی بیوی ان کے پاس واپس آگئی تو ان کو تجدید نکاح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ''اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ'' سے طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب اس کی نیت ہو۔

کعب رضی اللہ عنہ نے اس لفظ سے طلاق کی نیت نہیں کی، اسی وجہ سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور ان کی بیوی ان کے پاس لوٹ آئی۔

دوسری تقسیم: سنی اور بدعی وغیرہ

جس عورت کو طلاق ہوئی ہے وہ تین حالتوں سے خالی نہیں رہتی ہے:

پہلی حالت یہ ہے کہ عورت حیض اور نفاس سے پاک ہوگی اور اس طہر میں اس کا شوہر اس سے قریب نہیں گیا ہوگا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ شوہر اس کے ساتھ جماع کرنے کے بعد وہ حالتِ حیض یا نفاس میں ہوگی یا ایسے طہر میں ہوگی جس میں شوہر نے اس کے ساتھ جماع کیا ہو۔

تیسری حالت یہ ہے کہ وہ نابالغہ ہوگی جس کو ابھی حیض نہ آیا ہو یا وہ آیسہ ہوگی جس کو حیض آنا بند ہوگیا ہو، یا وہ حاملہ ہوگی جس کا حمل نمایاں ہوگیا ہو یا اس کے ساتھ ابھی جماع ہی نہ کیا گیا ہو یا عورت نے خلع کا مطالبہ کیا ہو۔

اگر پہلی صورت میں طلاق دی جائے تو اس کو طلاقِ سنی کہا جاتا ہے۔

اگر دوسری حالت میں طلاق واقع ہوئی ہو تو اس کو بدعی کہا جاتا ہے۔

اگر تیسری حالت میں طلاق واقع ہو تو نہ وہ بدعی ہے اور نہ سنی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلاق کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہیں:

۱۔طلاقِ سنی

۲۔طلاقِ بدعی

۳۔نہ سنی اور نہ بدعی

ان تینوں قسم کی طلاق کا حکم

۱۔طلاقِ سنی: یہ جائز بھی ہے اور واقع بھی ہوتی ہے، یہ طلاق کی کیفیت اور طریقے میں شرعی تعلیمات کے مطابق شکل ہے، اگر شوہر طلاق دینے پر مصر ہو، چاہے ایک طلاق دے یا ایک ساتھ تین طلاق۔

لیکن سنت یہ ہے کہ پہلے طہر میں ایک یا دو طلاق دے تا کہ افسوس ہونے پر اس سے رجوع کرنا ممکن رہے۔

سنی طلاق کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "**یا أیها الذین آمنوا إذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن**" (طلاق ۱) یعنی ایسے وقت میں طلاق دو جس میں عورت اپنی عدت شروع کرے اور وہ ہے طہر، کیوں کہ حیض کی مدت عدت میں شمار نہیں ہوتی ہے۔

۲۔طلاقِ بدعی: یہ حرام ہے، لیکن یہ طلاق واقع ہوجاتی ہے، لیکن اس سے آدمی گنہ گار ہوجاتا ہے، کیوں کہ اس میں طلاق کی مشروع کردہ شکل کی مخالفت ہے، جو شکل اللہ کے اس فرمان میں بیان کی گئی ہے: "**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ**" (طلاق ۱) اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو۔

اس صورت میں شوہر کے لئے رجوع کرنا سنت ہے۔امام بخاری (الطلاق: ۲۹۵۳) اور امام مسلم (الطلاق ۱۴۷۱) نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حالت حیض میں طلاق دی تو عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو رجوع کرنے کا حکم دو پھر پاک ہونے تک اس کو اپنے ساتھ رکھے پھر اس کو حیض آئے، پھر وہ پاک ہوجائے، پھر اگر وہ چاہے تو اس کے بعد روکے رکھے اور اگر چاہے تو

جماع سے پہلے طلاق دے۔ یہ عدت ہے جس کے دوران اللہ نے طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔یعنی اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان میں اس کا تذکرہ ہے:"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ "(طلاق ۱) اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت کو پاک ہونے تک چھوڑ دے، اس وقت اگر چاہے تو ایک طلاق دے، جب اس کو حیض آئے پھر اس سے پاک ہو جائے تو چاہے تو دو طلاق دے، جب وہ تیسری مرتبہ پاک ہو جائے تو دیکھے، اگر چاہے تو رجوع کرنے کے بعد اپنے ساتھ رکھے، اگر چاہے تو تیسری طلاق دے، اس صورت میں وہ بائنہ ہو جائے گی۔

طلاق بدعی کے حرام ہونے کا سبب

اس طلاق کے حرام ہونے کی وجہ عورت کو حاصل ہونے والا نقصان ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے عدت کی مدت بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ حیض کا شمار عدت میں نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ"۔(مالک: الاقضیۃ ۲/ ۷۴۵۔ ابن ماجہ: الاحکام ۱۸۸۔ ۲۳۴۰، ۲۳۴۱)

حالت طہر میں جماع کرنے کے بعد طلاق دینے کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس دوران حمل ٹھہر جائے اور وہ حاملہ کو طلاق دینے کی خواہش نہ رکھتا ہو، جس کی وجہ سے اس کو طلاق دینے کے بعد ندامت ہوگی۔

۳۔ وہ طلاق جو نہ سنی ہے اور نہ بدعی:

یہ طلاق جائز ہے اور واقع بھی ہوتی ہے اور حرام بھی نہیں ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے کیوں کہ نابالغ اور آیسہ مہینوں کے اعتبار سے عدت گزارتی ہیں جس کی وجہ سے عدت کے طویل ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، اسی طرح حاملہ کا مسئلہ ہے، کیوں کہ اس کی عدت ہر حال میں وضع حمل ہے، اسی طرح خلع طلب کرنے والی عورت کا مسئلہ ہے، کیوں کہ مال دے کر خود کو آزاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے

چھٹکارا پانا چاہتی ہے اور وہ طویل عدت گزارنے پر راضی ہے۔

تیسری تقسیم: عادی طلاق اور خلع

۱۔طلاق: یہ وہ طلاق ہے جو شوہر کی خواہش سے دی جاتی ہے اور اس طلاق پر وہی احکام نافذ ہوں گے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

۲۔خلع: وہ طلاق ہے جو بیوی کی خواہش اور اس کی طرف سے اصرار کی وجہ سے دی جاتی ہے، اس کے لئے خلع کو مشروع کیا گیا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کچھ دے کر شوہر سے چھٹکارا پائے جس پر میاں بیوی دونوں متفق ہو جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلع بھی طلاق کی ایک قسم ہے۔ ہر وہ جدائی خلع ہے جو بیوی کی طرف سے شوہر کو عوض دے کر عمل میں آئے۔

خلع کے مشروع ہونے کی دلیل

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**فَإِنْ خِفْتُمْ أَن لَّا يُقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ** ''(بقرہ ۲۲۹) پس اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے جس کا وہ (عورت) فدیہ دے۔ یعنی فدیہ دے کر خلع لے۔

امام بخاری (الطلاق ۴۹۷۱) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا: اللہ کے رسول! ثابت بن قیس: میں اخلاق اور دین میں ان کی سرزنش نہیں کرتی ہوں، لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں، یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا: کیا تم ان کو ان کا باغ واپس کردو گی؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ثابت سے کہا: باغ قبول کرو اور اس کو ایک طلاق دو۔

''میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ میں مسلمان ہوتے

ہوئے شوہر کے حقوق کی نافرمانی کو ناپسند کرتی ہوں۔

خلع کے احکام

۱۔ خلع لینا جائز ہے اور خلع مالی عوض کے بدلے ہی واقع ہوتا ہے جو بیوی شوہر کو دیتی ہے، اگر خلع میں عوض معلوم اور مذکور ہو تو یہی عوض واجب ہے، اگر متعین طور پر عوض کا تذکرہ نہ کیا جائے تو خلع صحیح ہو جاتا ہے اور شوہر کو مہر مثل دینا واجب ہے۔

اگر شوہر خلع کے لفظ کا استعمال کرے اور کوئی عوض متعین نہ کیا جائے اور اس کے ذہن میں عوض کا گزر بھی نہ ہو تو یہ عادی طلاق ہے جو خلع کے لفظ سے کنایہ طلاق ہے یعنی یہ طلاق کے کنایہ الفاظ میں سے ہے، اس سے رجعی طلاق واقع ہوگی۔

۲۔ خلع غیر رشیدہ بیوی سے واقع نہیں ہوتی ہے کیوں کہ اس میں اہلیت نہیں پائی جاتی ہے چنانچہ اس کو تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے، اگر شوہر اس کو خلع دے تو طلاق رجعی واقع ہوگی اور اس کو عورت کے مہر میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔

۳۔ جب شوہر اپنی بیوی کو خلع دے تو عورت اپنی ذات کی خود مالک ہوگی اور شوہر کو اس پر کوئی قابو نہیں ہوگا چناں چہ عدت کے دوران وہ اس سے رجوع نہیں کر سکتا، جس طرح وہ عادی طلاق میں رجوع کرنے کا حق رکھتا ہے، کیوں کہ خلع طلاق بائن ہے، اس سے رجوع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نیا عقد نکاح کیا جائے اور مہر بھی نیا متعین کیا جائے گا۔

۴۔ خلع دی ہوئی عورت پر نہ کسی طلاق کا اثر ہوتا ہے اور نہ ظہار اور ایلاء کا، کیوں کہ خلع کے بعد وہ شوہر کے لئے اجنبی ہو جاتی ہے، چنانچہ نہ اس پر طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ ظہار یا ایلاء، برخلاف مطلقہ رجعیہ کے، شوہر کو اختیار رہتا ہے کہ وہ اس کو دوسری طلاق دے یا عدت کے دوران اس کے ساتھ ظہار کرے، اس شکل میں اس کا عورت پر اثر ہوتا ہے۔

۵۔ مرد کے لئے بیوی کو حالت حیض اور اس پاکی کی حالت میں خلع دینا جائز ہے جس میں وہ جماع کیا ہو، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ بیوی رشیدہ ہو، کیوں کہ اس سے خلع لینے والی عورت کو نقصان ہو جاتا ہے، کیوں کہ خلع عورت کی اس خواہش پر دیا جاتا ہے کہ وہ

شوہر سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔

طلاق کا حق شوہر کو ہوتا ہے

یہ بات معلوم ہی ہے کہ دراصل طلاق کا حق شوہر کو ہوتا ہے، اس کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے "أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ" (بقرہ۔۲۳۷) یا وہ معاف کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہے۔

جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہے وہ شوہر ہے۔

البتہ بعض مخصوص حالات میں عورت کو بھی طلاق کا حق حاصل ہوتا ہے، ان میں سے اہم حالات مندرجہ ذیل ہیں:

اس کو شوہر سے نقصان پہنچ رہا ہو

شوہر اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے پھر ان کے درمیان اصلاح کرنا دشوار ہو جائے، اس صورت میں قاضی عورت کی طرف سے اس کی خواہش پر ایک طلاق دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ شوہر کو کتنی طلاق کا حق رہتا ہے؟

قرآن نے اس کا جواب دیا ہے اور شوہر کے لئے طلاق کی تعداد کو مقرر کیا ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: "**الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ**" (بقرہ ۲۲۹) طلاق دو مرتبہ ہے، پھر اس کے بعد بھلے طریقے پر روکے رکھنا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالی کا فرمان ہے: "**فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ، وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ**" (سورہ بقرہ ۲۳۰) پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو وہ اس کے لیے ابھی حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے مرد سے شادی کرے، پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوبارہ شادی کرلیں اگر وہ یہ گمان کرلیں کہ وہ اللہ کے حدود کا پاس ولحاظ رکھیں گے، اور یہی اللہ کے حدود ہیں جن کو وہ جاننے والوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے۔

یعنی شوہر اپنی بیوی کو تین طلاق دے سکتا ہے، ان میں سے دو رجعی ہیں اور تیسری طلاق کے بعد رجوع کا اختیار نہیں ہے، لیکن اس صورت میں چند شرطوں کے ساتھ رجوع کرنا جائز ہے۔

امام ابوداود (الطلاق ۲۱۹۵) اور امام نسائی (الطلاق ۶/ ۲۱۲) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ اس سے رجوع کرنے کا زیادہ حقدار ہے، اگر اس کو تین طلاق دے تو اس کا یہ حق ختم ہو جاتا ہے، اللہ کا فرمان: "الطلاق مرتان" (بقرہ ۲۲۹) یعنی وہ طلاق جس میں شوہر کو رجوع کا حق ہے دو طلاق ہے۔ اس بات پر اجماع ہے کہ شوہر کو تین طلاق دینے کا اختیار رہے، تیسری طلاق سے عورت بائنہ ہو جاتی ہے جس کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا، البتہ چند شرطوں کے ساتھ رجوع کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں آرہی ہیں۔ انشاءاللہ

طلاق صحیح اور واقع ہونے کی شرطیں

شوہر کے لئے طلاق کا حق رہنے اور اس کی طرف سے طلاق واقع ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں جو طلاق دینے والے میں پائی جانا ضروری ہے:

۱۔ نکاح ثابت ہو:

چنانچہ اس شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی جس عورت کے ساتھ اس کا نکاح ہی نہیں ہوا ہو اور نہ اس کی طرف سے جس کا نکاح اس عورت سے ہونے والا ہو، چاہے طلاق معلق ہو یا کسی تعلیق کے بغیر ہو:

مثلاً وہ کسی ایسی عورت سے کہے جس کا نکاح اس کے ساتھ نہ ہوا ہو: میں نے تم کو طلاق دیا۔ یا یہ کہے: اگر میں نے تمہارے ساتھ شادی کی تو تمہیں طلاق۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "**يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا**" (احزاب ۴۹) اے ایمان والو! اگر تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو چھونے

(جماع کرنے) سے پہلے طلاق دو تو تمھارے لیے ان پر عدت نہیں ہے کہ وہ عدت گزاریں۔

اللہ سبحانہ وتعالی نے طلاق کے نتائج اور احکام کو سب سے پہلے نکاح ثابت ہونے پر معلق کیا ہے۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے "نکاح سے پہلے طلاق نہیں" (حاکم: الطلاق ۲/۲۰۵) ابو داود (الطلاق ۲۱۹۰) اور امام ترمذی (طلاق: ۱۱۸۱) نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کے لئے اس چیز میں نذر ماننے کا حق نہیں جس کا وہ مالک نہیں اور اس کو آزاد کرنے کا حق نہیں جس کا وہ مالک نہیں اور اس کو طلاق دینے کا حق نہیں جس کا وہ مالک نہیں"۔

دوسری شرط: مکمل رشد ہو:

چناں چہ بچے، مجنون اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

امام ابوداود (الحدود: ۴۴۰۳) وغیرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے سوئے ہوئے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہوجائے، بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، پاگل سے یہاں تک کہ اس کی عقل لوٹ آئے"۔

ان تین لوگوں کے حکم میں وہ شخص بھی ہے جو بھول جاتا ہے یا اپنے کہے ہوئے کلام کے معنی سے ناواقف ہو، البتہ اس کے اس دعوی کو کہ وہ بھول جاتا ہے یا اپنی کہی ہوئی بات کے معنی سے واقف نہیں ہے بغیر دلیل اور قرینہ کے مانا نہیں جائے گا۔

نشہ میں مدہوش شخص کی طلاق

اگر دوائی دینے کی وجہ سے اس کو نشہ آئے اور اس کے لیے اس دوائی کا استعمال ناگزیر ہو، اور دوائی کو کھانے سے اس کی عقل پر پردہ پڑ جائے یا نشہ آور چیز کو پینے پر اس کو مجبور کیا جائے یا نشہ آور چیز اس کے پیٹ میں زبردستی پہنچائی جائے تو اس کا حکم بچے اور سوئے ہوئے شخص کی طرح ہے، کیوں کہ ان سبھوں میں ایک ہی عذر پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی بالارادہ اور کسی عذر کے بغیر نشہ استعمال کرے تو اس کی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور اس کو نشہ آور کے استعمال کی وجہ سے بطور سزا عاقل شخص کی طرح ہی سمجھا جائے گا ، کیوں کہ نشہ آور مکلّف ہے اور صحابہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ نشہ کی حالت میں کسی پر الزام یا عورت پر بہتان وغیرہ کا مواخذہ کیا جائے گا۔

تیسری شرط: مکمل اختیار ہو:

چنانچہ جس کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے تو طلاق واقع نہیں ہوتی ، لیکن زبردستی میں مندرجہ ذیل شرطوں کی رعایت ضروری ہے:

۱۔ زبردستی بغیر حق کے ہو ، اگر کسی حق کی وجہ سے طلاق پر مجبور کیا جائے ، مثلاً وہ اپنی بیوی کو نقصان پہنچا رہا ہو تو حاکم بیوی کو طلاق دینے پر اس کو مجبور کرے گا ، اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔

۲۔ زبردستی اس کو بلا واسطہ دھمکی کے نتیجے میں ہو جس سے سخت نقصان کا اندیشہ ہو مثلاً قتل ، عضو کاٹنے اور سخت مارنے کی دھمکی ، اسی طرح بیمار شخص کے لئے تھوڑا سا مارنا اور تھوڑی سی تکلیف پہنچانا بھی اس میں شامل ہے۔

۳۔ زبردستی کرنے والا اپنی دھمکی پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے ”اغلاق ، زبردستی میں نہ طلاق ہے اور نہ آزادی“ (ابن ماجہ: الطلاق ۲۰۴۶) یہاں اغلاق کے معنی زبردستی کے ہیں کیوں کہ جب مجبور کیا جاتا ہے تو اس کے حق میں تصرف بند کر دیا جاتا ہے۔

ابن ماجہ (الطلاق ۲۰۴۵) وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے میری امت سے غلطی ، بھول اور اس کو معاف کر دیا ہے جس پر ان کو مجبور کیا جائے۔ یعنی اس کا حکم ان سے ہٹا لیا گیا ہے۔

۴۔ جس شوہر کو مجبور کیا جائے اس سے اسی مقدار میں ہی عمل صادر ہو جتنے پر اس کو مجبور کیا گیا ہے ، اگر ایک طلاق کے لئے مجبور کیا جائے اور وہ دو یا تین طلاق دے تو طلاق

واقع ہوجائے گی۔

ہنسی مذاق میں طلاق دینے کے احکام

مجبور کردہ شخص کی طلاق واقع ہونے کے لئے جو شرطیں ہم نے بیان کی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا کہ ہنسی مذاق میں طلاق دینے سے واقع ہوجائے گی جب وہ رشید، بالغ، عاقل اور مختار ہو، اور اس کا ہنسی مذاق میں طلاق کے واقع ہونے میں کوئی عذر نہیں مانا جائے گا۔

امام ترمذی (الطلاق ۱۱۸۴) امام ابوداود (الطلاق ۲۱۹۴) اور امام ابن ماجہ (الطلاق ۲۰۳۹) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''تین چیزوں میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے: نکاح، طلاق اور رجوع''۔

طلاق کے شرعی طریقے اور کیفیات

مختلف طریقوں سے طلاق دی جاسکتی ہے:
۔مثلاً ایک ہی لفظ میں کئی طلاق کو جمع کردے یا ان کو الگ الگ دے۔
۔طلاق معلق بنا کردے یا معلق بنائے بغیر دے یا استثناء کے ساتھ دے۔

طلاق کی پہلی کیفیت

شرعی طور پر طلاق کی سب سے افضل کیفیت اور شارع کی طرف سے متعین کردہ حکمت کے ساتھ متفق طریقہ یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو تین مرحلوں میں طلاق دے، اللہ کا بیان کردہ طریقہ یہ ہے کہ شوہر ایسے طہر کی حالت میں ایک طلاق دے جس میں بیوی کے ساتھ جماع نہ کیا ہو، اگر اس کو ندامت ہو تو عدت کے دوران بیوی سے رجوع کرلے۔

اگر پھر طلاق دینے کی سوجھے تو دوسری طلاق دے، اس کے بعد اس کے ہاتھ میں صرف ایک طلاق باقی رہتی ہے، یہ طلاق دینے پر عورت بائنہ ہوجاتی ہے پھر شرعی طور پر عورت کے دوسرے نکاح ہونے سے پہلے اس سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، اس کی

تفصیلات آئندہ صفحات میں آ رہی ہیں، انشاء اللہ۔

اس طریقہ کی وضاحت اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ '' (بقرہ ۲۲۹) طلاق دو مرتبہ ہے، پھر اس کے بعد بھلے طریقے پر روک کے رکھنا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

ایک ہی لفظ سے تین طلاق کا حکم

اگر طلاق کے افضل طریقہ کی پابندی نہ کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوتی، بلکہ طلاق کسی بھی طریقہ سے دی جائے واقع ہو جاتی ہے جب طلاق دینے والے شخص میں وہ تمام شرطیں پائی جائیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی ایک ہی لفظ سے ایک ہی وقت میں تین طلاق دے مثلاً کہے: میں نے تم کو تین طلاق دیا تو تین طلاق ہو جائے گی، اگر الگ الگ تین مرتبہ طلاق کہے تو بھی تین طلاق ہو جائے گی۔

اس کو حرام نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور غیر افضل طریقہ ہے، امام ترمذی (الطلاق ۱۱۷۷) ابو داود (طلاق ۲۲۰۸) اور ابن ماجہ (الطلاق ۲۰۵۱) نے روایت کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ (تین طلاق) دی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا جب کہ انہوں نے آپ سے بیوی سے رجوع کرنے کے بارے میں دریافت کیا: اللہ کی قسم کھا کر کہو تم نے ایک ہی طلاق مراد لی ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے ایک ہی طلاق مراد لی ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو ان کے پاس لوٹا دیا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر رکانہ اس سے تین مراد لیتے تو تین طلاق واقع ہو جاتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو واپس لینے کی اجازت نہیں دیتے، ورنہ آپؐ کے سوال کرنے اور قسم دلانے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

کسی وصف یا شرط سے طلاق کو معلق کرنے کے احکام

جس طرح طلاق کسی شرط کے بغیر ہوتی ہے، اسی طرح کسی شرط کے ساتھ معلق

ہونے کی صورت میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

طلاق کو معلق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شوہر طلاق کے واقع ہونے کو کسی صورت یا شرط کے واقع ہونے کے ساتھ معلق کرے، چاہے اس کا تعلق بیوی سے ہو یا دوسرے کسی شخص سے، مثلاً کسی اجنبی کے آنے پر طلاق کو معلق کرے یا کسی دوسرے کی طرف سے متعین تصرف کرنے پر معلق کرے۔

مثلاً کہے: تمہارے والد کے آنے پر تم کو طلاق۔ یا کہے: رمضان کے مہینے میں تم کو طلاق، جب اس کے والد آجائیں گے یا رمضان کا مہینہ شروع ہو جائے گا تو عورت کو طلاق ہو جائے گی۔

شرط کے ساتھ معلق کرنے کی مثال یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: اگر تم گھر سے نکل گئی تو تمہیں طلاق۔ اگر تمہارا بھائی گھر کے اندر داخل ہو جائے تو تمہیں طلاق۔ اگر وہ گھر سے نکل گئی یا اس کا بھائی گھر میں داخل ہو جائے تو اس کو طلاق ہو جائے گی۔

کسی صفت یا شرط کے ساتھ طلاق واقع ہونے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: "**المسلمون عند شروطھم**"۔ (حاکم: البیوع ۴۹/۲)

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شرطیں جن پر انسان کسی چیز کے پورا ہونے کو معلق کرتا ہے تو شریعت کی طرف سے اس کا اعتبار ہے جب تک وہ حلال کو حرام نہ کرتی ہو یا حرام کو حلال۔

معلق طلاق پر مرتب ہونے والے اثرات ونتائج

معلق طلاق پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ طلاق کو کسی چیز سے معلق کیا جائے تو اس وقت تک طلاق نہیں ہوتی جب تک وہ چیز وقوع پذیر نہ ہو جائے۔

۲۔ جب تک معلق کی ہوئی چیز وجود میں نہ آئے تو ازدواجی زندگی اپنے تمام احکام اور ضروریات کے ساتھ جاری رہے گی اگرچہ اس کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہو، مثلاً کہے: جب رمضان کا مہینہ آئے تو تمہیں طلاق۔ رمضان کا مہینہ آنا یقینی ہے، اس میں کوئی شک کی

گنجائش نہیں ہے۔

۳۔جیسے ہی وہ شرط پوری ہو جائے جس کے ذریعہ طلاق کو معلق کیا ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی، پھر نئے سرے سے طلاق بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔

طلاق میں استثناء کرنے کے احکام

جس طرح کسی صفت یا شرط کے ساتھ معلق کی ہوئی طلاق صحیح ہے، اسی طرح جس طلاق میں استثناء کی جائے وہ طلاق بھی صحیح ہے۔

طلاق میں استثناء کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی لفظ میں دو یا تین طلاق کو جمع کرے پھر استثناء کے لفظ سے بعض کو کم کردے، مثلاً کہے میں نے تم کو تین طلاق دی سوائے ایک طلاق کے، یا سوائے دو طلاق کے۔

کیوں کہ اس کا استعمال قرآن اور حدیث میں ہوا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ’’فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَاماً ‘‘(عنکبوت ۱۴) پس وہ ان میں ایک ہزار سال رہے سوائے پچاس سال کے۔

اسی وجہ سے طلاق میں استثناء کا استعمال جائز ہے۔

طلاق میں استثنا صحیح ہونے کی شرطیں

طلاق میں استثنا صحیح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔طلاق دینے والا اپنے اصل کلام سے فارغ ہونے سے پہلے استثنائی کلام کا ارادہ رکھتا ہو، اگر وہ اپنی اصل بات مکمل کرے پھر اس کے ذہن میں آئے کہ اس سے استثناء کرنا چاہئے تو یہ استثناء صحیح نہیں ہے اور استثناء کرنے سے پہلے جو اصل کلام ہے اس کے مطابق طلاق واقع ہو جائے گی۔

۲۔اصل کلام اور استثنا دونوں متصل ہوں۔

اگر ان دونوں کے درمیان ایسا فصل ہو کہ عرف میں اس کو فصل سمجھا جاتا ہو مثلاً ایک

منٹ وغیرہ تو اس کا استثنا باطل ہوگا اور اصل کلام کے مطابق طلاق واقع ہوگی۔

۳۔استثناء اتنی ہی تعداد کا نہ کیا جائے جتنی تعداد اصلی کلام میں ہو مثلاً کہے: تمہیں تین طلاق سوائے تین طلاق کے، اس طرح کا استثنا لغو ہوگا اور تین طلاق ہی واقع ہو جائے گی۔

اس کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ مثبت کلام سے استثناء نفی شمار کیا جائے گا اور منفی کلام سے استثناء اثبات سمجھا جائے گا ، کیوں کہ استثنا مستثنی کے اصل حکم کے .... ہو جاتا ہے، اگر وہ کہے : میں نے تم کو طلاق نہیں دی سوائے دو کے۔تو دو طلاق ہو جائے گی۔

طلاق میں استثنا کے صحیح ہونے کی دلیل

طلاق میں استثناء کے صحیح ہونے کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''جو آزاد کرے یا طلاق دے اور استثناء کرے تو اس کا استثناء اس کے لئے ہے''(ابن اثیر نے ''النھایۃ'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے)

طلاق بیوی کے حوالے کرنے کے احکام ومسائل

شوہر کے لئے جائز ہے کہ طلاق دینے کا اختیار اپنی بیوی کے حوالے کرے، یہ حوالگی اس کو طلاق کا مالک بنانے کی طرح ہے۔

حوالے کی ہوئی طلاق کے واقع ہونے کی شرطیں:

یہ طلاق واقع ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

۱۔طلاق غیر معلق نہ ہو، اسی لیے طلاق کو کسی چیز پر معلق کرنا صحیح نہیں ہے مثلاً کہے: جب کل آئے تو تم خود کو طلاق دو۔

۲۔حوالے کرنے والا شوہر مکلّف ہو، چناں چہ بچے اور پاگل کی حوالگی صحیح نہیں ہے۔

۳۔بیوی بھی مکلّف ہو چناں چہ نابالغ یا مجنونہ کے حوالے کرنا صحیح نہیں ہے۔

۴۔بیوی حوالگی کے فوراً بعد خود کو طلاق دے، اگر اتنی تاخیر کرے کہ جس سے قبول

ایجاب سے منقطع ہو جائے تو اس کا طلاق صحیح نہیں ہوگا۔

طلاق بیوی کے حوالے کرنا جائز ہونے کی دلیل

نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ رہنے یا جدا ہونے کا اختیار دیا تھا، آپ نے یہ کام اس وقت کیا جب اللہ عزوجل کا یہ فرمان نازل ہوا: "**يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيلاً**" (احزاب ۲۸) اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے: اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زیب وزینت کو چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ بطور متعہ دیتا ہوں اور تم کو بہتر طریقہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

اگر ان کو جدائی کا اختیار دینے کا اثر نہ ہوتا تو ان کو اختیار دینے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

طلاق کے بعض مسائل

۱۔ اگر کوئی غیر عربی شخص عربی زبان میں طلاق کے الفاظ بولے اور وہ اس کے معنی سے واقف نہ ہو تو اس کی طلاق نہیں ہوگی کیوں کہ اس کا مقصود ہی نہیں پایا جاتا ہے، اگر وہ اپنی زبان میں بولے تو طلاق ہو جائے گی، چاہے اس نے طلاق کی نیت نہ کی ہو، جب یہ لفظ اس کی زبان میں طلاق کے معنی میں صریح لفظ ہو یعنی اس لفظ میں طلاق کے علاوہ دوسرے معنی کا احتمال اور امکان نہ ہو، اگر وہ لفظ صریح نہ ہو بلکہ کنایہ ہو تو طلاق واقع ہونے کے لئے نیت شرط ہے جیسا کہ عربی زبان میں کنایہ کے الفاظ کے استعمال میں بھی یہ شرط ہے۔

۲۔ شوہر نے اپنی بیوی سے کہا: مجھے تجھ سے طلاق، اگر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت کی ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی، اگر نیت نہیں ہے تو طلاق نہیں ہوگی کیوں کہ یہ لفظ صریح سے کنایہ ہو گیا ہے کیوں کہ اس کی اضافت غیر محل کی طرف کی گئی ہے یعنی شوہر بیوی کو طلاق دیتا ہے، بیوی شوہر کو نہیں، اس وجہ سے طلاق واقع ہونے کے لئے کنایہ میں جس طرح طلاق کی نیت رکھنی ضروری ہے یہاں پر بھی ضروری ہے۔

۳۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم کو طلاق، تم کو طلاق، تم کو طلاق۔ اگر ان جملوں

کے درمیان اتنی خاموشی ہو کہ عرف میں اس کو فاصل سمجھا جاتا ہو تو تین طلاق واقع ہو جائے گی اور اس کی یہ بات قبول نہیں کی جائے گی کہ میں نے تاکید کے لئے تین مرتبہ کہا ہے، کیوں کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، اگر ان جملوں میں کوئی فاصل نہ ہو اور اس نے تاکید کی نیت کی ہو تو ایک طلاق واقع ہوگی، اگر تین طلاق کی نیت کرے تو تین طلاق ہوگی، اگر مطلقاً کہے اور تین یا ایک میں سے کسی کی نیت نہ کرے تو بھی تین طلاق ہوگی، کیوں کہ لفظ کے ظاہر سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔

۴۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے کہے: اگر اللہ نے چاہا تو تم کو طلاق: اگر اس نے اللہ کی مشیت سے طلاق کو معلق کرنے کا ارادہ کیا ہو تو طلاق نہیں ہوگی کیوں کہ اللہ کی مشیت معلوم نہیں ہے، اگر مشیت الٰہی سے معلق کرنا مقصود نہ ہو بلکہ اس سے تبرک مقصود ہو یا کچھ بھی مقصود نہ ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

۵۔ اگر بیوی اپنے شوہر کو برے الفاظ سے مخاطب کرے مثلاً کہے: اے بیوقوف! اے کمینے۔ اس پر شوہر بیوی سے کہے: اگر میں تمھارے کہنے کی طرح ہوں تو تمھیں طلاق۔

اگر اس سے مقصود بیوی کو بری بات سنا کر بدلہ دینا ہو اور طلاق کے ذریعے اس کو غصہ دلانا ہو جیسا اس نے گالی کے ذریعے اس کو غصہ دلایا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی، چاہے وہ بیوقوف نہ ہو اور نہ کمینہ ہو، گویا اس نے اپنی بیوی سے کہا: اگر میں تمھارے دعوے کے مطابق بیوقوف یا کمینہ ہوں تو تمھیں طلاق۔

اگر اس نے طلاق کو بیوقوفی اور کمینگی کی موجودگی پر معلق کیا ہو یا مطلقاً کہا ہو اور کوئی بھی چیز مراد نہ لیا ہو تو اس کا حکم معلق طلاق کی طرح ہوگا، اگر وہ بیوقوف یا کمینہ نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر ہے تو طلاق واقع ہوگی۔

رجوع کے احکام ومسائل

جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کوئی صورت ہوگی:

۱۔ جماع سے پہلے بیوی کو طلاق دے۔

۲۔ خلع کی صورت میں طلاق دے چاہے جماع سے پہلے ہو یا جماع کے بعد۔
۳۔ جماع کے بعد ایک یا دو عادی طلاق دے۔
۴۔ تین طلاق دے۔

ان صورتوں میں طلاق ہوتی ہے، ہم ان میں سے ہر حالت میں رجوع کے احکام کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

۱۔ جماع سے پہلے طلاق دے

شوہر اپنی بیوی سے جماع کرنے سے پہلے اس کو طلاق دے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور اس کو رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا ہے اور عورت پر کوئی عدت بھی نہیں ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "**يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا**" (احزاب ۴۹) اے ایمان والوں! اگر تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو چھونے (جماع کرنے) سے پہلے طلاق دو تو تمھارے لیے ان پر عدت نہیں ہے کہ وہ عدت گزاریں۔

اسی وجہ سے یہ طلاق بائن ہو جاتی ہے۔

اگر جماع سے پہلے ایک طلاق یا دو طلاق دے تو یہ عورت اس کے لئے نئے نکاح اور نئے مہر کے بغیر حلال نہیں ہوتی اور اس کے لئے لڑکی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔

اگر اس کو تین طلاق دے تو اس صورت میں یہ عورت اس کے لئے حلال ہو جاتی ہے جب اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص شادی کرے اور یہ دوسرا شوہر اس کے ساتھ جماع کرے پھر اس کو طلاق دے اور عورت اس کی عدت گزارے، پھر پہلا شوہر اس کے ساتھ نئے مہر پر شادی کرسکتا ہے۔

۲۔ جب لڑکی مال دے کر خلع لے

اگر بیوی اپنے شوہر سے خلع لے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور شوہر کے لئے اس سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ وہ نئے سرے سے اس کے ساتھ شادی کرسکتا ہے جیسے کوئی نیا

شوہر ہو، چاہے خلع جماع سے پہلے ہو یا جماع کے بعد۔

۳۔ جماع کے بعد ایک یا دو طلاق دے

اگر شوہر اپنے بیوی سے جماع کرنے کے بعد ایک یا دو طلاق دے تو کسی شرط کے بغیر رجوع کرنا جائز ہے، صرف شوہر کی خواہش کافی ہے، البتہ صرف یہ شرط ہے کہ بیوی کی عدت ختم نہ ہوئی ہو، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا'' (سورہ بقرہ ۲۲۸) اور ان کے شوہر ان کو اس میں (عدت کے دوران) لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں اس کے بدلے جو انھوں نے اصلاح کا ارادہ کیا ہے۔

اللہ کا یہ بھی فرمان ہے: ''الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ'' (بقرہ ۲۲۹) طلاق دو مرتبہ ہے، پھر اس کے بعد بھلے طریقے پر روکے رکھنا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

طلاق کے بعد بھلائی کے ساتھ روکنا رجوع کی بنیاد پر ہی ہوگا۔

اس کی دلیل حدیث شریف میں ہے، امام ابو داود (الطلاق ۲۲۸۳) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دیا پھر اس سے رجوع کیا۔

رجوع کرنے کا طریقہ

اپنے نکاح کے دائرے میں واپس لانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے کہے: میں تم کو اپنے نکاح میں واپس لیتا ہوں۔

اپنی اس بات پر دو افراد کو گواہ بنانا مستحب ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ'' (الطلاق ۲) اور اپنے میں سے دو عادل لوگوں کو گواہ بناؤ۔

اگر رجوع کرے تو وہ عورت بقیہ طلاق کے ساتھ اس کے پاس واپس ہوگی، اگر ایک

طلاق دیا ہے تو دو طلاق باقی رہے گی، اگر دو طلاق دیا ہے تو صرف ایک طلاق باقی رہے گی۔

اگر عدت گزرنے سے پہلے رجوع نہ کرے تو وہ بائنہ ہو جائے گی ،اس وقت اس عورت کے حلال ہونے کے لئے مہر اور نیا نکاح ضروری ہے ،اسی طرح عورت کی رضامندی بھی، گویا یہ نیا شوہر ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے:"وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَن يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ "(سورہ بقرہ ۲۳۲) اور جب تم بیویوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو تم ان کو مت روکو کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ شادی کرلیں جب وہ اپنے درمیان بھلے طریقے پر راضی ہو جائیں۔

جب تک عورت سے اس کے پہلے شوہر کو رجوع کا حق ہے تو اس کے لئے اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق نہیں ہے۔

۴۔ جب تین طلاق دے

اگر شوہر اپنی بیوی کو تین طلاق دے چاہے الگ الگ یا ایک ہی لفظ سے تین طلاق، چاہے طلاق جماع سے پہلے ہو یا جماع کے بعد تو بیوی بائنہ ہو جاتی ہے اور اس سے رجوع کا کوئی حق شوہر کو نہیں رہتا، چاہے عدت کے دوران ہو یا عدت کے بعد، نئے نکاح کے لیے پانچ شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ وہ اپنے پہلے شوہر کی عدت گزارے۔

۲۔ یہ عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا دوسرے شخص سے نکاح صحیح ہو۔

۳۔ دوسرا شوہر اس کے ساتھ جماع کرے۔

۴۔ یہ شوہر اس کو طلاق دے یا اس کا انتقال ہو جائے۔

۵۔ دوسرے شوہر کی عدت گزارے۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد پہلا شوہر اس سے رجوع کرنا چاہے تو عورت

کی رضامندی کے بعد ہی نیا نکاح نئے مہر سے کرنا جائز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے
:"فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ، وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ" (سورہ بقرہ ۲۳۰) پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو وہ اس کے لیے ابھی حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے مرد سے شادی کرے، پس اگر وہ اس کو طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوبارہ شادی کرلیں اگر وہ یہ گمان کرلیں کہ وہ اللہ کے حدود کا پاس ولحاظ رکھیں گے، اور یہی اللہ کے حدود ہیں جن کو وہ جاننے والوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے۔

امام بخاری (الشھادات ۲۴۹۶) اور امام مسلم (النکاح ۱۴۳۳) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کیا ہے کہ رفاعہ قرظی کی بیوی نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا: میں رفاعہ کے پاس تھی، انھوں نے مجھے طلاق دیا تو تین طلاق دیا، پھر میں نے عبدالرحمن بن زبیر سے شادی کی، اس کے پاس تو صرف کپڑے کے کنارے کی طرح ہے (یعنی ان کے عضو تناسل میں کچھ طاقت نہیں ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟ نہیں، اس وقت تک نہیں جب تک تم اس سے لذت کو نہ چکھو اور وہ تم سے لذت حاصل نہ کرے" (یہاں حضور ﷺ نے جماع کی لذت کو شہد کی لذت سے تشبیہ دی ہے)

ان شرطوں کی حکمت

ان تمام شرطوں کی حکمت یہ ہے کہ تین طلاق سے نفرت دلائی جائے اور اس کے ذریعے شوہروں کو اس کی ترغیب دی جائے کہ وہ تین طلاق کے دلدل میں نہ پھنسیں۔

رجعت کے احکام کا خلاصہ

جو مطلقہ اپنے شوہر کے پاس واپس جاسکتی ہے، اس کو رجعیہ کہا جاتا ہے، جب اس کو جماع کے بعد عدت گزرنے سے پہلے ایک یا دو طلاق دی جائے۔

رجعت کا حکم: سابقہ نکاح اور مہر ہی سے شوہر کو صرف اپنی رضامندی سے اپنی بیوی

سے رجوع کرنا جائز ہے۔

بائنہ صغری

۱۔جس کو جماع سے پہلے ایک یا دو طلاق دیا گیا ہو۔

۲۔جس کو جماع کے بعد ایک یا دو طلاق دیا گیا ہو اور اس کی عدت گزر چکی ہو۔

۳۔عورت نے خلع لیا ہو۔

اس کا حکم: ان صورتوں میں نیا مہر دے کر نیا نکاح کرنا ضروری ہے، اور عورت کی رضامندی بھی لازم ہے۔

بائنہ کبریٰ:

وہ ہے جس کو شوہر تین طلاق دے، چاہے جماع سے پہلے ہو یا جماع کے بعد۔

اس کا حکم یہ ہے کہ یہ عورت اس کے لئے اسی صورت میں جائز ہوتی ہے جب کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شادی کرے اور مذکورہ بالا تمام مراحل سے وہ عورت گزرے۔

طلاق کے مشابہ امور

تین ایسے مسائل ہیں جو اپنے نتائج واثرات میں طلاق کے مشابہ ہیں یا وہ طلاق کے نتیجے تک پہنچتے ہیں، یہ مسائل ہیں: ایلاء، ظہار اور لعان۔

۱۔ ایلاء

ایلاء کی تعریف:

ایلاء "**الألية**" سے مشتق ہے جس کے معنی قسم کے ہے، کہا جاتا ہے: "آل فلان" یعنی فلاں نے قسم کھائی، اس معنی میں اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: "**وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ**" (نور۲۲) یعنی تم میں سے فضل اور وسعت والے قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتے داروں اور مساکین کو نہیں دیں گے۔

ایلاء کے اصطلاحی معنی: ایلاء یہ ہے کہ طلاق کا حق رکھنے والا شوہر اس بات کی قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے جماع نہیں کرے گا، یہ قسم مطلقاً کھائے یا چار مہینوں سے زیادہ جماع نہ کرنے کی قسم کھائے۔

ایلاء کا حکم

اگر شوہر اپنی بیوی سے مطلقاً جماع نہ کرنے یا چار ماہ سے زیادہ مدت جماع نہ کرنے کی قسم کھائے تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا، اس صورت میں شوہر پر مندرجہ ذیل شرعی احکام نافذ ہوتے ہیں:

حاکم اس کو اسی وقت چار مہینے کی مہلت دے گا جس وقت اس نے اپنی بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھائی ہو، یہ اس کے لئے موقع ہوگا کہ اس مدت کے دوران وہ اپنی قسم سے رجوع کرے اور اس کا کفارہ ادا کرے یا رجوع کرنے اور کفارہ دینے کا ارادہ نہ ہو تو اس کو طلاق دے۔

اگر چار مہینے گزر جائیں اور وہ اپنی قسم کی پابندی کر رہا ہو تو وہ اپنی بیوی کو نقصان پہنچانے والا ہوگا، اس صورت میں بیوی کی درخواست پر حاکم شوہر کو دو میں سے ایک چیز کا پابند بنائے گا:

۱۔ وہ اپنی قسم سے رجوع کرے اور اپنی بیوی سے جماع کرے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اگر اس نے اللہ کی قسم کھائی ہو یا اللہ کی کسی صفت کی قسم کھائی ہو، یا کسی کام کو کرنے یا کوئی صدقہ کرنے کی قسم کھائی ہو تو اس کو پورا کرے۔

۲۔ اگر اپنی قسم پر مصر ہو تو طلاق دینے کے لئے کہے: اگر شوہر انکار کرے اور دو میں سے کسی حکم کو قبول نہ کرے تو قاضی اپنی طرف سے ایک طلاق دے گا، کیوں کہ دوسروں سے نقصان کو رفع کرنے کے لئے یہ حق اس کے پاس آیا ہے اور اس کا راستہ صرف طلاق دینا ہی ہے، اس میں نیابت ہو جائے گی جیسے قرض کی ادائیگی اور عینی حقوق کی ادائیگی وغیرہ میں ہوتا ہے۔

یہ اختیار قاضی کو اس وقت ہے جب شوہر جماع کرنے سے معذور نہ ہو، اگر کسی بیماری یا کسی دوسرے سبب کی وجہ سے جماع کرنے سے معذور ہو تو اس سے اپنی زبان سے ایلاء سے رجوع کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا، مثلاً وہ کہے: جب میں جماع پر قادر ہو جاؤں گا

تو میں اپنی پابندی اور قسم سے رجوع کرلوں گا۔

ایلاء کے احکام کی دلیل

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاؤُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' (بقرۃ ۲۲۶۔۲۲۷) ان لوگوں کے لیے چار مہینوں کا انتظار ہے جو اپنی بیویوں سے ایلا کریں، پس اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ بڑا معاف فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے، اگر وہ طلاق کا ارادہ کریں تو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''موطا'' (الطلاق ۵۵۶/۲) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے: جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ایلاء کرے تو اس کی طلاق نہیں ہوتی، اگر چار مہینے گزر جائیں تو اس کو روکا جائے گا یہاں تک کہ وہ طلاق دے یا رجوع کرلے۔

اسی معنی کی روایت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کی گئی ہے۔

اس طرح کا حکم رائے سے نہیں دیا جاتا، اسی وجہ سے یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے۔

۲۔ ظہار

ظہار لفظ ظھــر (پیٹھ) سے ماخوذ ہے، کیوں کہ اس کی اصل شکل یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: تم میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔

ظہار کے اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو حرمت میں اپنے کسی محرم مثلاً اپنی ماں یا بہن کے مشابہ قرار دے۔

جاہلیت کے زمانے میں عرب ظہار کو طلاق کا ایک طریقہ سمجھتے تھے، لیکن اسلامی شریعت نے اس کو دوسرا اعتبار دیا ہے اور طلاق کے علاوہ دوسرے احکام بیان کئے ہیں۔

حلال وحرام ہونے کے اعتبار سے ظہار کا حکم

ظہار مسلمانوں کے اجماع اور اتفاق سے حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہ ہے، کیوں کہ اللہ تبارک وتعالٰی نے اس کو منکرات اور جھوٹ کہا ہے: "وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَراً مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْراً" (مجادلہ۲) اور بے شک وہ منکر بات کہتے ہیں اور جھوٹی۔

ظہار کے الفاظ

ظہار پر دلالت کرنے کے اعتبار سے اس کے الفاظ دو قسم کے ہیں: صریح اور کنایہ

صریح لفظ وہ ہے جس میں ظہار کے علاوہ دوسرے کسی معنی کا احتمال نہ ہو مثلاً اپنی بیوی سے کہے: تم میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو یا تم میرے پاس میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو، اگر وہ یہ بات کہے تو اپنی بیوی سے ظہار کرنے والا ہو جائے گا، چاہے اس میں ظہار کی نیت پائی جائے یا نہ پائی جائے، جب یہ لفظ اس شخص کی زبان سے ادا ہو جس سے طلاق صحیح ہوتی ہو یعنی وہ عاقل اور بالغ وغیرہ ہو۔

کنایہ وہ ہے جس میں ظہار اور اس کے علاوہ دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو مثلا وہ اپنی بیوی سے کہے: تم میرے نزدیک میری ماں اور بہن کی طرح ہو۔ یا کہے: تم میرے لئے میری ماں اور بہن کی طرح ہو۔

اگر اس طرح کے الفاظ کہے تو اس سے شوہر نے جو معنی مراد لیا ہے وہی مراد لیا جائے گا۔

اگر اس سے ظہار مراد لیا ہے تو ظہار ہوگا، اگر اس نے عزت اور قدر دانی میں اس کو اپنی ماں اور بہن کے مشابہ قرار دینے کا ارادہ کیا ہے تو وہ ظہار کرنے والا نہیں ہوگا اور اس پر ظہار کا کوئی حکم نافذ نہیں ہوگا۔

ظہار کے احکام

اگر شوہر نے ظہار کا صریح لفظ کہا ہو یا کنایہ کا استعمال کیا ہو اور اس سے ظہار کا ارادہ کیا ہو تو دیکھا جائے گا:

۔اگر اپنی اس بات کے بعد طلاق دے تو ظہار کا حکم طلاق میں شامل ہو جائے گا اور اس ظہار کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا گویا اس نے لفظ ظہار کی تشریح طلاق سے کر دی جس کی وجہ سے ظہار کا حکم ختم ہو جائے گا اور طلاق واقع ہو جائے گی۔

۔اگر ظہار کے بعد طلاق نہ دے اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جس سے نکاح ٹوٹ جاتا ہو تو اس کو اپنی بات کا مخالف شمار کیا جائے گا، کیوں کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت سے جدا نہ کرنا (جب کہ اس نے حرمت میں اس کو اپنے محارم سے مشابہ قرار دیا ہے) اس تشبیہ کی مخالفت مانا جائے گا اور اس کے تقاضے کے خلاف تصور کیا جائے، اس صورت میں اس پر کفارہ لازم ہو جاتا ہے جس کو فوراً نکالنا ضروری ہے۔

ظہار کا کفارہ

ظہار کا کفارہ امکان اور طاقت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ لازم ہو جاتا ہے:

۱۔کمائی اور کام میں خلل ڈالنے والے عیوب سے پاک ایک مومن غلام یا باندی کو آزاد کرنا مثلاً بہت زیادہ کمزوری یا کسی عضو؛ پیر وغیرہ کا نہ پایا جانا۔

۲۔اگر غلام نہ پائے جائیں جیسے ہمارا زمانہ ہے یا غلام موجود ہوں، لیکن اس کی خریداری سے عاجز ہو تو مسلسل دو اسلامی مہینے روزے رکھے گا۔

۳۔اگر روزے نہ رکھ سکتا ہو یا بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے مسلسل روزے رکھنے کی سکت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو اپنے شہر کی عمومی غذا کھلائے گا، ہر مسکین کو ایک مد۔

کفارہ کی ترتیب کی دلیل

اس کے دلائل کی حدیثیں ظہار کے احکام میں آئیں گی، امام ترمذی (الطلاق ۱۲۰۰) وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ سمعان بن صخر انصاری (بنو بیاضہ کے ایک فرد) نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کے مشابہ کہا، یہاں تک کہ رمضان کا مہینہ گزرنے لگا، جب آدھا رمضان گزر

گیا تو اس نے رات کے وقت اپنی بیوی سے جماع کیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے اس کا تذکرہ کیا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ایک غلام یا باندی آزاد کرو۔ اس نے کہا: میرے پاس نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: مسلسل دو مہینے روزے رکھو۔ اس نے کہا: مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فروہ بن عمرو سے کہا: یہ عرق (برتن) اس کو دے دو، اس برتن میں ۱۵ یا ۱۶ اصاع غلہ آتا ہے جو ساٹھ مسکینوں کے لئے کھانا ہے۔

ظہار کا کفارہ فوراً نکالا جائے گا

ظہار کا کفارہ فوراً نکالنے کا شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا یعنی مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت میں کفارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جماع کرنا جائز نہیں ہے، اگر اپنی بیوی سے کفارہ کی ادائیگی سے پہلے جماع کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا اور اس پر کفارہ بھی لازم آئے گا، کیوں کہ کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع کرنا حرام ہے۔ اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "مِنْ قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا" (مجادلہ ۳) قبل اس کے کہ جماع کریں۔

امام ترمذی (الطلاق ۱۱۹۹) اور ابن ماجہ (الطلاق ۲۰۶۵) وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جس نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تھا اور اس سے جماع بھی کرلیا تھا، اس نے کہا: اللہ کے رسول! میں نے اپنی بیوی سے ظہار کیا پھر میں نے کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس کے ساتھ جماع کرلیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا اللہ تم پر رحم فرمائے؟ اس نے کہا: میں نے چاندنی روشنی میں اس کے پازیب دیکھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت تک اس کے قریب مت جاؤ جب تک تم اللہ کا حکم پورا نہ کرلو۔

ظہار کے عمومی احکام کی دلیل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اوس بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیوی اپنے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: اللہ کے رسول! اس نے میری جوانی کو کھالیا اور میں نے اس کے لیے اپنا پیٹ پھیلایا، یہاں تک کہ

جب میں بوڑھی ہوگئی اور بچہ ہونا بند ہوگیا تو اس نے مجھ سے ظہار کیا، اے اللہ! میں تیرے پاس شکایت کرتی ہوں تھوڑی ہی دیر میں جبرئیلؑ ان آیتوں کو لے کر اترے ''قد سمع اللہ'' (ابن ماجہ: الظہار (۲۰۶۳) ابوداود: الظہار (۲۲۱۴، حاکم التفسیر ۲/ ۴۸۱)

یہ آیات سورۃ المجادلہ کی ہیں:

''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ، اَلَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَائِهِمْ مَاهُنَّ اُمَّهَاتِهِمْ اِنْ اُمَّهَاتُهُمْ اِلَّا الّٰئِيْ وَلَدْنَهُمْ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا، اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ، وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ أَلِيْمٌ '' (مجادلہ ۱۔۴) اللہ نے اس کی بات سن لی ہے جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ کے پاس شکایت کر رہی تھی، اور اللہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا ہے، بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے، تم میں سے جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے، بے شک وہ منکر اور جھوٹی بات کہتے ہیں، بے شک اللہ معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے، اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی بات سے رجوع کرتے ہیں تو ایک غلام یا باندی کو آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں ملیں، تم کو اس کا پابند بنایا جاتا ہے، اور اللہ تمھارے اعمال سے باخبر ہے، پس جس میں استطاعت نہ ہو تو مسلسل دو مہینوں کے روزے رکھنا ہے قبل اس کے کہ دونوں ملیں، پس جس میں استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھلانا ہے، یہ سب اس لیے؛ تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور یہ اللہ کے حدود ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۳۔لعان

لعان کی تعریف:

لعان کے معنی دھتکارنے اور دور کرنے کے ہیں:

اس سے یہ جملہ لعنه الله استعمال ہوتا ہے یعنی اللہ نے اس کو دھتکار دیا اور دور کردیا۔

اس کو لعان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شوہر بیوی ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں۔

لعان کے شرعی معنی یہ ہے: چند متعین کلمات جو اس عورت پر الزام لگانے پر مجبور شخص کے لئے حجت ہے جس نے اس کا بستر خراب کردیا ہو اور اس پر عار اور عیب لگایا ہو۔

اس کو لعان اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ کلمات لعنت کے لفظ پر مشتمل ہیں اور لعان کرنے والے میاں بیوی ایک دوسرے سے لعان کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

لعان مشروع کرنے کی حکمت:

"قذف" (زنا کا الزام لگانا) کے عمومی حکم کے تقاضے کے خلاف لعان کا حکم ہے کہ عورت پر زنا کا الزام لگانے والا حد کا مستحق نہیں ہوتا ہے اور جس پر الزام لگایا گیا ہے وہ بھی بری ہوجاتا ہے۔

اس مخالفت کی وجہ کیا ہے؟ اور اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے والے شخص پر بھی وہی حد نا قذ کیوں نہیں ہوتی جو حد عورت پر زنا کا الزام لگانے والے پر ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر کے علاوہ دوسرا شخص کسی کو بھی زنا کا الزام دینے پر مجبور نہیں ہوتا، چاہے وہ اس میں سچا ہو یا جھوٹا۔

بلکہ اسلامی ادب یہ ہے کہ مسلمان دوسروں کے عیوب کو چھپائے اور ان کو لوگوں سے الگ لے جا کر تنہائی میں نصیحت کرے۔ جہاں تک بیوی کی نسبت شوہر کا تعلق ہے تو وہ اپنی بیوی کی حقیقت اور زنا کے ارتکاب میں اس کی حقیقت حال کو واضح اور منکشف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کیوں کہ بیوی کے زنا کرنے کی وجہ سے اس کا بستر خراب ہوجاتا ہے اور اس پر عار لاحق ہوجاتا ہے، یہ شرعی عذر ہے جو اس کو بیوی سے جدا ہونے کا حق دیتا ہے۔

اگر وہ عورت سے طلاق کے ذریعہ جدا ہوتا ہے تو وہ خود سے دوسرے ظلم میں پڑ جائے گا، وہ ہے پورے مہر کی ادائیگی، جب کہ وہ اپنے برے سلوک کی وجہ سے تھوڑے سے بھی مہر کی مستحق نہیں رہتی ہے۔

اس وجہ سے مرد کو انصاف دلانے کے لئے ضروری تھا کہ اس حالت کے لیے مخصوص حکم مشروع کیا جائے تا کہ عدالت کے پہلو میں دونوں میاں بیوی کے حق کی ضمانت ہو اور کوئی بھی دوسرے کے ظلم کا شکار نہ ہو۔

یہ حکم لعان کا ہے، جس کی تھوڑی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

شوہر بیوی پر اسلامی شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زنا کا الزام لگائے تو اس پر حد نہیں نافذ ہوتی، کیوں کہ زنا کا الزام لگانے والے پر ایک پہلو سے جھوٹا الزام لگانے کی وجہ سے اور دوسرے پہلو سے مسلمان کی ستر پوشی پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے حد نافذ کی جائے گی۔

جب کہ شوہر اپنی بیوی پر جھوٹا الزام لگانے سے سب سے زیادہ اجتناب کرتا ہے کیوں کہ اس جھوٹ کی وجہ سے وہ عار کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی شہرت داغ دار ہو جاتی ہے اور اپنی بیوی کی ستر پوشی نہ کرنے میں وہ معذور ہے، کیوں کہ عورت کی ستر پوشی میں بھی اس پر عار ہے اور اس کی مروءت اور لوگوں کے درمیان حسن سیرت کو ختم کرنے والی ہے۔

بیوی پر زنا کا الزام لگانے کا حکم:

قذف یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے، اگر اس کو بیوی کے زنا کا علم ہو جائے یا ظن غالب ہو تو اس پر الزام لگانے کا حق ہے، مثلاً کسی مرد سے زنا ظاہر ہو جائے اور ان دونوں کو تنہائی میں دیکھ لے، بیوی پر زنا کا الزام لگانے کا حکم اس وقت ہے جب بچہ نہ ہو، اگر بچہ ہو اور شوہر جانتا ہو کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے تو اس حالت میں اپنی بیوی پر الزام لگانے کے ساتھ بچے کو خود سے نفی کرنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ بچہ کی نفی نہ کرنے سے اس کو خود سے منسوب کرنا

ضروری ہو جاتا ہے اور جو اس کا بچہ نہیں ہے اس کو خود سے منسوب کرنا حرام ہے، جس طرح اپنے بچے کی خود سے نفی کرنا بھی حرام ہے، لیکن اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

اس کو جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے جماع نہ کیا ہو یا اس کی بیوی کو جماع کرنے سے چھ مہینے کی مدت میں بچہ ہو جائے جو حمل کی کم سے کم مدت ہے، ان حالتوں میں ثابت ہو جاتا ہے کہ بچہ اس شوہر کا نہیں ہے، اس وقت بچہ کی خود سے نفی کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی طرف بچہ کو منسوب نہ کیا جائے۔

شوہر کے لعان کرنے کا طریقہ:

اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو اس پر حد قذف نافذ ہو جاتی ہے، مگر یہ کہ وہ ''بینہ'' قائم کرے: بینہ چار گواہ ہیں جن میں شوہر بھی شامل ہے۔

عورت پر زنا کا الزام لگانے کا یہ عمومی حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلال بن امیہؓ سے فرمایا جب انھوں نے اپنی بیوی پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے زنا کا الزام لگایا: ''یا تو بینہ پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر کوڑے لگیں گے''۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے، میں سچا ہوں، اس لیے اللہ ضرور ایسی آیت نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ کو حد سے بری کر دے گی۔

اس وقت لعان کا حکم نازل ہوا، یہ وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ شوہر حد قذف سے بچ جاتا ہے اب سوال یہ ہے کہ لعان کا طریقہ کیا ہے۔

لعان یہ ہے کہ شوہر حاکم کے پاس لوگوں کے مجمع میں کہے: ان لوگوں میں سربرآوردہ اور صالحین کا رہنا مسنون ہے، اسی طرح مسجد میں بلند جگہ مثلاً منبر وغیرہ پر کھڑے ہونا مسنون ہے، وہ کہے: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جو زنا کا الزام میں نے اپنی بیوی فلاں پر لگایا ہے اس میں سچا ہوں اور یہ بچہ (اگر بچہ موجود ہو یا حاملہ ہو) زنا سے ہے اور یہ مجھ سے نہیں ہے۔

یہ بات چار مرتبہ کہے گا، ہر مرتبہ اپنے ہاتھ سے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرے گا اگر بیوی وہاں موجود ہو۔

حاکم کی طرف سے اس کو نصیحت کرنے کے بعد اور جھوٹ سے چوکنا کرنے کے بعد پھر پانچویں مرتبہ کہے گا: اگر میں جھوٹوں میں سے ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

لعان کی دلیل

شوہر کی طرف سے لعان کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

"اَلَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصَّادِقِيْنَ، وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ" (سورۃ النور ۷-۶) جو اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں اور ان کے پاس گواہ نہیں رہتے ہیں سوائے اپنی جانوں کے تو ان میں سے ایک کی گواہی اللہ کا نام لے کر چار گواہیاں ہیں کہ وہ سچوں میں سے ہے اور پانچویں گواہی یہ ہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

امام بخاری (الطلاق ۵۰۰۳) اور امام مسلم (العان: ۱۴۹۲) نے حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت کیا ہے کہ انصار کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شخص کو دیکھے تو کیا وہ اس کو قتل کردے یا کیا کرے؟ اللہ عزوجل نے اسی کے سلسلہ میں لعان کی آیتیں نازل فرمائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے سلسلہ میں فیصلہ کردیا ہے"۔ راوی کہتے ہیں کہ ان دونوں نے مسجد میں لعان کیا اور میں گواہ ہوں۔

دوسری روایت میں ہے: چنانچہ ان دونوں نے لعان کیا، جب میں لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا۔

شوہر کے لعان کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے احکام:

جب شوہر مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق اپنی بیوی کے خلاف لعان کرے تو پانچ احکام مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ شوہر سے زنا کے الزام کی حد ساقط ہوجاتی ہے۔

۲۔ بیوی پر زنا کی حد واجب ہو جاتی ہے، مگر وہ بھی لعان کرے۔
۳۔ دونوں کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔
۴۔ بچے کا نسب شوہر سے منقطع ہو جاتا ہے، اگر وہ اپنے لعان میں اس کی نفی کرے اور اس کا نسب بیوی کے ساتھ ملایا جائے گا۔
۵۔ ہمیشہ کے لئے میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جاتے ہیں۔

امام بخاری (الطلاق ۵۵۵۹) اور امام مسلم (اللعان: ۱۴۹۴) نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کروایا تو اس شخص نے بیوی کے بچے سے نفی کی تو آپ ﷺ نے ان کے درمیان جدائی کرائی اور بچہ عورت کے حوالے کیا۔

امام ابو داود (الطلاق: ۲۲۵۰) نے حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: لعان کرنے والوں میں سنت یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرائی جائے گی پھر وہ کبھی بھی جمع نہیں ہوں گے (یعنی ان کی آپس میں شادی کبھی بھی نہیں ہو سکتی)

بیوی کے لعان کا طریقہ

شوہر کے لعان سے اس سے قذف کی حد ساقط ہو جاتی ہے، اسی طرح عورت جب لعان کرتی ہے تو اس سے زنا کی حد ساقط ہو جاتی ہے جو حد شوہر کے لعان کی وجہ سے اس پر لازم ہو گئی ہے۔

بیوی کے لعان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہے گی:

میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ فلاں جس نے مجھ پر زنا کا الزام لگایا ہے جھوٹا ہے۔ یہ بات وہ چار مرتبہ کہے گی۔ پھر پانچویں مرتبہ کہے گی: اگر وہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو۔ جب وہ یہ بات کہے گی تو اس سے زنا کی حد ساقط ہو جاتی ہے۔

بیوی کے لعان کی دلیل:

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ

أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ ، وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ "(نور ۸۔۹) اورعورت سے یوں سزا ٹل جائے گی کہ وہ اللہ کا نام لے کر چار گواہیاں دے کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں گواہی یہ ہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ (مرد) سچوں میں سے ہے۔

لعان کی شرطیں:

لعان کے صحیح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔لعان سے پہلے شوہر بیوی پر الزام لگائے۔

۲۔بیوی کے لعان سے پہلے شوہر لعان کرے۔

۳۔میاں بیوی دونوں کو مذکورہ بالا کلمات کی ہو بہو پابندی کرنا ضروری ہے، اگر دونوں میں سے کوئی ''گواہی'' کے لفظ کو بدل کر ''قسم کھاتا ہوں'' وغیرہ کہے یا غضب کے لفظ کے بجائے ''لعنت'' کا لفظ استعمال کرے یا لعنت کے بجائے غضب کا لفظ تو لعان صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ لعان کے الفاظ صریح طور پر اللہ عزوجل کی کتاب میں آئے ہیں، اسی وجہ سے لعان کے صیغے کی پابندی کرنا ضروری اور لازم ہے۔

۴۔شوہر ہو یا بیوی جو پانچ گواہیاں دیتے ہیں ان میں تسلسل اور پے در پے ہونا ضروری ہے، چنانچہ اتنا وقفہ ہونا جائز نہیں ہے جس کو عرف میں وقفہ کہا جائے۔

۵۔حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ میاں بیوی دونوں کو نصیحت کرے اور جھوٹ اور اس کی سزا سے ڈرائے اور ان دونوں سے کہے: تمہارا حساب اللہ پر ہے، تم میں سے ایک جھوٹا ہے، کیا تم میں سے کوئی توبہ کرتا ہے۔

امام ترمذی (الطلاق ۱۲۰۲) نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو بلایا اور اس کے سامنے آیتیں تلاوت کی اور اس کو نصیحت کی اور تذکیر کی اور اس کو بتایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ اس نے کہا: نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے! میں نے سچ کہا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: چنانچہ آپ نے مرد سے شروع کیا تو اس نے چار مرتبہ گواہی دی کہ وہ سچوں میں سے ہے اور پانچویں مرتبہ کہا کہ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

پھر عورت سے کہا تو اس نے اللہ کو گواہ بنا کر چار گواہیاں دی کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں مرتبہ کہا کہ اگر وہ سچوں میں سے ہے تو اس پر اللہ کا غضب ہو۔ پھر آپ نے ان دونوں کے درمیان جدائی کرائی۔

بخاری کی روایت (الطلاق ۵۰۰۶) میں ہے کہ نبی ﷺ نے ان دونوں سے کہا: تمہارا حساب اللہ پر ہے۔ تم میں سے ایک جھوٹا ہے، تمہارے لئے اس (عورت) پر کوئی راہ نہیں ہے۔ (یعنی پھر اس سے شادی ہی نہیں کرسکتی ہے)

امام بخاری (الطلاق ۵۰۰۱) نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ بلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا، پھر وہ آئے اور انہوں نے گواہی دی جب کہ نبی ﷺ فرمارہے تھے: "اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے، کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے"۔

امام ابو داود (الطلاق ۲۲۶۳) وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا جب لعان کی آیت نازل ہوئی: "جو بھی عورت اپنے بچے کو ایسے لوگوں میں داخل کردے جو ان میں سے نہیں ہے تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اللہ اس کو اپنی جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا اور جو بھی مرد اپنے بچے کا انکار کرے جب کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اللہ اس سے روپوش ہوجاتا ہے اور اللہ اس کو اولین اور آخرین کے سامنے رسوا کردے گا۔

اللہ ہمیں دنیا اور آخرت میں اپنے لطف سے سرفراز فرمائے۔

عدت

عدت کی تعریف:

عدت "عدد" سے ماخوذ ہے، کیوں کہ یہ تعداد یعنی طہر اور مہینوں کی تعداد پر مشتمل ہے۔

عدت کے اصطلاحی معنی: ایک متعین مدت کا نام ہے جس کا عورت اللہ عزوجل کی عبادت یا شوہر پر سوگ یا رحم کے صاف ہونے کی تاکید کے لئے انتظار کرتی ہے۔

عدت کی مشروعیت کی دلیل

بہت سی آیتیں اور احادیث مبارکہ سے عدت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے مشروع ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

عدت کے احکام ومسائل پر گفتگو کے دوران قرآن اور حدیث کے دلائل سامنے آئیں گے جن سے عدت کے احکام کی تفصیلات معلوم ہوگی اور مسائل کی وضاحت ہوگی اور یہ عدت کے مشروع ہونے پر دلالت کریں گے۔

عدت مشروع کرنے کی حکمت

جہاں تک اس عورت کی عدت کا سوال ہے جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو تو اس کے لئے عدت مندرجہ ذیل معانی کی تکمیل کے لئے مشروع کی گئی ہے:

۱۔ اپنے متوفی شوہر کے ساتھ حق وفا نبھانا، کیوں کہ اللہ عزوجل نے عدت کو عورت کے حق میں اس لئے فرض کیا ہے تا کہ وہ اپنے متوفی شوہر کی قدر دانی کرے، اس کے ساتھ وفاداری کرے اور اس کے ساتھ حسن وسلوک کرے، صرف وفات پاتے ہی اس سے اعراض کرنا مناسب نہیں ہے۔

۲۔ جاہلی قدروں کے بدلے اس کو شروع کیا گیا ہے، جب کہ جاہلیت میں شوہر کے انتقال ہونے کی صورت میں بیوی کے لئے فرض تھا کہ وہ خود کو پورے ایک سال تاریک چھوٹے سے کمرے میں بند کردے اور اس مدت کے دوران سیاہ رنگ سے خود کو لیپے اور گندے سب سے خراب کپڑے پہنے۔

معاشرے میں موجود انتہا پسندانہ عادت کا خاتمہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اس کے متبادل کے طور پر صحیح سالم اور معتدل اصول کو لایا جائے، جس میں پہلی عادت کی اچھائیوں کو باقی رکھے اور اس کی برائیوں میں سے کوئی بھی چیز لوگوں کے لئے باقی نہ چھوڑے۔

نکاح فسخ ہونا یا طلاق کی وجہ سے جدائی:

اگر بیوی کو حیض آتا ہو یا حاملہ ہو تو اس کے حق میں عدت کو ضروری قرار دینے کی حکمت نسب کو محفوظ رکھنا اور ذمے داریوں کو تحفظ فراہم کرنا، رحم کے پاک وصاف ہونے کی تاکید کرنا ہے۔

اگر بیوی نابالغ ہو یا آئسہ ہو جس کو حیض نہ آتا ہو تو اس پر عدت واجب ہونے کی حکمت مندرجہ ذیل امور میں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ عبادت کی غرض سے عدت؛ جس میں اللہ عزوجل کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے، یہ درحقیقت اس کے حکم کے آگے سر جھکانے کے معنی ومطلب کے مناسب ہے اور عدت کی تمام قسموں میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔

۲۔ نکاح کو عظمت وفخامت عطا کرنا اور اس کے مناسب شرعی اہمیت اس کو دینا، یہ بات واضح ہے کہ اس عظمت واہمیت کے مناسب یہ نہیں ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی جدائی کے دوسرے دن ہی دوسرے شوہر کے پاس چلی جائے، چاہے وہ نابالغ یا آئسہ ہی کیوں نہ ہو جن کے رحم کے صاف ہونے کا یقین رہتا ہے، اتنی جلدی دوسرے شوہر کی طرف منتقلی سے نکاح کی اہمیت اور اس کی ہیبت ختم ہو جاتی ہے اور دل اور ذہن میں زنا اور اس کی شکل نمایاں ہوتی ہے کہ فاحشہ زانیہ عورت بغیر انتظار کے کس طرح ایک شخص سے دوسرے شخص

کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

۳۔رحم کے صاف ہونے کی تاکید کے لئے مزید احتیاط، کیوں کہ کبھی کبھار شاذ واقعات رونما ہونے کا امکان رہتا ہے۔

عدت کی قسمیں

۱۔شوہر کی وفات کی عدت

۲۔طلاق اور جدائی کی عدت

وفات کی عدت اس عورت پر واجب ہوتی ہے جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو

۱۔اگر وفات کے وقت وہ حاملہ ہو تو اس کی مدت وضع حمل (بچہ ہونا) ہے چاہے وضع حمل کی مدت طویل ہو یا مختصر۔

۲۔اگر عورت حاملہ نہ ہو یا اس کا یہ حمل وفات پائے ہوئے شوہر سے ہونا ممکن نہ ہو مثلاً اس کا شوہر بالغ نہ ہو یا چار سال سے زائد مدت سے زیادہ ساتھ نہ رہا ہو، اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے، چاہے شوہر نے اس کے ساتھ جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس کی دلیل

اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:''وَاُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ أَن يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ''(طلاق:۴) اور حاملہ کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضعِ حمل ہو جائے۔

اللہ کا یہ بھی فرمان ہے:''وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ''(بقرہ:۲۳۴) اور تم میں سے جن کی وفات ہو جائے اور وہ بیویوں کو چھوڑیں تو وہ چار ماہ دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں، پس جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو تم (ذمے داروں) پر کوئی گناہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں بھلے طریقے سے کرتی ہیں اور اللہ تمھارے کاموں سے باخبر ہے۔

ان دو آیتوں میں سے دوسری آیت حاملہ اور غیر حاملہ دونوں کو شامل ہے، پہلی آیت

میں اس عمومی حکم سے حاملہ عورتوں کو الگ کیا گیا ہے اور ان کے لئے مخصوص حکم بیان کیا گیا ہے، حاملہ اور غیر حاملہ کی عدت کے درمیان فرق کی یہی دلیل ہے۔

حاملہ کی عدت وضع حمل پر ختم ہوجاتی ہے، اس کی دلیل امام بخاری (الطلاق: ۵۰۱۴) کی حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہؓ نے اپنے شوہر کی وفات کے چند دنوں میں ہی بچہ جنا اور وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور نکاح کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت دی اور انہوں نے شادی کی۔

۲۔ جدائی کی عدت

جدائی یا تو فسخ نکاح سے ہوتی ہے یا طلاق سے اور جماع کے بعد، اس صورت میں بیوی پر مندرجہ ذیل عدت واجب ہے۔

۱۔ اگر وہ حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا عمومی حکم ہے: "وَاُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ أَن يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (طلاق: ۴) اور حاملہ کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضعِ حمل ہوجائے۔

۲۔ اگر وہ حاملہ نہیں ہے اور اس کو حیض آتا ہے تو اس کی عدت جدائی کے بعد تین طہر گذرنا ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَن يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ" (بقرہ: ۲۲۸) اور طلاق شدہ عورتیں اپنے آپ کو تین طہر تک روکے رکھیں گی اور ان کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحم میں پیدا فرمایا ہے، اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں۔

۳۔ اگر اس کو حیض نہیں آتا ہے مثلاً وہ نابالغ ہو یا حیض کی عمر سے تجاوز کرگئی ہو یعنی بوڑھی ہوگئی ہو تو اس کی عدت تین ماہ گذرنا ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے "وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ

نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ " (طلاق:۴)اور جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے مایوس ہوگئی ہیں اگر تم کو شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور ان کی بھی جنھیں ابھی حیض نہیں آیا ہے۔

جماع سے پہلے طلاق کی عدت:

فسخ یا طلاق کی وجہ سے جماع سے پہلے جدائی ہوجائے تو عورت پر کوئی عدت نہیں ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا" (احزاب ۴۹) اے ایمان والو! اگر تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو چھونے (جماع کرنے) سے پہلے طلاق دو تو تمھارے لیے ان پر عدت نہیں ہے کہ وہ عدت گزاریں۔

عدت کے احکام اور اس صورت میں عائد پابندیاں

عدت کی وجہ سے بعض احکام اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ہم ان کی ذیل میں علیحدہ علیحدہ تفصیلات بیان کررہے ہیں۔

ا۔طلاق کی عدت

ا۔اگر عورت اپنے شوہر سے طلاق کی عدت گذار رہی ہے تو وہ یا تو رجعیہ ہوگی یا بائنہ۔

اگر وہ طلاق کی وجہ سے عدت گذار رہی ہو اور رجعیہ ہو تو مندرجہ ذیل احکام مرتب ہوتے ہیں:

۔شوہر پر اس کے رہنے کا بندوبست کرنا ضروری ہے (جس کو اصطلاح میں سکنی کہا جاتا ہے) اور افضل یہ کہ جس جگہ اس کو طلاق ہوئی ہو وہیں پر رہنے کا بندوبست ہو، اگر وہ جگہ اس عورت کے مناسب ہو اور کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو۔

ب۔اس کا نفقہ یعنی غذا اور کپڑا وغیرہ شوہر پر واجب ہے، چاہے وہ حاملہ ہو یا نہ ہو

کیوں کہ اس پر شوہر کو قابو رہتا ہے اور وہ اس کے حکم کے تحت رہتی ہے کیوں کہ اس کو عدت کے دوران اس سے رجوع کرنے کا حق رہتا ہے۔

ج۔ مطلقہ کو اپنے گھر میں رہنا ضروری ہے، صرف ضرورت کی صورت میں اپنے گھر سے نکل سکتی ہے، ان تین احکام کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (طلاق ۶) عورتوں کو وہاں رکھو جہاں تم رہتے ہو اپنی طاقت بھر، اور ان کو نقصان نہ پہنچاؤ کہ ان پر تنگی کرو، اگر وہ حمل سے ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ ان کا وضعِ حمل ہو جائے"۔

اللہ تعالی کا یہ بھی فرمان ہے: "وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" (طلاق ۱) اور تم ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کھلا ہوا فحش کام کریں۔

د۔ اس کے لئے مردوں کو کنایہ پیغام دینا بھی حرام ہے، کیوں کہ وہ ابھی تک اپنے شوہر سے جڑی ہوئی ہے اور وہی دوسرے تمام مردوں سے زیادہ حق دار ہے، اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا" (سورہ بقرہ ۲۲۸) اور ان کے شوہر ان کو اس میں (عدت کے دوران) لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں اس کے بدلے جو انھوں نے اصلاح کا ارادہ کیا ہے۔

۲۔ وہ بائنہ ہو کر عدت گزار رہی ہو، اس وقت وہ یا تو حاملہ ہوگی یا حمل سے نہیں ہوگی۔

اگر وہ حاملہ ہو تو اس کے مندرجہ ذیل احکام ہیں:

ا۔ شوہر پر اس عورت کو سکنی دینا (رہنے کی جگہ فراہم کرنا) ضروری ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ''(طلاق ۱) اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو اور عدت کو شمار کرو اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرو اور تم ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کھلا ہوا فحش کام کریں۔

یہ آیت رجعیہ اور بائنہ دونوں کے لیے عام ہے۔

ب۔نفقہ بھی ضروری ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:
''أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ''(طلاق ٦) عورتوں کو وہاں رکھو جہاں تم رہتے ہو اپنی طاقت بھر، اور ان کو نقصان نہ پہنچاؤ کہ ان پر تنگی کرو، اگر وہ حمل سے ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ ان کا وضع حمل ہو جائے''۔

ج۔جس گھر میں عدت گزار رہی ہے وہیں پر رہنا ضروری ہے، چنانچہ صرف ضرورت کے وقت ہی نکل سکتی ہے مثلاً کھانے پینے کی ضرورت ہو یا تجارت وغیرہ کی حاجت ہو اور کوئی دوسرا اس کی نیابت نہ کرسکتا ہو، یا وہ کہیں مزدوری کرتی ہو اور وہاں سے اس کو عدت کی مدت گھر میں گزارنے کی اجازت نہ ملے یا وہ اپنی وحشت وتنہائی کو ختم کرنے کے لئے اپنی پڑوسن کے پاس جانے کے لئے مجبور ہو تو اس طرح کے امور کے لئے اس کو اپنے گھر سے نکلنا حرام نہیں ہے۔

ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنے کی ممانعت کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ''(طلاق ۱) اور تم ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کھلا ہوا فحش کام کریں۔

ضرورت کی صورت میں گھر سے نکلنے کے جائز ہونے کی دلیل: امام مسلم (الطلاق: ۱۴۸۳) نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میری خالہ کو طلاق دی گئی تو انھوں نے اپنے کھجور کے باغ کی کٹائی کرنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے ان کو نکلنے سے منع کیا تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلکہ تم نکلو اور اپنے نخلستان کی کٹائی کرو، شاید کہ تم صدقہ کرو یا بھلا کام کرو''

اگر عورت حاملہ نہ ہوتو مندرجہ بالا سبھی احکام نافذ ہوتے ہیں سوائے نفقہ یعنی غذا اور کپڑے وغیرہ کے، اس کے لئے نفقہ نہیں ملتا، البتہ سکنی شوہر پر ضروری ہے اور عورت پر اسی گھر میں رہنا ضروری ہے۔

امام ابو دود (طلاق: ۲۲۹) نے فاطمہ بنت قیس کے قصے میں روایت کیا ہے کہ جب اس کے شوہر نے اس کو بچی ہوئی ایک طلاق دی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: ''تمہارے لئے نفقہ نہیں ہے مگر یہ کہ تم حاملہ رہو''۔

وفات کی عدت

اگر عورت اپنے شوہر کی وفات کی وجہ سے عدت گزار رہی ہوتو اس پر مندرجہ ذیل احکام نافذ ہوتے ہیں:

أ۔ شوہر کا سوگ منانا: وہ زیب وزینت کے مظاہر اور خوشبو کے استعمال سے باز رہے، چنانچہ بھڑ کیلے کپڑے نہ پہنے، سرمہ نہ لگائے اور کسی قسم کا رنگ استعمال نہ کرے، اور کسی قسم کا زیور استعمال نہ کرے، نہ سونا چاندی کے زیور ار نہ ان کے علاوہ دوسرے زیور ، اگر وہ اس طرح کرے گی تو گنہ گار ہو جائے گی۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے اپنے شوہر پر چار مہینے دس دن''۔ (بخاری: الطلاق ۵۰۲۴، مسلم: الطلاق ۱۴۸۶۔۱۴۸۹) یہ روایت ام حبیبہؓ سے ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کے علاوہ ہر عورت کا سوگ منانا حرام ہے اور شوہر کا چار مہینے دس دن سوگ منانا واجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے غم کے اظہار کی رخصت دی ہے اور صرف تین دنوں کے دوران تعزیت کرنے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ دل تین دنوں میں صبر نہیں کرسکتے ہیں اور اپنا غم چھپا نہیں پاتے ہیں۔

امام بخاری (الحیض ۳۰۷) اور امام مسلم (الجنائز: ۹۳۸) نے ام عطیہ انصاریہ سے

روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہم کو منع کیا جاتا تھا، ہم میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائیں، سوائے شوہر کے چار مہینے دس دن۔ اور سرمہ نہ لگائیں، عطر نہ لگائیں، رنگا ہوا کپڑا نہ پہنیں سوائے عصب کپڑے کے اور ہم کو حیض سے پاک ہوتے وقت ''کست اظفار'' استعمال کرنے کی رخصت دی گئی ہے، جب ہم میں سے کوئی اپنے حیض کے ختم ہوتے وقت غسل کرتی ہے، اور ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا ہے۔

''عصب'' ایک قسم کا کپڑا ہے جس کو بننے سے پہلے ہی رنگا جاتا ہے ''کست اظفار'' ایک قسم کی خوشبو ہے۔

ب۔ اس کے لیے اسی گھر میں رہنا ضروری ہے جہاں وہ عدت گزار رہی ہو اور صرف ضرورت کے وقت ہی نکلنا جائز ہے، جیسا کہ ہم نے مطلقہ کی عدت میں بیان کیا ہے۔

امام ترمذی (الطلاق ۱۲۴) اور امام ابو داود (الطلاق: ۲۳۰۰) وغیرہ نے زینب بنت کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ فریعہ بنت مالک بن سنان (ابو سعید خدریؓ کی بہن) نے ان کو بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس یہ درخواست لے کر آئی کہ وہ بنی خدرہ میں اپنے گھر والوں کے پاس لوٹنا چاہتی ہے، ان کے شوہر چند غلاموں کی تلاش میں نکلے تھے جو فرار ہوگئے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدوم کے کنارے پہنچے تو ان غلاموں کو پایا لیکن غلاموں نے ان کو قتل کردیا۔ وہ کہتی ہیں: چنانچہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس جانا چاہتی ہوں، کیوں کہ میرے شوہر نے میرے لئے کوئی ایسا گھر نہیں چھوڑا ہے جس کے وہ مالک ہوں اور نہ کوئی نفقہ چھوڑا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھا۔ وہ کہتی ہیں: میں وہاں سے نکل کر چلی گئی یہاں تک کہ جب میں مسجد میں تھی تو مجھے رسول اللہ ﷺ نے پکارا (یا یہ کہا کہ مجھے پکارنے کا حکم دیا تو مجھے پکارا گیا) اور دریافت کیا: تم نے کیا کہا؟ وہ کہتی ہیں کہ میں اپنے نے شوہر کا پورا قصہ دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھر میں ہی رہو یہاں تک کہ عدت پوری ہوجائے''۔ وہ کہتی ہیں: چنانچہ میں نے اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزاری۔ وہ کہتی ہیں: جب حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور اس بارے میں دریافت کیا تو میں نے آپ کو بتایا، آپ نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔

بہت سے لوگ یہ گمان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عدت گزارنے والی عورت کے لئے کسی مرد سے بات کرنا جائز نہیں ہے اور اس طرح کسی بھی مرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس عورت کی آواز سنے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ یہ حکم عدت کے دوران بھی ہے اور عام حالات میں بھی۔

عدت کے احکام کا خلاصہ

خلاصہ کلام یہ کہ تمام قسموں میں چند احکام قدرِ مشترک ہیں، مثلاً: عورت کے لئے اس گھر سے نکلنا حرام ہے جہاں وہ عدت گزار رہی ہو، البتہ ضرورت کی صورت میں نکلنا جائز ہے، جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے اس کے لئے ایک مخصوص حکم یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر پر چار ماہ دس دن سوگ منائے گی، سوگ یہ ہے کہ وہ زیب وزینت اور خوشبو سے باز رہے جس کی تفصیلات ہم نے بیان کردی ہے

طلاق بائن کی وجہ سے عدت گزارنے والی عورت (جب وہ حاملہ نہ ہو) کے لئے مخصوص حکم یہ ہے کہ اس کے شوہر پر صرف سکنی لازم ہے، دوسرے نفقات واجب نہیں ہیں۔

خاتمہ

اس فصل کو ہم ایک اہم بات پر ختم کر رہے ہیں، وہ بات یہ ہے کہ شوہر کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص پر سوگ منانا عورت کے لئے حرام ہے، چاہے وہ رشتے دار ہوں، مرد ہوں یا عورت، یہ زمانہ جاہلیت کا عمل ہے کہ اس وقت جب عورت کا کوئی قریبی رشتے دار انتقال کرجاتا تو وہ کالا کپڑا پہنتی تھی (جیسا کہ آج ہندوؤں میں ہندوستان میں سفید کپڑے پہننے کا رواج عام ہے) تاکہ اپنے غم کا اعلان کرے، اسی طرح گھر والے خوشی کی محفلوں میں شریک ہونے سے باز رہتے ہیں اور عید کے موقع پر بھی غم مناتے ہیں اور یہ ایک سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک جاری رہتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غم تو ختم ہوجاتا ہے لیکن صرف رسم ورواج

کو پورا کرنے اور لوگوں کے سامنے غم کا اظہار کرنے کے لئے یہ تکلفات کئے جاتے ہیں۔

اس طرح کی پابندیاں رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی صریح خلاف ورزی ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے "اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے شوہر کے چار ماہ دس دن (بخاری: الطلاق: ۵۰۲۴، مسلم: الطلاق ۱۴۸۶۔۱۴۸۹) یہ روایت ام حبیبہؓ سے ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے زینب بنت ابو سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں زینب بنت جحشؓ کے پاس گئی جب ان کے بھائی کا انتقال ہوگیا تو میں نے عطر منگوایا اور لگایا، پھر کہا: اللہ کی قسم! مجھے عطر کی ضرورت نہیں ہے، البتہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے شوہر کے چار ماہ دس دن (بخاری: الطلاق: ۵۰۲۴، مسلم: الطلاق ۱۴۸۶۔۱۴۸۹)

سوگ منانے کی ہر صورت کا یہی حکم ہے، ہم اللہ سے عافیت مانگتے ہیں اور اس کی خاص بندگی کا سوال کرتے ہیں، وہ ہمیں اپنی رضامندی عطا فرمائے اور اپنی شریعت اور اپنے نبی کے طریقہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نفقات

نفقات کی تعریف:

نفقات ''نفقۃ'' کی جمع ہے، جولفظ ''اِنفاق'' سے ماخوذ ہے۔

اس کے معنی نکالنے اور خرچ کرنے کے ہیں اور انفاق کا استعمال خیر کے کاموں میں ہی ہوتا ہے، نفقہ کی اصطلاحی معنی: کھانے پینے، پہننے اور رہنے کی انسان کو پیش آنے والی تمام ضروریات، اس کو نفقہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان ضرورتوں کے راستے میں ختم ہونے والا اور زائل ہونے والا ہے۔

نفقات کی قسمیں:

نفقات کی مندرجہ ذیل پانچ قسمیں ہیں:

۱۔انسان کا خود اپنا نفقہ

۲۔اپنے اصول (آباء وامہات) کا نفقہ

۳۔اپنے فروع (بچوں) کا نفقہ

۴۔شوہر پر بیوی کا نفقہ

۵۔دوسرے نفقات

اس ترتیب کے ساتھ ان میں سے ہر قسم کی تفصیلات کو ذیل میں بیان کیا جارہا ہے:

۱۔انسان کا خود اپنا نفقہ

انسان پر سب سے پہلے اپنا نفقہ ضرری ہے، اگر اس میں اس کی قدرت ہو، اپنا نفقہ اپنے علاوہ کے نفقے پر مقدم ہے۔

اس نفقہ میں گھر، لباس، کھانا پینا وغیرہ تمام انسانی ضروریات شامل ہیں۔

انسان کا یہ نفقہ اس کے مال میں واجب ہے، اگر اس کے پاس اپنے اوپر خرچ کرنے کے لئے مال ہو۔

اس کی دلیل یہ روایت ہے: امام بخاری (الاحکام ۶۷۶۳) اور امام مسلم (الزکاۃ ۹۹۷) وغیرہ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ بنوعذرہ کے ایک شخص نے اپنے غلام کو اپنی موت کے ساتھ معلق کر کے آزاد کر دیا۔ یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے دریافت کیا: کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ مال ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو مجھ سے کون خریدے گا؟ نعیم بن عبداللہ عدیؓ نے آٹھ سو درہم میں اس کو خرید لیا، رسول اللہ ﷺ نے یہ درہم لے کر اس کے پاس آئے اور اس شخص کے حوالے کیا، پھر فرمایا: اپنی جان سے ابتدا کرو چنانچہ اس پر صدقہ کرو، اگر کچھ بچ جائے تو تمہارے گھر والوں کے لئے ہے، اگر کچھ بچ جائے تو تمہارے رشتے داروں کے لئے ہے۔ اگر تمہارے رشتہ داروں کو دے کر بچ جائے تو اس طرح اس طرح"۔

راوی کہتے ہیں: تو تمہارے سامنے، تمہارے دائیں اور تمہارے بائیں۔

۲۔ اپنے فروع یعنی بچوں کا نفقہ

والد اپنے بچوں اور بچیوں پر خرچ کرنے کا مکلّف ہے، اگر ان بچوں کا باپ نہ ہو تو ان پر خرچ کرنے کی ذمہ داری دادا پر ہے پھر اس کے اوپر کے دادا پر۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" (سورہ طلاق ۶) پس اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو۔

اپنی اولاد اور بچوں کی رضاعت کی اجرت شوہر پر لازم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ بدرجہ اولی ان کے اخراجات اور نفقہ واجب ہو، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان: "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (بقرہ ۲۳۳) اور عورتیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال

دودھ پلائیں گی اس کے لیے جو رضاعت کو مکمل کرنا چاہتا ہے، اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

امام بخاری (النفقات:۵۰۴۹) اور امام مسلم (الاقضیۃ:۱۷۱۴) نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ہند بنت عتبہ نے کہا: اللہ کے رسول! ابوسفیان بڑا کنجوس ہے، وہ مجھے اتنا نہیں دیتا جو مجھے اور میرے بچے کے لئے کافی ہو مگر یہ کہ میں ان سے ان کے جانے بغیر لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو تمہارے لئے اور تمہارے بچے کے لئے کافی ہو اس کو بھلائی سے لو" یعنی ابوسفیان کے مال میں سے لو

بچوں کی طرح پوتوں اور نواسوں کا بھی حکم ہے، کیوں کہ یہ نسب اور ضروریات میں بچوں کی طرح ہی ہیں۔

والد اور دادا یعنی اصول پر بچوں کا نفقہ واجب ہونے کی شرطیں:

والد (اصول) پر نفقہ واجب ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ والد کے پاس اپنے اور اپنی بیوی کے ایک دن اور ایک رات کے نفقہ سے زائد مال موجود ہو۔

اگر اس کے پاس صرف اپنا نفقہ ہو یا اپنا اور اپنی بیوی کے ایک دن ایک رات کا نفقہ ہو تو وہ اپنے بچوں پر خرچ کرنے کا مکلّف نہیں ہے۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: "اپنی ذات سے شروع کرو"۔ (مسلم: الزکاۃ:۹۹۷)

بچہ فقیر ہو اور اس کے فقیر ہونے کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس میں تین میں سے کوئی وصف پایا جائے:

۱۔ وہ فقیر ہو اور چھوٹا بھی ہو۔

۲۔ یا وہ فقیر بھی ہو اور کمزور بھی ہو۔

۳۔ یا وہ فقیر ہونے کے ساتھ پاگل ہو۔

چھوٹا بچہ فقیر ہوتو اس کے باپ کو اس پر خرچ کرنے کا مکلّف بنایا جائے گا، اگر باپ نہ ہوتو اس کے دادا کو خرچ کا مکلّف بنایا جائے گا۔

اسی طرح کمزور فقیر جو کام کرنے سے عاجز ہو۔

اسی طرح پاگل فقیر بچہ۔

فقیر سے مراد کمانے سے عاجز ہے۔

اگر بچہ صحیح سالم اور بالغ ہو اور اس میں کمانے کی طاقت بھی ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے اگر چہ وہ کما نہ رہا ہو۔

اگر علم میں مشغولیت کی وجہ سے کما نہ رہا ہو تو دیکھا جائے گا:

اگر علم کا تعلق اس کی ذاتی ذمے داریوں اور فرائض میں سے ہو مثلاً عقیدہ اور عبادت کی تعلیم ہو تو اس کو کمائی سے عاجز مانا جائے گا اور اس صورت میں اس کے والد پر نفقہ واجب ہے۔

اگر ایسے علوم وفنون کے حصول میں مشغول ہو جن کی ضرورت معاشرے کو پڑتی ہو جو فرض کفایہ کے درجے میں ہیں مثلاً طب اور صناعت وغیرہ، اس صورت میں بچے کو کمائی سے عاجز نہیں مانا جائے گا، باپ کو اختیار ہے کہ وہ ان علوم میں مشغول رہنے کے لئے چھوڑ دے اور اس پر خرچ کرے یا اس کو اخراجات نہ دے اور اس کو کمانے پر مجبور کرے۔

نفقہ کی مقدار

نفقہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، اس کی مقدار کفایت (کافی ہونا) ہے اور یہ عرف پر موقوف ہے اور خرچ کرنے والے کی طاقت پر، اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا" (الطلاق:۷) وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر رزق تنگ کر دیا گیا ہے تو وہ اس کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ میں سے خرچ کرے، اللہ کسی کو مکلّف نہیں بناتا مگر اتنا ہی جتنا اس نے دیا ہے، اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشادگی عطا فرمائے گا۔

اگر وقت پر والد یا دادا بچوں پر خرچ نہ کرے تو کیا یہ ان پر قرض ہے:

خرچ کرنے والا اگر وقت پر خرچ نہ کرے تو یہ قرض نہیں رہتا، کیوں کہ یہ دراصل خیر خواہی ہے، اس لیے یہ متعین حق کا مالک بنانا نہیں ہے، بلکہ رشتے داری کے رابطہ کی وجہ سے فرض ہے۔

یہی اصل حکم ہے جب بچوں اور باپ کے درمیان حالات معمول پر ہوں، اگر ان کے درمیان اختلاف ہوجائے تو قاضی مداخلت کرے گا اور باپ پر نفقہ متعین کرے گا یا بچوں کو اپنے والد کے ذمہ متعین مقدار میں مال قرض لینے کی اجازت دے گا، صرف اتنی مقدار میں جتنی ان کو ضرورت ہو، یہ نفقہ والد کے ذمے قرض ہوجائے گا، اس صورت میں وقت گزرنے سے نفقہ ساقط نہیں ہوگا، کیوں کہ نفقہ قاضی کے فیصلہ سے ملکیت میں تبدیل ہوجائے گا، جب کہ نفقہ اس سے پہلے خیر خواہی تھا۔

۳۔ بچوں پر والدین (اصول) کا نفقہ

جس طرح مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ والد (اصول) پر بچوں (فروع) کا نفقہ ضروری ہوجاتا ہے، اس طرح اصول (والدین: دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) کا نفقہ بھی بچوں (فروع) پر واجب ہے۔

بچوں پر نفقہ واجب ہونے کی دلیلیں

اس کے دلائل حدیث، قرآن اور قیاس میں موجود ہیں:

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا '' (سورہ لقمان ۱۵) ان کے ساتھ دنیا میں بھلائی کے ساتھ رہو۔

دوسری جگہ فرمان الہی ہے: ''وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا '' (اسراء ۲۳) اور تمہارے پروردگار نے فیصلہ کیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

بچہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی اور احسان اس صورت میں کرنے والا ہوگا جب وہ ضرورت کے وقت اپنے والدین کے نفقہ کی ذمہ داری اٹھائے۔

امام ابو داود (البیوع والاجارات: ۳۵۲۸) اور امام ترمذی (الاحکام: ۱۳۵۸) وغیرہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سب سے بہترین چیز وہ ہے جو آدمی اپنی کمائی میں سے کھاتا ہے اور اس کا بچہ اس کی کمائی میں سے ہے"۔ آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے: "تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے، تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں سے ہے، پس تم اپنے اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"۔ (ابو داود: البیوع والاجارات: ۳۵۳۰)

امام نسائی (الزکاۃ ۶۱/۵) نے حضرت طارق محاربی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں مدینہ آیا تو رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوکر لوگوں سے خطاب کررہے تھے، وہ فرمارہے تھے: "دینے والا ہاتھ اوپر والا ہے، اپنی کفالت میں موجود لوگوں، والدین سے ابتدا کرو، پھر اپنے قریبی رشتے دار سے"۔

امام ابوداود (الادب: ۵۱۴۰) نے کلیب بن منفعہ سے، انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور دریافت کیا: اللہ کے رسول! میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے والدین کے ساتھ، اپنی بہن بھائی اور اس کے بعد آنے والے اپنے قریبی رشتے داروں کے ساتھ، یہ واجبی حق ہے اور صلہ رحمی ہے"۔

قیاس سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ اصول کو فروع پر قیاس کیا گیا ہے جس طرح عاجزی کے وقت فروع کا نفقہ اصول پر واجب ہے، اسی طرح عاجزی کے وقت اصول کا نفقہ فروع پر واجب ہے، کیوں کہ وہ ایک دوسرے سے ہیں، اور یہی قرابت اور رشتے داری کی بنیاد ہے جو اصول اور فروع کے درمیان ہے۔

اصول کا نفقہ فروع پر واجب ہونے کی شرطیں:

فروع پر اصول کا نفقہ واجب ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

ا۔اپنے اور اپنی بیوی کے ایک دن اور ایک رات کے نفقے سے زیادہ مال موجود ہو، اگر اس کے پاس اپنے اور بیوی کے نفقے سے زیادہ مال نہ ہو تو اس کو اپنے والدین پر خرچ کرنے کا مکلّف نہیں بنایا جائے گا، کیوں کہ فقیر کا نفقہ اسی طرح کے فقیر پر واجب نہیں ہے، اگر تھوڑا سا نفقہ ہو تو وہ اپنے والدین پر خرچ کرے گا، اگر دونوں پر خرچ نہ کر سکتا ہو تو ماں کو باپ پر مقدم کرے گا، کیوں کہ جس چیز کا مکمل حصول ممکن نہ ہو تو اس کو پورا کا پورا چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔

۲۔باپ (اصول) فقیر ہو، یہاں فقیری سے مراد یہ ہے کہ وہ اتنا نہ کمار ہا ہو جو اس کی ضرورت کو پورا کر سکے، چاہے وہ کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو، برخلاف فروع کے لئے نفقہ واجب ہونے کی گزری ہوئی شرطوں کے کہ اس میں فقیری کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ چھوٹا ہو یا کمزور ہو یا پاگل ہو یعنی عاجزی کی کوئی صفت پائی جائے۔

ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اصل (والد یا دادا) کے لئے یہ بات قبیح نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کمانے پر مجبور کرے اور اس کا مکلّف بنائے۔

جب کہ بچوں کے لئے یہ بات قبیح ہے کہ وہ اپنے اصول کو کمانے پر مجبور کرے خصوصا جب وہ بوڑھے ہو گئے ہوں کیوں کہ انہوں نے اس کی خاطر بڑی جدوجہد کی ہے اور کمایا ہے۔

۳۔ماں عملاً یا حکماً اپنے شوہر کے نفقہ دینے کی وجہ سے بے نیاز نہ ہو، اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا نفقہ اس کے بچے پر چند حالات میں واجب ہوتا ہے:

ا۔اس کا والد ماں پر خرچ کرنے سے عاجز ہو۔

۲۔اس کے والد کا انتقال ہوا ہو اور ماں کا کوئی شوہر نہ ہو، اگر ماں شادی کرنے کی قدرت رکھتی ہو تو بچے کی یہ ذمہ داری ختم نہیں ہوتی ہے یعنی اس کے بچے پر ضروری ہے کہ وہ اس پر خرچ کرے چاہے کوئی کفو مرد اس سے شادی کا پیغام بھیج چکا ہو۔

اس شرط کا مطلب یہ بھی ہے کہ دو حالتوں میں ماں کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے:

ا۔اس کے والد ماں پر خرچ کرنے پر قادر ہوں۔

۲۔اس کے والد کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے اس کی شادی ہوئی ہو چا ہے وہ مرد

مالدار ہو یا تنگ دست۔

فروع اور اصول کے نفقہ میں دین کے اختلاف کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اگر مذکورہ بالا شرطوں کو دیکھا جائے؛ چاہے اصول پر نفقہ واجب ہونے کی شرطیں ہوں یا فروع پر، تو معلوم ہو جائے گا کہ اصول اور فروع کا دین ایک ہی ہونا نفقہ واجب ہونے کے لئے شرط نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے اختلاف سے اصول اور فروع کے نفقہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

اگر بچہ مسلمان ہو تو اس کو اپنے غیر مسلم والدین پر خرچ کرنے کا مکلّف بنایا جائے گا، اسی طرح والد مسلمان ہو تو اس کو اپنے غیر مسلم بچوں پر خرچ کرنے کا مکلّف بنایا جائے گا اگر مذکورہ بالا تمام شرطیں پائی جائیں۔

لیکن اس حکم میں مرتد شامل نہیں ہے، چنانچہ اس کا نفقہ واجب نہیں ہے چاہے وہ خرچ کرنے والے کا اصل ہو یا فرع۔

مشرک والد (اصل) پر خرچ کرنا جائز ہونے کی دلیل امام بخاری (الادب : ۵۶۳۴) اور امام مسلم (الزکاۃ ۱۰۰۳) وغیرہ کی حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ کہتی ہیں: میری ماں قریش کے ساتھ معاہدے کے عہد میں میرے پاس آئی جب کہ وہ مشرک تھی جب آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فتوی دریافت کیا، میں نے کہا: اللہ کے رسول! میرے پاس میری ماں آئی ہے اور وہ صلہ رحمی کی خواہش مند ہے، کیا میں اپنی ماں سے صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

فروع پر اصول کے نفقہ کی مقدار

اس نفقہ کی بھی کوئی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ یہ عرف کے تابع ہے۔

جب وقت گزر جائے اور اصل اس سے لطف اندوز نہ ہو تو یہ نفقہ بھی فرع کے ذمہ

قرض نہیں بنتا ہے، مگر یہ کہ دونوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو قاضی اس اختلاف کی وجہ سے فرع پر متعین مقدار میں نفقہ مقرر کرے گا، اس صورت میں وقت کے گزرنے کے باوجود فرع کے ذمہ میں قرض ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

خرچ کرنے میں اصول اور فروع کی ترتیب:

اگر والدین فقیر ہوں اور ان کے بچے ہوں اور سب کی قرابت یکساں ہو تو وہ سب والدین پر خرچ کریں گے کیوں کہ نفقہ واجب ہونے کی علت سب کو شامل ہے، خرچ کرنے میں لڑکی کا حصہ مرد کے حصے کا آدھا ہوگا، جس طرح وراثت میں ہوتا ہے، اگر رشتے داری میں مختلف ہوں مثلاً بیٹا اور پوتا ہو تو نفقہ قریبی رشتے دار پر واجب ہوگا چاہے وہ وارث ہو یا نہ ہو، مرد ہو یا عورت، کیوں کہ قریبی رشتے داری کا اعتبار کرنا اولی ہے۔

اگر بچہ فقیر ہو اور اس کے والدین مالدار ہوں تو اس کا نفقہ باپ پر ہوگا، کیوں کہ وہی اپنے چھوٹے بچے پر خرچ کرنے کا مکلّف ہے، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:: "فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ" (سورہ طلاق ٦) پس اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو۔

فقیر بچہ بڑا ہو تو بھی اس کا نفقہ والد پر ہوگا کیوں کہ بچپن میں اس کا نفقہ والد پر ہی تھا، اگر کوئی شخص فقیر ہو اور اس کا اصل اور فرع دونوں مالدار ہوں تو نفقہ کے واجب ہونے میں فرع کو مقدم کیا جائے گا، چاہے اس کا رشتہ دور کا ہو، کیوں کہ فرع کا عصبہ ہونا اصل کے عصبہ ہونے سے زیادہ طاقت ور ہے اور وہ اپنے والد کی ذمے داری اٹھانے کا زیادہ حق دار ہے کیوں کہ اس کی حرمت بڑی عظیم ہے۔

اگر اصول اور فروع وغیرہ میں بہت سے ضرورت مند ہوں اور اس کی ضرورت سے بچا ہوا مال سبھوں کو پورا نہ ہوتا ہو تو مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق ایک کو دوسرے پر مقدم کیا جائے گا:

١۔ اپنی بیوی، کیوں کہ اس کا نفقہ سب سے زیادہ تاکیدی ہے، کیوں کہ اس کا نفقہ وقت گزرنے سے ساقط نہیں ہوتا ہے، برخلاف اصول اور فروع کے نفقات کے کہ وقت گزرنے

سے ان کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تفصیل پہلے بیان کردی ہے۔

۲۔ چھوٹا بچہ، اس حکم میں بالغ پاگل بھی ہے، کیوں کہ یہ دونوں کمانے سے سب سے زیادہ عاجز ہیں۔

۳۔ ماں؛ کیوں کہ وہ بھی عاجز ہے اور حمل اٹھانے، وضع حمل، دودھ پلانے اور تربیت کی وجہ سے اس کا حق زیادہ موکد ہے۔

۴۔ باپ، کیوں کہ اس کا احسان بہت بڑا ہے۔

۵۔ بڑا فقیر بچہ کیوں کہ اس کو اپنے والد سے قرابت حاصل ہے اور قرابت کو امتیاز اور فضیلت حاصل ہے۔

۶۔ دادا اوپر تک کیوں کہ اس کی حرمت باپ کی حرمت کی وجہ سے ہے اور وہ اصل ہے جس کے حقوق کی رعایت کرنا واجب ہے۔

۴: شوہر پر بیوی کا نفقہ

شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہونے کے دلائل:

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ'' (نساء ۳۴) مرد عورتوں پر ذمے دار ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور وہ اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر خرچ کرنے کا ذمہ دار ہے، اللہ تبارک وتعالی کا دوسری جگہ فرمان ہے: ''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (بقرہ ۲۳۳) اور اور عورتیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی اس کے لیے جو رضاعت کو مکمل کرنا چاہتا ہے، اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

آیت میں مذکور لفظ ''المولود لہ'' سے مراد شوہر ہے اور ''رزقھن'' میں ''ھن'' کی ضمیر کا مرجع والدات ہے، جس سے مراد بیویاں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوہروں پر بیویوں کا نفقہ واجب ہے۔

شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہونے کی حکمت:

ازدواجی زندگی کا مندرجہ ذیل تین بنیادوں میں سے ایک بنیاد پر قائم رہنا ضروری ہے:

۱۔شوہر بیوی کے گھر کی نگرانی کی ذمے داری لے اور وہی بیوی اور بچوں پر خرچ کا ذمے دار ہو۔

۲۔شوہر کے بدلے بیوی ان تمام امور کی ذمہ دار ہو۔

۳۔مادی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور خرچ کرنے میں میاں بیوی آپس میں تعاون کریں، اگر ہم پہلی بنیاد پر عمل پیرا ہوں جو اسلامی شریعت کا حکم ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور دسری یا تیسری بنیاد کو اس کے بدلے اپنی زندگی میں برتیں تو کیا نتیجہ ہوگا؟

اس صورت میں مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئیں گے:

۱۔اس کا اثر مہر پر بھی لامحالہ پڑے گا۔

یا تو عورت پورا مہر مرد کو دے گی یا دونوں مہر دینے میں شریک ہوں گے۔

اس صورت کے حتمی نتائج میں سے یہ بھی ہے کہ عورت تبدیل ہوجائے گی جس کے نتیجے میں وہ شوہر کو طلب کرنے والی بنے گی جب کہ اللہ نے اس کو باعزت کیا ہے اور اس کو مطلوب بنایا ہے، کیوں کہ جو مال پیش کرتا ہے وہی طالب ہوتا ہے اُس کا جو مال لیتا ہے، جب بیوی ہی اپنے شوہر کو تلاش کرنے والی ہوگی تو وہ ایسے شوہر کو پا ہی نہیں سکے گی جس کو وہ پسند کرے، یہاں تک کہ وہ مردوں کے دھوکوں اور ان کی جھوٹی باتوں کا شکار ہو کر مسلسل گرنے لگے گی۔

۲۔روزی اور معاش کے لئے عورت کام کرنے اور جدوجہد کرنے پر مجبور ہوجاتی اور مختلف کاموں کے پیچھے دوڑنے میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے پر بھی مجبور ہوجاتی۔

جب عورت ایسا کرتی ہے تو لامحالہ برائی اور انحراف کا شکار ہوجاتی ہے۔

آج کے واقعات اس کی سب سے بڑی دلیلیں ہیں۔

اسی طرح گھر کے امور سنبھالنے، اس کی حالات کی رعایت کرنے اور بچوں کی پرورش کرنے والے کی ضرورت پڑتی، اس وقت گھر ویرانی، انارکی، اضطراب اور بے چینی کا مسکن بن جاتا، جب کہ گھر خوش بختی کی پناہ گاہ، انسیت کا سرچشمہ اور راحت وسکون کا ملجا رہتا ہے۔

آج کے واقعات اس کی سب سے بڑی دلیلیں ہیں۔

۳۔ اگر ازدواجی زندگی مذکورہ دو بنیادوں میں سے کسی ایک بنیاد پر قائم ہو جائے گی تو طلاق کا حق عورت کے ہاتھ میں مکمل طور پر یا اشتراک کے ساتھ رہنا ضروری ہے، کیوں کہ اقتصادی ومعاشی اور معاشرتی قانون کہتا ہے: ''جو خرچ کرتا ہے وہ نگرانی کرتا ہے''۔

طلاق کے باب میں عمومی حالات میں طلاق دینے کا حق شوہر کو رہنے کی واضح حکمت کے بارے میں ہم نے بیان کیا ہے۔

شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہونے کی شرطیں:

۱۔ بیوی خود کو شوہر کے حوالے کرے کہ جائز لطف اندوزی سے اس کو منع نہ کرے، اگر شوہر کو لطف اندوزی سے منع کرے چاہے لطف اندوزی کی جائز کسی بھی شکل سے تو اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے۔

البتہ اگر شوہر حرام طریقہ پر لطف اندوزی کا ارادہ کرے مثلاً حالت حیض میں اس کے ساتھ جماع کرنا چاہے تو اس طرح کی لطف اندوزی سے روکنے کی وجہ سے بیوی کا نفقہ ساقط نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ بیوی اسی گھر میں رہے جس کو شوہر منتخب کرے اور وہ بھی اسی گھر میں رہے، البتہ گھر رہنے کے قابل نہ ہو یا شرعی طور پر وہاں ٹھہرنا صحیح نہ ہو تو مسئلہ الگ ہے، اگر شوہر ایسے شہر میں رہتا ہو جہاں رہنے سے بیوی کو کوئی صحیح شرعی ضرر لاحق نہ ہوتا ہو یا ایسے گھر میں رہتا ہو جس میں معتبر تمام شرعی شرطیں پائی جاتی ہوں اور عورت اس کے ساتھ اس شہر یا اس گھر میں رہنا قبول نہ کرے تو شوہر کو اس پر خرچ کرنے کا مکلّف نہیں بنایا جائے اور اس صورت میں اس کو نافرمان

مانا جائے گا۔

جب یہ تمام شرطیں پائی جائیں تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تمام قسم کے اخراجات دے جس کی تفصیل آرہی ہے، ان شرطوں کے بیان کرنے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ صرف نکاح ہونے سے شوہر پر نفقہ لازم نہیں ہوتا ہے۔

شوہر کے حالات کے مطابق بیوی کا نفقہ مقرر کیا جائے گا:

بیوی کا نفقہ شوہر کے مادی حالات پر موقوف ہے، شوہر کی تنگی اور خوشحالی کے اعتبار سے اس کی کمیت اور کیفیت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

بیوی کے حالات کے اختلاف سے اس کی کمی بیشی میں کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

کیوں کہ کمی بیشی استطاعت پر موقوف ہے اور یہ خرچ کرنے والے کے حالات کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ جس پر خرچ کیا جائے اس کے حالات کے مطابق۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "**لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا**" (الطلاق:۷) وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر رزق تنگ کردیا گیا ہے تو وہ اس کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ میں سے خرچ کرے، اللہ کسی کو مکلّف نہیں بناتا مگر اتنا ہی جتنا اس نے دیا ہے، اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشادگی عطا فرمائے گا۔

خرچ کرنے کا معیار اللہ تبارک وتعالی نے شوہر کی تنگدستی اور خوشحالی کو بنایا ہے، بیوی کے معیار اور مقام کو نہیں، اس اعتبار سے شرعی طور پر شوہر کے حالات کے تین درجے ہیں:

۱۔مالداری ۲۔متوسط درجہ ۳۔فقیری

انسان مالدار ہے یا متوسط یا فقیر اس کی تعیین کا معیار عرف عام ہے۔

الف۔ مالدار شوہر پر مندرجہ ذیل نفقہ واجب ہے:

۱۔اپنے شہر کی غذا میں سے ہر دن دو مد غلہ؛ اس کے ساتھ پینے اور پکانے وغیرہ کے

اخراجات، یا تیار روٹی لا کر دی جائے۔
۲۔ اپنے شہر کا عادی سالن اور اس شوہر کی طرح کے مالداروں کے یہاں جس طرح کا کھانا پیش کیا جاتا ہے۔
فقہاء نے اس کی بڑی تفصیلات بیان کی ہیں، لیکن ہر حال میں اس کا دارومدار شہر والوں کے عرف پر ہے۔
۳۔ اس شہر میں مالداروں کی بیویوں کے لائق کپڑا، کپڑے میں عرف کا اثر اچھی اور خراب کوالیٹی میں پڑتا ہے، جہاں تک تعداد کا تعلق ہے تو اس میں ضرورت کو دیکھا جائے گا، عرف کو نہیں اس کے حکم میں گھر کا فرنیچر، بستر اور کھانا پکانے کا ساز وسامان وغیرہ بھی شامل ہے۔
اس سلسلہ میں عرف کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (بقرہ ۲۳۳) اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

ب: متوسط درجے کے شوہر پر مندرجہ ذیل نفقہ واجب ہے:
۱۔ اپنے شہر کی غذا میں سے ہر دن ڈیڑھ مد غلہ ان تمام چیزوں کے ساتھ جس کا تذکرہ مالدار کے نفقے میں ہوا ہے۔
۲۔ اپنے شہر کا عادی سالن جس کو عام طور پر متوسط طبقے کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔
۳۔ اپنے شہر میں متوسط طبقے کے لوگوں کی بیویاں جو کپڑا پہنتی ہے اور اپنے گھر میں جو ساز وسامان استعمال کرتی ہیں ان کی فراہمی۔

ج۔ فقیر شوہر پر مندرجہ ذیل نفقہ واجب ہے:
۱۔ اپنے شہر کی غذا میں سے ہر دن ایک مد غلہ
۲۔ اس شہر میں غریب لوگ جو سالن استعمال کرتے ہیں۔
۳۔ اس شہر میں غریبوں کی بیویوں کے لائق جو کپڑا ہے۔
ان تمام احکام کی دلیل امام ابو دود (النکاح: ح ۲۱۴۴) کی حضرت معاویہ قشری رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میں نے دریافت کیا: آپ ہماری عورتوں کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ان کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو، وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو، ان کو نہ مارو اور ان کو گالی مت دو''۔

مندرجہ بالا اخراجات کے علاوہ بیوی کے نفقہ میں شوہر کے حالات کا اعتبار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل چیزیں بھی شامل ہیں:

۱۔ شوہر کے حالات کے مطابق ایک مناسب گھر جس میں اس کی بیوی رہے، اس میں ضروری سازوسامان کا پایا جانا ضروری ہے۔

۲۔ پاکی وصفائی کے لئے ضروری سبھی ساز وسامان، اگر شوہر بیوی سے زیب وزینت اختیار کرنے کے لئے کہتا ہے تو زیب زینت کے سازوسامان۔

۳۔ اگر بیوی ایسی ہو کہ اس کے والد کے گھر میں اس کی خدمت کے لئے خادم ہو تو خادم کی فراہمی چاہے شوہر مالدار ہو یا متوسط طبقے کا یا غریب، چنانچہ شوہر کے لئے ضروری ہے کہ بقدر ضرورت خدمت کرنے والا خادم فراہم کرے۔

خادمہ رہنا ضروری ہے یا ایسا نابالغ بچہ جو ممیّز ہو یا اس عورت کا کوئی محرم مرد، اس خادم کی اجرت شوہر کے ذمہ ہوگی۔

بیوی کا نفقہ تملیک ہے یا تمکین؟

اس کی تفصیلات دوسرے افراد کے نفقہ کی تفصیلات کے وقت بیان کی جا چکی ہے کہ تملیک کیا ہے اور تمکین کیا۔

اگر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کھاتی ہے اور اسی کے ساتھ رہتی ہے، ان دونوں کے درمیان کسی متعین غلہ اور سالن پر اتفاق نہیں ہوا ہے، جیسا کہ عام طور پر آج کل ہمارے معاشرے میں رواج ہے تو یہ نفقہ تمکین ہوگا (یعنی بطور قرض شوہر کے ذمے نہیں ہوگا) تملیک نہیں اور وقت گزرنے سے یہ نفقہ ساقط ہو جائے گا یا قاضی بیوی کے لئے کوئی مقدار متعین کرے تو اس وقت نفقہ متعین ہوگا، بیوی وقت گزرنے کے باوجود اس کا مطالبہ کر سکتی ہے،

کیوں کہ اس صورت کو تملیک مانا جائے گا، تمکین نہیں اور بیوی کو اس کا بدل لینے کا حق ہے۔

نفقہ متعین کرنے میں عرف کا اثر

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ بنیادی غلہ کی مقدار متعین ہے اور مقدار میں عرف کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

تمام حالات میں یہ متعین ہے:

مالدار کے لئے دو مد

متوسط کے لئے ڈیڑھ مد

غریب کے لئے ایک مد

شوہر اپنی بیوی کو یہ مقدار روٹی کی شکل میں دے گا یا غلہ دے گا، اس صورت میں پیسنے اور پکانے کے اخراجات بھی دے گا۔

کیوں کہ یہ ضروری غلہ ہے جو عرف کے اختلاف سے متاثر نہیں ہوتا ہے۔

جہاں تک اس سے زائد چیزیں مثلاً سالن اور کپڑا وغیرہ، ان کو عرف دیکھ کر متعین کیا جائے گا یعنی اس شہر کا عمومی سالن اور کپڑا دیا جائے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ عرف شرعی احکام کا مخالف نہ ہو۔

اگر بعض اخراجات یا بعض مواقع پر عرف کے اعتبار سے اسراف ہوتا ہو تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا جیسا کہ آج کا ماحول، یہ نفقہ میں شامل نہیں ہوگا۔

شوہر نفقہ دینے سے تنگ دست ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

اگر شوہر تنگ دست ہو جائے، اگر یہ تنگدستی مالداری سے درمیانی طبقے یا غریبی کے طبقے کی طرف نزول ہو تو اس تنگدستی پر کوئی چیز مرتب نہیں ہوتی، اور بیوی پر اپنے شوہر کی پیروی اور اس کے مادی حالات پر راضی برضا رہنا ضروری ہے۔

اگر شوہر اتنا تنگدست ہو جائے کہ تیسرے درجے کا بھی نفقہ نہ دیتا ہو تو اس وقت بیوی کو نکاح فسخ کرنے کا حق ہے۔

جب بیوی یہ مطالبہ کرے تو قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیوی کی درخواست قبول کرے اور ان دونوں کو جدا کرائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ شوہر کم از کم تین دنوں کے نفقہ سے عاجز ہو، تا کہ اس کی عاجزی محقق ہو، کیوں کہ کبھی عاجزی کسی رکاوٹ کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے پھر یہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔

امام دار قطنی (النکاح: ۲۹۷/۳) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو اپنی بیوی پر خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، "ان دونوں کو جدا کیا جائے گا"۔

اگر بیوی اپنے شوہر کی عاجزی کے باوجود اس کے ساتھ رہنے پر راضی ہو جائے تو اس کو بعد میں بھی فسخ کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، کیوں کہ نفقہ دینے سے شوہر کی عاجزی سے ہونے والے نقصان میں ہر دن تجدید ہوتی ہے، اور ہر دن کا مستقل حکم ہے۔

اگر شوہر تیسرے درجے کا پورا نفقہ نہ دے سکتا ہو تو عورت کو فسخ جائز نہیں ہے، مثلاً سالن نہ دے سکتا ہو، کیوں کہ یہ تابع ہوتا ہے اور اس کے بغیر بھی جان باقی رہ سکتی ہے یا وہ خادم کا نفقہ دینے سے عاجز ہو، کیوں کہ خادم تکمیلی ضروریات میں سے ہے جس کے بغیر زندگی کی گاڑی چل سکتی ہے۔

اگر اس درجے کے تمام نفقات دینے سے عاجز ہو تو اس وقت بیوی کو فسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔

۵۔ دوسرے نفقات

مذکورہ بالا نفقات کے علاوہ بعض دوسرے نفقات بھی انسان پر اس کی ملکیت کے اعتبار سے واجب ہوتے ہیں:

۱۔ چوپایوں کا نفقہ

چوپایوں کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہیں:

۱۔وہ چوپائے جن کا گوشت کھانا جائز ہے۔
۲۔وہ محترم چوپائے جن کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے۔
۳۔غیر محترم چوپائے

پہلی قسم: وہ چوپائے جن کا گوشت کھانا جائز ہے:

☆ماکول اللحم جانوروں کے سلسلہ میں مالک کو اختیار دیا جائے گا کہ ان کو اتنا چارہ اور غلہ کھلائے جس سے ان کی زندگی بچ جاتی ہو اور ان کی حفاظت ہوتی ہو یا ان کو کھانے کے لئے ذبح کرے یا بیچ دے یا دوسرے کو ہدیہ میں دے، اگر مالک ذبح نہ کرے یا مذکورہ بالا امور میں سے کوئی بھی کام نہ کرے تو اس کو ان جانوروں پر اتنا خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے گا کہ اس سے ان جانوروں کا تحفظ ہو، اگر اس طرح نہ کرے تو ان کو بیچنے پر مجبور کیا جائے گا، اگر بیچے بھی نہیں تو زبردستی بیچا جائے گا۔

دوسری قسم: وہ محترم جانور جن کا کھانا جائز نہیں ہے:

☆محترم جانور مثلاً شکاری کتا، بلی، باز، شہد کی مکھی اور ریشم کا کیڑا وغیرہ پر توجہ دینا ان کے مالک پر لازم ہے، اسی طرح ان کو کھلانا پلانا بھی ضروری ہے، اگر اس طرح نہ کرے تو ان کو بیچنے پر مجبور کیا جائے گا، اگر نہ بیچے یا کوئی خریدنے والا نہ پایا جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان جانوروں کے ہلاک ہونے سے حفاظت کرنے کے لئے ایسے شخص کے حوالے کرے جو ان سے فائدہ اٹھائے اور ان کی حفاظت کرے۔

تیسری قسم: غیر محترم جانور

مثلاً پاگل کتا اور دوسرے تکلیف دینے والے موذی جانوروں کے تعلق سے کوئی بھی چیز واجب نہیں ہے، کیوں کہ ان کو قتل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

محترم جانوروں اور ماکول اللحم چوپایوں کا نفقہ واجب ہونے کی دلیل:

امام مسلم (البر والصلۃ والآداب: ۲۶۱۹) نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک عورت جہنم میں ایک بلی کی وجہ سے چلی گئی، اس نے بلی کو باندھ دیا، نہ تو اس کو کھلایا اور نہ چھوڑ دیا کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزوں میں سے کھائے یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر مر گئی'' (بخاری: المساواۃ: ۲۲۳۶، مسلم: السلام: ۲۲۴۲) بلی تمام محترم جانوروں کی مثال ہے، چاہے ان کا گوشت کھانا جائز ہو یا جائز نہ ہو، اس میں وہ جانور شامل نہیں ہیں جو محترم نہیں ہیں جیسے پانچ فاسق جانور ہیں جن کا تذکرہ حدیث میں آیا ہے۔

امام بخاری (جزاء الصید: ۱۷۳۲) اور امام مسلم (الحج: ۱۱۹۸) وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''پانچ جانور فاسق ہیں جن کو حل اور حرم میں قتل کیا جاتا ہے: سانپ، وہ کوا جس کی پیٹھ اور پیٹ میں سفیدی ہو، چوہا، کاٹنے والا کتا، چیل''۔

فاسق اس کو کہتے ہیں جو اطاعت سے خارج ہو، ان پانچ جانوروں کو فاسق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ تکلیف دینے اور بگاڑ کی وجہ سے عام جانوروں کے راستے سے نکلے ہوئے ہیں۔

۲۔ کھیت اور درخت کے اخراجات:

کھیت اور درختوں کے اخراجات سے مراد اس کو سینچنا اور اس پر توجہ دینا ہے، اگر اس کے مالک کو تعمیر وغیرہ کی غرض سے درختوں کو اکھاڑنے کی خواہش نہ ہو تو اس کے لئے ان کو سینچنا اور ان کی حفاظت کرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان سے لاپرواہی برتنا کسی شرعی جواز کے مال کو ضائع کرنا ہے اور یہ شریعت میں جائز نہیں ہے۔

اگر کوئی درخت اور کھیت اکھاڑ کر ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا تعمیر وغیرہ کی غرض سے زمین سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے درخت نکالنا اور کھیت اکھاڑنا یا سوکھنے کے لئے ان سے لاپرواہی برتنا جائز ہے، کیوں کہ اس میں شرعی غرض ہے۔

پرورش (حضانت)

لفظ ''حضانة'' حضن سے ماخوذ ہے جس کے معنی پہلو کے ہیں کیوں کہ پرورش کرنے والی پروردہ کو اپنے پہلو میں لیتی ہے۔

اسلامی شریعت میں ''حضانة'' کے اصطلاحی معنی: جو اپنے امور کی خود حفاظت نہ کرتا ہو تو اس کی حفاظت اور پرورش و اصلاح کے مختلف طریقوں سے اس کی تربیت کرنا، ممیز ہونے تک بچے کی پرورش کو حضانت کہتے ہیں۔

اس کے بعد سنِ بلوغ تک اس کی پرورش کرنے کو کفالت کہتے ہیں حضانت نہیں۔

حضانت کو مشروع کرنے کی حکمت

حضانت کو مشروع کرنے کی حکمت بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت سے متعلق ذمے داریوں کو منظم کرنا ہے۔

کبھی شوہر بیوی میں جدائی ہوتی ہے یا دونوں میں اختلاف ہوتا ہے یا اپنے بچوں کی تربیت کے لئے دونوں تنگدست رہتے ہیں۔

اگر معاملہ میاں بیوی کا جھگڑا ختم ہونے کے حوالہ کیا جائے یا جھگڑے میں دو میں سے غالب آنے والے کی طرف سے مقرر کردہ فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو اس میں بچوں پر بہت بڑا ظلم ہوگا اور ان کے مفادات کی پامالی ہوگی، کبھی اس میں بچوں کے لئے بدبختی اور ہلاکت ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے ایسے اصولوں کو متعین کرنا ضروری ہے جن کے ذریعے بچوں کی پرورش اور ان کی رعایت سے متعلق ذمے داریوں کو متعین کیا جائے اور اس طور پر ان کو مرتب کیا جائے کہ بچوں کے ذمے داروں کے درمیان رونما ہونے والے کسی بھی جھگڑے یا اختلاف کی وجہ سے بچوں کے مفادات متاثر نہ ہوں۔

حضانت کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

اگر کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اوران سے بچہ ہو چا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ تمیز کی عمر تک نہ پہنچا ہو تو ماں اس کی حضانت کی باپ سے زیادہ حق دار ہے۔

حضانت میں ماں کو باپ پر مقدم کرنے کے اسباب:

ماں مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے بچہ کی حضانت کی باپ سے زیادہ حق دار ہے:

۱۔ماں میں شفقت کی صفت زیادہ پائی جاتی ہے اور دیکھ بھال وتربیت میں زیادہ صبر کرتی ہے۔

۲۔عورت بچوں کی پرورش اوران کی رعایت میں زیادہ نرم ہوتی ہے۔اور بچوں کے لئے ضروری جذبات اور شفقت دینے پر زیادہ قدرت رکھتی ہے۔

حضانت میں ماں کے حق دار ہونے کی دلیل:

حضانت ماں کا حق ہےاوراس کا یہ حق باپ کے حق پر مقدم ہے،اس کی دلیل امام ابو داود(الطلاق:۲۲۷۶) کی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا: اللہ کے رسول !میرا یہ بیٹا،اس کے لیے میرا پیٹ برتن تھا اور میری چھاتی مشکیزہ اور میری گود پناہ گاہ تھی،اس کے والد نے مجھے طلاق دی ہے اور وہ مجھ سے اس کو چھیننا چاہتا ہے۔یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"تم اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تم شادی نہ کرلو"۔

ماں کے بعد حضانت کا زیادہ حق دار کون ہے؟

اگر بچے کی ماں نہ ہو یا موجود ہو لیکن وہ بچہ کی پرورش سے انکار کردے تو ماں کے بعد حضانت کی سب سے پہلی حقدار نانی ہے پھر دادی کو پھر اس کی ماؤں کو، جو سب سے قریبی رشتے دار ہے اس کو مقدم کیا جائے گا۔پھر خالہ کو پھر پھوپھی کو۔پھر بھتیجیوں کو پھر بھانجیوں کو۔

حضانت میں عورتوں کو مقدم کرنے کی حکمت:

حضانت میں عورتوں کو مقدم کرنے کی حکمت وہی ہے جو ہم نے ماں کے زیادہ حق

دار ہونے کی حکمت میں بتایا ہے کہ عام طور پر عورتیں بچوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال میں زیادہ نرم ہوتی ہیں اور بچوں کی مشکلات پر زیادہ صبر کرنے والی ہوتی ہیں اور بچوں سے زیادہ عطف ومہربانی اور شفقت سے پیش آنے والی ہوتی ہیں۔

مردوں کی حضانت

ہم نے بتایا کہ حضانت میں عورتوں کا حق مقدم ہے کیوں کہ وہ اس کی زیادہ لائق ہیں، لیکن اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر بچے کی کوئی قریبی رشتے دار عورت نہ ہو یا موجود ہو لیکن حضانت سے انکار کر دے تو کیا یہ حق مردوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے؟ جی ہاں، یہ حق مردوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ ان میں محرم وارث کو وراثت کی ترتیب کے مطابق مقدم کیا جائے گا سوائے دادا کے، اس کو بھائیوں پر مقدم کیا جائے گا پھر غیر محرم کو وراثت کی ترتیب کے مطابق مقدم کیا جائے گا۔

چنانچہ ترتیب اس طرح ہوگی:

باپ پھر دادا اوپر تک

پھر حقیقی بھائی پھر علاتی بھائی پھر حقیقی بھتیجہ پھر علاتی بھتیجہ پھر حقیقی چچا پھر علاتی چچا پھر حقیقی چچازاد بھائی پھر علاتی چچازاد بھائی۔

حضانت کے حق میں قریبی رشتے دار کو مقدم کیا جائے گا، کیوں کہ عام طور پر قریبی رشتے دار دور کے رشتے دار سے زیادہ شفیق اور مہربان ہوتا ہے اور بچے کی دیکھ بھال کا حق ادا کرنے، اس کی بہترین تربیب کرنے اور بچوں کے مفادات کا خیال رکھنے کا زیادہ خواہش مند رہتا ہے۔

بچوں کے رشتے داروں میں سے مرد اور عورت دونوں موجود ہوں

اگر بچے کے رشتے داروں میں سے مرد اور عورتیں جمع ہو جائیں اور وہ حضانت کے سلسلے میں جھگڑا کریں تو ماں کو ابو داود کی روایت اور بچے پر زیادہ مہربان ہونے کی وجہ سے مقدم کیا جائے گا۔

پھر نانیوں کو کہ شفقت و مہربانی میں وہ ماں کی طرح ہی ہیں، اس میں سب سے قریب نانی کو مقدم کیا جائے گا۔

پھر باپ کو مقدم کیا جائے گا کیوں کہ وہ بچے کا اصل ہے۔

پھر دادی کو پھر دادا کو۔

پھر حقیقی بہن کو پھر حقیقی بھائی کو۔ اسی طرح اخیر تک۔

اگر رشتے داری میں سب برابر ہوں اور وہ مرد اور عورتیں ہوں مثلاً حقیقی بھائی اور بہنیں ہوں تو عورتوں کو مردوں پر مقدم کیا جائے گا کیوں کہ پرورش کی لائق عورتیں ہوتی ہیں اور وہی افضل ہوتی ہیں۔

اگر صرف مرد ہوں یا صرف عورتیں، اور ان کے مابین حضانت کے بارے میں جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی، جس کے نام قرعہ نکلے گا بچہ اس کے حوالہ کیا جائے گا۔

بچہ کی حضانت کب تک رہتی ہے؟

شرعی طور پر بچہ کی حضانت اس کے مکمل ممیز ہونے تک جاری رہتی ہے، تمیز سے مراد یہ ہے کہ بچہ خود سے اپنے کام کرنے لگے اور اس کو کسی کے تعاون کی ضرورت نہ پڑے۔

اپنے کاموں سے مراد کھانا پینا، قضائے حاجت کرنا اور گندگیوں سے پاکی حاصل کرنا اور وضو وغیرہ طہارت کے کاموں کی انجام دہی ہے، ممیز ہونے کی عمر سات سال متعین کی گئی ہے، کیوں کہ اس عمر میں عام طور پر بچہ مکمل طور پر ممیز بن جاتا ہے، جب بچہ سات سال مکمل کرے اور وہ ممیز بن جائے تو حضانت کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔

اور اس وقت سے دیکھ ریکھ کا دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جس کو کفالت کہا جاتا ہے۔

جب بچہ سات سال مکمل کرے اور وہ ممیز ہو تو اس وقت اس کو والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا، وہ جس کا بھی انتخاب کرے گا بچہ اس کے حوالہ کیا جائے گا۔

امام ترمذی (الاحکام: ۱۳۵۷) نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے

کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو اس کے باپ اور ماں کے درمیان اختیار دیا۔

ابو داود (الطلاق: ۲۲۷۷) وغیرہ کی دوسری روایت میں ہے کہ ایک عورت آئی اور کہا: اللہ کے رسول! میرا شوہر میرا بچہ لے جانا چاہتا ہے جب کہ اس بچے نے مجھے بئر ابو عنبہ سے پلایا ہے (یعنی میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے) اور اس نے مجھے فائدہ پہنچایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس بارے میں تم دونوں قرعہ کرو''۔ اس کے شوہر نے کہا: میرے بچے کے سلسلے میں مجھ سے کون حق جتائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ تمہارا باپ ہے اور یہ تمہاری ماں، چنانچہ تم ان میں سے جس کا چاہے ہاتھ پکڑو''۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس کو لے کر چلی گئی۔

اگر ممیّز بچہ اپنے باپ کا انتخاب کرے یا اس میں حضانت کی اہلیت نہ ہو تو اس کی جگہ دادا حضانت کا حق دار ہوگا، دادا نہیں تو پردادا اوپر تک، اسی طرح بھائی اور چچا، اور بھائی اور چچا کی عدم موجودگی میں چچازاد بھائی، وہی ترتیب یہاں بھی ملحوظ رکھی جائے گی جو بیان کی گئی ہے۔

البتہ بچی اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ اس کو دیکھنے سے شہوت ابھرتی ہو یا وہ مراہقت کی عمر ہو تو اس کا اپنے چچازاد بھائی کی کفالت میں باقی رہنا جائز نہیں ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو تو وہ بھروسہ مند عورت کے پاس رہے گی اور اس کا چچازاد بھائی اس کی مدد کرے گا۔

ممیّز کی عمر تک پہنچنے کے بعد والدین کے درمیان بچے کو اختیار دینے کی حکمت:

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضانت میں ماں کو باپ پر مقدم کیوں کیا جاتا ہے اور بچہ ممیّز ہونے پر حضانت کی مدت انتہا کو پہنچتی ہے کیوں کہ تمیز سے پہلے بچہ ماں کی نگرانی سے مستغنی نہیں ہوتا ہے اور ماں کا قائم مقام باپ پر کوئی دوسرا مرد نہیں ہو سکتا ہے۔

البتہ جہاں تک کفالت کا تعلق ہے جو عمومی دیکھ ریکھ ہے تو اس کی صلاحیت ماں اور باپ دونوں رکھتے ہیں، کیوں کہ بچہ اپنے اکثر کام خود سے کر سکتا ہے اور اس میں عقل کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان تمام امور کے بعد مناسب یہ ہے کہ بچے کو ماں اور باپ کے درمیان اختیار دیا

جائے، وہ ان میں سے جس کو چاہے منتخب کرے۔

حضانت کی شرطیں

حضانت کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ عقل مند ہو: چنانچہ پاگل کے لئے حضانت کا حق نہیں ہے، چاہے رک رک کر پاگل پن کے دورے پڑتے ہوں، کیوں کہ حضانت ولایت ہے اور پاگل کو ولایت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح کا شخص حفاظت اور دیکھ ریکھ نہیں کرسکتا بلکہ خود اس کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ مسلمان ہو: اگر پرورده بچہ مسلمان ہو، چاہے حکماً ہی مسلمان کیوں نہ ہو یعنی اس کے والدین میں سے کوئی ایک مسلمان ہوتو وہ دین کے اعتبار سے زیادہ شریف کے تابع ہوگا، چنانچہ مسلمان کے حق میں کافر کی حضانت جائز نہیں ہے، کیوں کہ رب کریم نے بتایا ہے کہ حضانت ولایت ہے اور کافر کو کسی مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہے۔

البتہ اگر بچہ کافر ہو تو مسلمان اور کافر دونوں کو حضانت کا حق حاصل ہے۔

۳۔ پاک دامن اور امانت دار ہو:

عفت و پاکدامنی اور امانت کا مطلب یہ ہے کہ پرورش کرنے والا فاسق نہ ہو، کیوں کہ فاسق ولی نہیں بن سکتا اور اس پر کسی چیز کے بارے میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اس کا پاک دامن دین دار اور عادل ہونا ضروری ہے۔

عدالت ظاہری امور اور نظر آنے والے معاملات سے ثابت ہو جاتی ہے، اس کے ثابت ہونے کے لئے گواہوں اور دلیلوں کی ضرورت نہیں ہے، البتہ پرورش کرنے والے کی اہلیت اور عدالت میں جھگڑا ہو جائے تو اس کے عادل ہونے کے لئے دلائل اور بینات پر مشتمل قاضی کے سامنے ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔

۴۔ مقیم ہو: حضانت کا حق دار ہونے کے لئے بچے کے شہر میں مقیم رہنا ضروری ہے۔

اگر ماں جو اپنے بچے کی حضانت کی سب سے زیادہ حق دار ہے کسی ضروری سفر مثلا

حج، تجارت اور تفریح وغیرہ پر چلی جائے اور وہ اپنے ساتھ بچے کو نہ لے جا سکے تو وہ سفر سے واپس آنے تک مقیم شخص ماں سے زیادہ حضانت کا حق دار ہے، چنانچہ بچہ کو ماں کے واپس آنے تک نانی کے حوالے کیا جائے گا۔

اگر سفر سے واپس نہ آنے کے ارادے سے دوسرے شہر منتقل ہو جائے تو حضانت کے حق کا ساقط ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ راستہ پر امن ہو اور پرورش کرنے والا جس شہر میں رہنا چاہتا ہو وہ شہر بھی پر امن ہو، اگر ماں باپ دونوں ضرورت کی وجہ سے سفر پر مجبور ہو جائیں تو ماں کا حق باقی رہتا ہے اور اس وقت سفر حضانت سے رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔

۵۔ ماں کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے:

اگر ماں شادی کرے تو حضانت میں اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے چاہے یہ شوہر اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو یا دوسرا شوہر بچے کو اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہو۔

اس کی دلیل ابو داود (۲۲۷۶) کی سابقہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "تم اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تم شادی نہ کر لو۔

عقل بھی یہی بات کہتی ہے کہ جب ماں دوسرے سے شادی کرے تو اس کا حق ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ شوہر کے حق میں مشغول رہنے کی وجہ سے اپنے بچے پر توجہ دینے سے مشغول ہو جاتی ہے پھر بچے کی دیکھ ریکھ اور اس پر توجہ کی کوئی ضمانت اور گیارنٹی نہیں رہتی۔

لیکن اس سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:

۱۔ بچے کا باپ اس بات پر راضی ہو کہ بچہ اس کی ماں کے شوہر کے ساتھ اپنی ماں کے پاس ہی رہے، اس صورت میں حضانت میں ماں کا حق باقی رہتا ہے اور نانی کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ ماں کا نیا شوہر بچے کا قریبی رشتے دار ہو جس کو بھی حضانت کا حق پہنچ سکتا ہو چاہے اس کا درجہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، اس صورت میں حضانت میں ماں کا حق باقی رہتا ہے جب یہ شوہر اس کی حضانت پر راضی ہو۔

کیوں کہ اس شوہر کو بچے کی دیکھ ریکھ کا حق ہے اور بچے کی کفالت اور اس کے امور پر

توجہ دینے میں اس میں شفقت اور مہربانی پائی جاتی ہے۔

۶۔دائمی مرض اور بچہ پر اثر انداز ہونے والی کوئی بری عادت نہ ہو۔

اگر ماں کو سخت ترین مرض ہو مثلاً فالج اور سل وغیرہ یا وہ اندھی بہری ہو تو اس کو حضانت کا حق نہیں ہے، کیوں کہ وہ ایسی حالت میں ہے کہ بچے کی حضانت کا حق ادا نہیں کرسکتی ہے۔

اگر حضانت کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے:

اگر مذکورہ بالا چھ شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو حضانت کا حق ختم ہوجاتا ہے اور یہ حق بعد والے میں منتقل ہوجاتا ہے، نانی پھر بہن پھر خالہ۔اسی طرح اخیر تک۔

حضانت کی کوئی شرط فوت ہونے کے بارے میں معلوم کرنے کا طریقہ:

حضانت کی کوئی شرط نہ پائے جانے کی تاکید مندرجہ ذیل تین امور میں سے کسی ایک سے کی جائے گی:

۱۔حضانت کرنے والا/والی اقرار کرے:

اگر ماں اقرار کرے کہ وہ شادی شدہ ہے یا اس کو دائمی مرض لاحق ہے تو حضانت میں اس کا حق ساقط ہوجائے گا۔

۲۔مخالف دعوی پیش کرے:

اگر حضانت کے سلسلے میں مخالف یہ دعوی پیش کرے کہ حضانت کرنے والی میں حضانت کی کوئی شرط پائی نہیں جاتی ہے اور اس دعوی کے ساتھ معتمد شواہد بھی ہوں تو اس صورت میں حضانت میں اس کا حق ساقط ہوجاتا ہے۔

۳۔قاضی تحقیق کرے:

جب حضانت کرنے والی میں کسی شرط کے نہ پائے جانے کا شک ہوجائے تو قاضی یا حاکم تحقیق کرے اور اپنی تحقیقات سے اس کو کسی شرط کے نہ پائے جانے کا یقین ہوجائے تو اس وقت حضانت کا حق ختم ہوجاتا ہے۔

رضاعت

رضاعت کی تعریف:

رضاعت کے لغوی معنی پستان کو چوسنا اور اس کا دودھ پینا ہے۔

رضاعت کے شرعی معنی کسی عورت کا دودھ یا اس سے بنائی ہوئی کوئی چیز بچے کے معدے یا دماغ میں جانے کے ہیں۔

رضاعت مشروع کرنے کی دلیل:

بچے کو اس کی ماں کے علاوہ دوسری عورت کا دودھ پلانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، یہ اسلام سے پہلے عام رواج تھا، جب اسلام آیا تو اس کو باقی رکھا، اس کو حرام نہیں کیا، کیوں کہ اس میں کبھی کبھار مفاد ہے اور اس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔مثلاً بچے کی ماں کا انتقال ہو جائے یا اس میں کوئی ایسی بیماری ہو جو دودھ پلانے میں رکاوٹ بنتی ہو تو بچے کی زندگی کی حفاظت کے لئے کسی عورت کا دودھ پلانا ضروری ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:''اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ اُخْرٰى'' (الطلاق:۶) اگر تم (بچے کو دودھ پلانے میں) اختلاف کرو تو اس کو دوسری عورت دودھ پلائے۔

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے:'' وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ'' (بقرہ:۲۳۳) اگر تم اپنے بچوں کو دودھ پلانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

دودھ پلانا ماں پر فرض ہے یا اس کا حق ہے؟

اگر یہ بات کہی جائے کہ دودھ پلانا ماں پر فرض ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو

اپنے بچے کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا چاہے وہ اس پر راضی ہو یا راضی نہ ہو جب تک وہ دودھ پلانے کی قدرت رکھتی ہو اور کسی شرعی عذر کی بنا پر معذور نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ دودھ پلانا ماں کا حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کو دودھ پلانے اور نہ پلانے میں اختیار ہے۔

اگر ماں اپنے بچے کو دودھ پلانا چاہتی ہو تو شوہر کے لئے اس کو اس کے حق سے روکنا جائز نہیں ہے اور نہ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل ہے۔

اگر وہ بچے کو دودھ پلانا نہ چاہتی ہو تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لئے کسی دوسری عورت کو مقرر کرے۔

جب فرض اور حق کے درمیان فرق واضح ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ اپنے بچے کو دودھ پلانے میں ماں کا تعلق کیا ہے؟

یہ حق کا تعلق ہے؟ یا وجوب کا تعلق ہے؟

امام شافعیؒ کے مفتی بہ قول کے مطابق رضاعت ماں کا حق ہے، اس پر واجب نہیں ہے۔

چنانچہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی ملے تو اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ کوئی نہ ملے تو ضرورت کی بناء پر دودھ پلانا اس پر واجب ہو جاتا ہے۔

اس کی دلیل اللہ عزوجل یہ فرمان ہے: ''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ '' (بقرہ ۲۳۳) اور عورتیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی اس کے لیے جو رضاعت کو مکمل کرنا چاہتا ہے، اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے: ''اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى '' (الطلاق: ٦) اگر تم (بچے کو دودھ پلانے میں) اختلاف کرو تو اس کو دوسری عورت دودھ پلائے۔

یہ بھی ارشاد خداوندی ہے: ''فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ '' (سورہ

طلاق ٦)پس اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو۔

ان آیتوں میں دلیل اس طرح ہے کہ رضاعت ماں کا حق ہے اور اس پر ضروری نہیں ہے کہ اللہ عزوجل نے جب یہ فرمایا: ''وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ ''(مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں گی)تو اس کا احتمال ہے کہ اس کے معنی یہ ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کو دودھ پلانا لازمی ہے۔

یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ مائیں ہی اپنے بچوں کو دودھ پلانے کا حق رکھتی ہیں۔

اگر اللہ سبحانہ وتعالی یہ فرماتا: ماؤں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا ضروری ہے۔تو دوسرا احتمال ختم ہوجاتا اور پہلا احتمال ہی باقی رہتا، چنانچہ جب ہم اللہ تبارک تعالی کا یہ فرمان پڑھتے ہیں''اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى ''تو پہلی آیت کے دوسرے معنی راجح ہوجاتے ہیں،یعنی دودھ پلانا ماں کا حق ہے،اگر ماں پر ضروری ہوتا تو اللہ سبحانہ وتعالی یہ نہیں فرماتا:''فسترضع له اخرى''۔کیوں کہ شوہر کے ساتھ جھگڑا اور اختلاف دودھ پلانے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

جب ہم یہ آیت کریمہ پڑھتے ہیں''فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ''تو پہلی آیت کے دوسرے معنی راجح ہونے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہی معنی متعین ہوجاتا ہے کیوں کہ اگر دودھ پلانا ماں پر واجب ہوتا تو وہ اس پر اجرت کی مستحق نہیں ہوتی، کیوں کہ واجب پر اجرت نہیں ہوتی، جب اللہ سبحانہ وتعالی نے ماؤں کو اجرت دینے کا حکم دیا ہے اگر وہ اس کا مطالبہ کریں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو دودھ پلانے میں اختیار ہے، وہ دودھ پلانے پر مجبور نہیں ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دودھ پلانا ماں کا حق ہے،اگر وہ اس حق کا مطالبہ کرے تو اس کو یہ حق دینا ضروری ہے، یہ اس پر واجب نہیں ہے، چنانچہ اگر وہ انکار کردے تو دودھ پلانے پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، مگر یہ کہ صرف وہی دودھ پلانے والی ہو، کوئی دوسری دودھ پلانے والی نہ ملے تو ضرورت کی وجہ سے اس پر واجب ہوجاتا ہے۔

دودھ پلانا حق ہونے، نہ کہ واجب ہونے کی وجہ سے مرتب ہونے والے احکام
بیان کردہ تفصیلات اور رضاعت سے یہ بات سمجھ میں آہی گئی ہوگی کہ دودھ پلانا صرف ماں کا حق ہے، نہ کہ واجب ہونے کی وجہ سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ اگر بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے سے انکار کردے تو شوہر کے لئے اس کو مجبور کرنا جائز نہیں ہے، اگر وہ مجبور کرے اور بیوی اس کی بات نہ مانے تو وہ نافرمان نہیں مانی جائے گی۔
اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ اس کے علاوہ بچے کو دودھ پلانے کے لئے کوئی دوسری عورت لائق نہ ہو تو ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ دودھ پلانے پر اس کو مجبور کیا جائے، یہ ضرورت بچے کی زندگی کی حفاظت کے لیے ہے۔

۲۔ اگر بیوی دودھ پلانے پر اجرت طلب کرے تو بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے عرف کے مطابق اپنی بیوی کو شوہر کے لئے اجرت دینا ضروری ہے۔
اگر اجرت کا مطالبہ نہ کرے جیسا کہ آج کل عمومی ماحول ہے تو اس صورت میں شوہر کے لئے اجرت دینا ضروری نہیں ہے، اگر عورت اجرت طلب نہ کرے اور اس میں بے رغبتی ظاہر کرے تو اس کے مطالبہ کا حق ختم ہوجاتا ہے۔

رضاعت کی وجہ سے رشتے داری پر مرتب ہونے والے اثرات:

جب کوئی عورت کسی اجنبی بچے کو دودھ پلائے تو یہ اس کا رضاعی بیٹا بن جاتا ہے اور اس کا شوہر (جس کی وجہ سے اس عورت کو دودھ آتا ہے) اس بچے کا باپ بن جاتا ہے اور اس رضاعت کی وجہ سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ دودھ پلانے والی عورت سے دودھ پیتے ہوئے شخص کے لئے شادی حرام ہوجاتی ہے، اسی طرح مندرجہ ذیل عورتوں سے بھی شادی حرام ہوجاتی ہے:
مرضعہ (دودھ پلانے والی) کی بہن، کیوں کہ یہ اس کی رضاعی خالہ بن جاتی ہے۔
مرضعہ کی بیٹی، کیوں کہ وہ رضاعی بہن بن جاتی ہے۔

مرضعہ کے بیٹے اور بیٹیوں کی بچیاں کیوں کہ وہ اس کی رضاعی بھانجیاں اور بھتیجیاں بن جاتی ہیں۔

مرضعہ کی ماں، کیوں کہ وہ رضاعی نانی بن جاتی ہے۔

اسی طرح دودھ پینے والے پر رضاعی باپ کے مندرجہ ذیل رشتے دار عورتوں سے شادی حرام ہوجاتی ہے: رضاعی والد کی بیٹی، چاہے وہ دوسری بیوی سے ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ وہ رضاعی بہن بن جاتی ہے۔

رضاعی باپ کی اولاد کی بیٹیاں، چاہے بیٹوں کی بیٹیاں ہوں یا بیٹوں کی، کیوں کہ وہ اس کی رضاعی بھانجیاں اور بھتیجیاں بن جاتی ہیں۔

۔رضاعی باپ کی ماں، کیوں کہ وہ رضاعی دادی بن جاتی ہے۔

۲۔مرضعہ اور مرضعہ کے مندرجہ بالا تمام رشتے داروں کی شادی دودھ پینے والے اس بچے سے شادی حرام ہوجاتی ہے جیسا کہ ہم نے وضاحت کردی ہے۔اسی طرح اس کے بچوں سے بھی شادی حرام ہوجاتی ہے، کیوں کہ اگر مرضعہ کی ماں کی حیثیت بچے کے لئے نسبی ماں کی طرح مان لیں گے تو یہ سب عورتیں اس کے لیے حرام ہوجاتی ہیں،اسی طرح رضاعی ماں کا حکم ہے۔

جس طرح رضیع (دودھ پینے والا بچہ) کے لئے اپنی مرضعہ کی بیٹی سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس کی رضاعی بہن بن جاتی ہے،اسی طرح رضیع کے بیٹے کو بھی اس سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔کیوں کہ وہ اس کی رضاعی پھوپھی بن جاتی ہے۔اسی طرح دوسرے رشتے داروں کا مسئلہ ہے۔

۳۔مرضعہ اور اس کے مذکورہ رشتے دار عورتوں کے لئے رضیع کے بھائی اور اس کے اصول مثلاً والد اور چچا وغیرہ سے شادی کرنا جائز ہے۔کیوں کہ وہ سب مرضعہ اور اس کے رشتے داروں کے لئے اجنبی ہیں۔

رضاعت کی حرمت کی دلیل:

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:''وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ

مِنَ الرَّضَاعَةِ'' (نساء ۲۳) اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمھاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کر دی گئی ہیں)۔

امام بخاری (۲۵۵۳) اور امام مسلم (۱۴۴۴) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت سے وہی حرام ہوتا ہے جو ولایت سے حرام ہوتا ہے''۔

امام بخاری (الشھادات: ۲۵۰۲) اور امام مسلم (الرضاع: ۱۴۴۷) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حمزہؓ کی دختر کے بارے میں فرمایا ''وہ میری رضاعی بھتیجی ہے''

حرام بنانے والی رضاعت کی شرطیں:

رضاعت سے رشتے داری اسی وقت ثابت ہوتی ہے اور شادی حرام ہوتی ہے جب اس میں مندرجہ ذیل دو شرطیں پائی جائیں:

۱۔ رضیع کی عمر رضاعت کے وقت دو سال مکمل نہ ہوئی ہو، اگر دو سال گذرنے کے بعد دودھ پلائے تو حرمت میں اس رضاعت کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور کوئی رشتہ داری ثابت نہیں ہوتی ہے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے ''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ '' (بقرہ ۲۳۳) اور عورتیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی اس کے لیے جو رضاعت کو مکمل کرنا چاہتا ہے، اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔

اللہ تعالی کا یہ بھی فرمان ہے: ''وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ '' (لقمان: ۱۴) اور اس کا دودھ چھڑانا دو سالوں میں ہے۔

امام دار قطنی (الرضاع: ۱۷۴/۴) نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

”رضاعت نہیں ہے مگر دو سالوں کے اندر ہو“

امام ترمذی (الرضاع:۱۱۵۲) نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رضاعت سے وہی حرام ہے جو رضاعت کی مدت میں انتڑیوں تک پہنچے“۔ یعنی دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے دودھ معدے تک پہنچے اور دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان میں ہے ”وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ“ (لقمان:۱۴) اور اس کا دودھ چھڑانا دو سالوں میں ہے۔

امام بخاری (النکاح:۴۸۱۴) اور مسلم (الرضاع: ۱۴۵۵) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس آئے اور ان کے پاس ایک مرد بیٹھا ہوا تھا تو آپ ﷺ کا چہرہ تبدیل ہوگیا تو آپ ﷺ نے اس کو ناپسند کیا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے کہا: یہ میرا بھائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم دیکھو کہ تمہارے بھائی کون ہیں، رضاعت بھوک سے ہوتی ہے“۔

یعنی رضاعت کی وجہ سے محرم اس وقت ہوتا ہے جب اسی مدت کے دوران دودھ پلایا جائے جس مدت میں دودھ نہ ملنے پر بچہ بھوکا رہتا ہو اور دودھ ملنے پر سیراب ہوتا ہو، اور یہ چھوٹے بچے کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

۲۔ الگ الگ اوقات میں پانچ مرتبہ دودھ پیئے:

دودھ پلانے میں وقفے کا اعتبار عرف کا ہوگا، اگر بچہ دودھ پینا سیراب ہوکر اور اعراض کرتے ہوئے چھوڑے تو اس کو مستقل رضاعت مانا جائے گا، اگر وہ کھیلتے ہوئے چھوڑ دے اور دوبارہ پینے لگے، یا ایک پستان سے دوسرے پستان کی طرف منتقل ہوجائے تو ایک ہی رضاعت مانا جائے گا۔

امام مسلم (الرضاع:۱۴۵۲) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: قرآن میں نازل ہوئے احکام میں سے ایک یہ ہے: (**عشر رضاعات معلومات يحرمن**) دس متعین رضاعت (گھونٹ) حرام کردیتی ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہوکر

پانچ متعین رضاعت کا حکم آیا، رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو پڑھے جانے والے قرآن میں سے یہ آیت بھی تھی۔

یعنی یہ حکم اخیر میں منسوخ ہوا یہاں تک کہ آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو بعض لوگ ابھی تک اس کو بطور قرآن پڑھ رہے تھے کیوں کہ اس آیت کے منسوخ ہونے کی بات ان تک نہیں پہنچی تھی۔

امام مسلم (الرضاع:۱۴۵۱) نے حضرت ام فضل رضی اللہ عنھا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ایک رضاعت یا دو رضاعت حرام نہیں کرتے یا ایک مرتبہ چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا''۔

رضاعت کی وجہ سے پیدا ہونے والی رشتے داری سے دو احکام مرتب ہوتے ہیں۔

۱۔ایک حکم کا تعلق حرمت سے ہے۔

۲۔دوسرے حکم کا تعلق حلال سے۔

جہاں تک حرمت کا تعلق ہے تو یہ نکاح سے متعلق ہے۔

جہاں تک حلال کا تعلق ہے تو خلوت اور دیکھنے سے متعلق ہے۔

جب دو لوگوں کے درمیان رضاعت کی رشتے داری پیدا ہو جاتی ہے تو اس رشتے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نکاح اسی طرح حرام ہو جاتا ہے جس طرح نسبی رشتے کی وجہ سے نکاح حرام ہو جاتا ہے اور نسبی رشتے کے جتنے احکام ہیں وہ تمام احکام یہاں بھی نافذ ہوتے ہیں ، چنانچہ ماں، نانی اوپر تک، بیٹی، پوتی نیچے تک، حقیقی بہن، علاتی بہن، اخیافی بہن، پھوپھی چاہے دور کی ہی کیوں نہ ہو یعنی دادی کی بہن وغیرہ، حقیقی، علاتی اور اخیافی بھتیجی اور حقیقی علاتی اور اخیافی بھانجی یہ سب نسبی رشتے داری کی وجہ سے محرم ہیں۔

اگر یہی رشتے داریاں رضاعت کے راستے سے ہوں تو بھی یہی حرمت ثابت ہو جاتی ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی بھی فرق نہیں ہے۔

اس کی مکمل تفصیلات گذر چکی ہیں، دوبارہ ہم ان کو بیان کرنا نہیں چاہتے ہیں، نسبی

رشتے داری سے سسرالی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ معلوم ہے، اس لیے بیوی کی ماں اپنے داماد کے لئے نسبی رشتے داری کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بیوی کی بیٹی اور باپ کی بیوی اور بیٹے کی بیوی نسبی رشتے داری کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہے۔

یہ سب عورتیں پہلی مثال میں شوہر، دوسری مثال میں بیٹے پر اور تیسری مثال میں باپ پر حرام ہو جاتی ہیں اور اس کا سبب مصاہرت (سسرالی رشتہ) ہے۔

اگر یہی رشتے داریاں رضاعت کی وجہ سے پیدا ہوں تو مصاہرت کے نسبت یہی حکم ہو گا۔

یعنی بیوی کی رضاعی ماں شوہر پر حرام ہو گی۔

بیوی کی رضاعی بیٹی اور رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہو گی۔

رضاعی باپ کی بیوی اور رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہو گی۔

اس کا مطلب مصاہرت ہے، رضاعی رشتے دار پر بھی رضاعت سے وہ حرام ہو جاتا ہے جو نسب سے حرام ہوتا ہے۔ (بخاری: ۲۵۰۲، مسلم: ۱۴۴۷)

جہاں تک حلال ہونے کا تعلق ہے تو اس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

جو چیزیں نسبی رشتے داری کی وجہ سے محرم ہونے کی وجہ سے حلال ہو جاتی ہیں وہ سب چیزیں رضاعی رشتے داری کی وجہ سے حلال ہو جاتی ہیں، چنانچہ اس کو دیکھنا جائز ہو جاتا ہے، جس طرح کی خلوت اجنبی مرد اور عورت کے درمیان حرام ہے یہ ان دونوں کے درمیان جائز ہے اور اس کے ساتھ تین دن سے زیادہ کا سفر کرنا جائز ہے۔

البتہ شہوت سے دیکھنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ نسبی محارم کو بھی شہوت سے دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے متاخرین فقہاء نے کسی ضرورت کے بغیر اپنے بچے کے علاوہ دوسرے کو دودھ پلانا مکروہ کہا ہے۔ اسی طرح رضاعی رشتے دار عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو بھی مکروہ قرار دیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اس اختلاط سے فتنے ہوتے ہیں کیوں کہ دین کا تسلط کمزور ہو گیا ہے اور قریبی رشتے دار عورتوں اور مردوں کے درمیان فطری آڑ بھی ختم ہو گئی ہو۔

نسب کے احکام

تمہید:

نسب کے معنی رشتے داری کے ہیں، نسب بہت سے احکام کی اہم بنیاد ہے۔
مثلا وراثت، نکاح کا حرام اور حلال ہونا، حق ولایت، وصیت اور ان کے علاوہ دوسرے احکام۔ اس وجہ سے ان دلائل کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جن سے نسب ثابت ہوتا ہے تاکہ شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور نسب کے ثابت کرنے کے طریقوں میں کوئی بے چینی باقی نہ رہے، اب سوال یہ ہے کہ دو افراد کے درمیان شرعی طور پر نسب کیسے ثابت ہوتا ہے جس کے بموجب اس سے متعلق شرعی احکام مرتب ہوتے ہوں؟

نسب کو ثابت کرنے والے امور:

مندرجہ ذیل امور میں سے کسی ایک سے شرعی طور پر نسب ثابت ہوتا ہے:
۱۔ گواہی: گواہی میں دو ایسے مردوں کا پایا جانا ضروری ہے جن میں شہادت وگواہی کے صحیح ہونے کی شرطیں پائی جاتی ہوں، ان شرطوں کا تذکرہ نکاح کے باب میں کیا جاچکا ہے، چنانچہ عورتوں کی گواہی سے اور ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے نسب ثابت نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ نسب نکاح کی ایک شاخ اور فرع ہے اور نکاح سے عام طور پر مرد ہی واقف رہتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔
۲۔ اقرار: مثلا کوئی مرد اقرار کرے کہ وہ زید کا والد ہے یا زید اقرار کرے کہ وہ اس شخص کا بیٹا ہے۔

اقرار کے صحیح ہونے کی شرطیں:

اقرار کے صحیح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ حس اس اقرار کو نہ جھٹلاتا ہو، مثلاً دونوں کی عمریں ایسی ہوں کہ ان کا باپ بیٹا ہونا ممکن نہ ہو۔

اگر دونوں کی عمریں ایسی ہوں کہ دونوں کا باپ بیٹا ہونے کا تصور بھی نہ کیا جا سکے، مثلاً دونوں کی عمر یکساں ہو تو یہ اقرار صحیح نہیں ہوگا، اور اس سے نسب ثابت نہیں ہوگا، کیوں کہ حس اس کو جھٹلاتی ہے۔

۲۔ اس اقرار کو شریعت نہ جھٹلاتی ہو، شریعت کا جھٹلانا یہ ہے کہ جس بچے کے بارے میں اقرار کیا جائے اس کا نسب دوسرے سے مشہور و معروف ہو، کیوں کہ کسی دوسرے شخص سے ثابت نسب اقرار سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتا، چاہے بچہ اس کی تصدیق کرے یا نہ کرے۔

۳۔ خود بچہ بھی اقرار کرنے والے کی تصدیق کرے، اگر یہ بچہ تصدیق کرنے کا اہل ہو یعنی وہ مکلّف ہو، کیوں کہ اس کو اپنے نسب میں حق حاصل ہے اور وہی دوسروں کے مقابلے میں اس بات سے سب سے زیادہ واقف ہے۔

۴۔ یہ اقرار کرنے والے کو کوئی فائدہ یا نقصان نہ ہو رہا ہو، اگر اس کو کوئی فائدہ یا نقصان ہو رہا ہو تو اس کی یہ بات اقرار نہیں مانی جائے گی، بلکہ اس کو دعوی مانا جائے گا اور دعوی اسی وقت قبول ہوتا ہے، جب گواہی وغیرہ کوئی بینہ (ثبوت) پایا جائے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے نوجوان کے بارے میں کہے جس کا انتقال ہو چکا ہو اور اس کے پاس مال ہو، یہ میرا بیٹا ہے، اس صورت میں اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو اقرار مانا نہیں جائے گا، کیوں کہ اقرار کی شان یہ ہے کہ اقرار کرنے والے پر ذمے داری عائد ہوتی ہے یا اس پر بوجھ آتا ہے۔

گواہی بھی نہیں ہے، کیوں کہ گواہی اس وقت معتبر ہوتی ہے جب گواہی دینے والے کے لئے کوئی فائدہ پہنچانے والی نہ ہو اور اس سے نقصان دور کرنے والی بھی نہ ہو۔

اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: ”ظنین کی گواہی جائز نہیں

ہے"۔(ترمذی:الشھادات:۲۲۹۹)

ظنین: متہم: اپنے لئے نفع کھینچنے والا اور نقصان دفع کرنے والا متہم ہے۔

یہ بات دعوی ہو جائے گی اور دعوی اسی وقت قبول ہوتا ہے جب اسی کے ساتھ شرعی طور پر معتبر بینہ پایا جائے۔

بینہ یہ ہے کہ دو عادل گواہ اس کی بات کے سچا ہونے کی گواہی دیں۔

۳۔استفاضۃ: استفاضہ کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی فرد یا قبیلہ کی طرف منسوب ہو اور اس شہر کے لوگ اس کو اسی فرد یا قبیلے کی طرف منسوب کرتے ہوں اور اس بات کا کوئی مخالف نہ ہو اور ایک مدت تک اس کو کوئی چیلنج پیش نہ کرے۔

یہ استفاضہ صحیح گواہی کے قائم مقام ہے اور اس معاملہ کے صحیح ہونے میں اس کو شرعی دلیل مانا جائے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔

استفاضہ کو نسب کے ثابت کرنے میں صحیح گواہی کے قائم مقام ماننے کی وجہ یہ ہے کہ نسب نسلوں کے تسلسل کے ساتھ ثابت جاری امور میں سے ہے، جب طویل مدت گزر جاتی ہے تو اس کی ابتدا پر بینہ قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے، اسی کی وجہ سے استفاضہ کے ذریعے اس کو ثابت کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس خود کو اپنے قبیلوں اور آباء واجداد کی طرف منسوب کرتے تھے تو آپ ﷺ ان سے ایسے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتے تھے جو ان کے آباء واجداد کے نکاح کے عینی شاہد ہوں بلکہ آپ لوگوں کے درمیان معروف ومشہور ہونے پر اکتفاء کرتے تھے اور احکام بھی اسی پر مبنی ہوتے تھے۔

رضاعت کا ثبوت:

یہ بات معلوم ہو چکی ہے حرمت میں رضاعت کو بھی وہی حکم حاصل ہے جو نسب کو حاصل ہے، اسی طرح ثبوت کے طریقوں میں بھی اس کا حکم نسب کی طرح ہی ہے چنانچہ

رضاعت بھی نسب ثابت کرنے والے مذکورہ بالا امور میں سے کسی ایک سے ثابت ہوتا ہے:
گواہی۔اقرار۔استفاضہ
البتہ رضاعت کے گواہوں کے لئے مرد ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ نسب کے گواہوں کے لئے شرط ہے۔
بلکہ رضاعت میں عورتوں کا بھی گواہ ہونا جائز ہے، کیوں کہ عام طور پر رضاعت سے عورتیں واقف رہتی ہیں۔
اسی بنیاد پر رضاعت کے ثبوت میں مقبول شہادت مندرجہ ذیل ہے:
اَ۔دوعادل مردوں کی گواہی
ب۔ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی گواہی
ج۔چار عادل عورتوں کی گواہی

نسب سے متعلق احکام:

دواشخاص کے درمیان نسب ثابت ہونے کی صورت میں بہت سے احکام مرتب ہوتے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:
۱۔نکاح کے احکام حلال اور حرام ہونے کے اعتبار سے
۲۔نفقہ کے احکام اور اس سے متعلق ذمے داریاں
۳۔ولایت اور اس کے درجات
۴۔میراث، حصوں کی تقسیم اور وارثین کے درجات کی ترتیب
۵۔ولایت، اور صحیح اور باطل ہونے کے اعتبار سے اس کے احکام، کیوں کہ اس کے بہت سے اسباب کا تعلق نسب اور اس بات کو جاننے سے ہے کہ جس کے حق میں وصیت کی جارہی ہے وہ وارث ہے یا نہیں۔
نسب کے ثابت ہونے پر مرتب ہونے والے احکام کا یہ اختصار ہے، ان میں سے بعض ابواب کی تفصیلات گزر چکی ہیں اور بعض کی تفصیلات انشاء اللہ آرہی ہے۔

لقیط

لقیط اس بچے کو کہتے ہیں جو راستے وغیرہ پر پڑا مل جائے اور اس کے بارے میں کوئی دعوے دار نہ ہو کہ یہ اس کا بچہ ہے۔

لقیط کو اٹھانے کے مشروع ہونے کے دلائل:

لقیط کو اٹھانے اور اس کے احکام کے مشروع ہونے میں قرآن اور حدیث میں عمومی دلائل پائے جاتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" (الحج :۷۷) اور بھلا کام کرو شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے: "وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا" (مائدہ:۳۲) اور جو اس (جان) کو زندگی دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کر دیا۔

امام مسلم (الذکر: ۲۶۹۹) وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کسی مومن سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کرے تو اللہ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس سے دور فرمائے گا۔ جو کوئی کسی تنگ دست کے لئے آسانی کرے تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کے لئے آسانی فرمائے گا، جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا، اور اللہ بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

امام بخاری ((الادب: ۵۶۷۹) نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا۔

کیوں کہ یہ دونوں بہت ہی قریب ہوتی ہیں، زیادہ قربت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

امام ترمذی (البر والصلۃ :۱۹۲۳) وغیرہ نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں پر رحم نہ کرے تو اللہ اس پر رحم نہیں فرماتا''۔

لقیط کو اٹھانے کا حکم:

اگر لقیط راستے پر پایا جائے اور اس کا معلوم کفالت کرنے والا کوئی معلوم نہ ہو تو اس کو اٹھانا، تربیت اور کفالت کرنا ان تمام لوگوں پر فرض کفایہ ہے جن کو یہ ملے۔

اگر اس سے لاپرواہی برتی جائے اور وہ اسی جگہ پڑا رہے تو اس شہر یا علاقے یا گاؤں کے وہ سبھی لوگ گناہ گار ہو جائیں گے جن کو اس بچے کی موجودگی کا علم ہو۔

اگر ان میں سے کوئی اس کو اٹھائے اور اس کی تربیت پر توجہ دے تو تمام لوگوں سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے ''**أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا** ''(مائدہ:۳۲) کہ جس نے کسی جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر مارا یا زمین میں فساد کی وجہ سے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو اس کو زندگی دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کر دیا۔

جس طرح کسی جان کو مارنا اس کی زندگی کو ختم کرنے سے ہوتا ہے، اسی طرح قدرت اور طاقت رہنے کے باوجود اس سے ضروری چیزوں کو روکنے سے بھی قتل ہی شمار ہوتا ہے۔

لقیط کو اٹھانے پر گواہ بنانا:

کسی جگہ پر بچہ پڑا ہوا ملے اور کوئی اس کو کفالت کرنے اور تربیت کرنے کی غرض سے اٹھائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اٹھانے اور لینے پر گواہ بنائے تا کہ اس کی حرمت وآزادی اور نسب کی حفاظت ہو، اسی طرح اس کے ساتھ ملے ہوئے مال پر بھی گواہ بنانا ضروری ہے، اگر اس کے ساتھ مال پایا جائے تا کہ اٹھانے والے پر کوئی تہمت نہ لگے اور لقیط

کے مال میں اس کے حق کی ضمانت ہو، چاہے اٹھانے والا عادل اور امانت دار ہی کیوں نہ ہو۔

اٹھانے والے کے ساتھ لقیط کے باقی رہنے کی شرطیں:

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ لقیط کے پائے جانے کی صورت میں اس کو اٹھانا کسی شرط یا قید کے بغیر تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

جب ان میں سے کوئی بھی اس کو اٹھالے تو تمام لوگوں سے فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن جس نے اس بچے کو اٹھایا ہے اس کے ساتھ بچے کے رہنے کے لئے مندرجہ ذیل چار شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ مسلمان ہو: چنانچہ کافر کے پاس لقیط کو نہیں رکھا جائے گا، مگر یہ کہ لقیط پر کافر ہونے کا حکم لگایا جائے مثلاً کسی بھی طریقے سے معلوم ہو جائے کہ اس کے والدین کافر ہیں تو اس صورت میں کافر کے پاس اس کو رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

۲۔ عادل ہو: لقیط کو اس شخص کے پاس رکھنا جائز نہیں ہے جس کا فسق معروف ہو، بچے کو اس کے حوالے کیا جائے گا جس کی عدالت اور امانت ثابت ہو۔

۳۔ رشید ہو: اگر کوئی غیر رشید اس کو اٹھائے مثلاً اٹھانے والا سن رشد کو نہ پہنچا ہو تو بچے کو اس سے لینا ضروری ہے، اس کے حکم میں سے بیوقوف بھی ہے جو صحیح سالم رہنے کے بعد بیوقوف بن گیا ہو اور اس پر قاضی یا حاکم کی طرف سے پابندی لگائی گئی ہو تو لقیط کو اس کے پاس چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ وہ مقیم ہو: اگر بچہ کو اٹھانے والا اس کو لے کر کسی جگہ سفر کرنے کا ارادہ کرے تو اس سے واپس لینا ضروری ہے، کیوں کہ اس بات کی کوئی ضمانت اور گیارنٹی نہیں ہے کہ وہ اس کو غلام بنائے گا یا اس کے ساتھ دھوکہ کرے گا۔

ان تمام شرطوں کی رعایت اور ان کی بنیاد پر لقیط کو کسی کے پاس باقی رکھنے یا چھیننے کا اختیار قاضی یا حاکم کو ہے، کیوں کہ جس کا کوئی ولی اور ذمے دار نہیں ہے تو حاکم اس کا ولی ہے۔ اسی وجہ سے اٹھائے گئے بچے کی ولایت میں فیصلہ کرنے اور اس کی صلاحیت کو دیکھنے کا حق اسی کو ہے۔

لقیط کے نفقات اور اخراجات

جب کوئی لقیط کو اٹھائے اور مذکورہ بالا شرطوں کی موجودگی کی بنا پر بچہ اس کے پاس چھوڑا جائے تو دیکھا جائے گا:

۱۔یا تو اس لقیط کا کوئی مال ہوگا۔

۲۔یا اس کا کوئی مال نہیں ہوگا۔

اگر اس کے پاس مال پایا جائے تو یہ مال اس کی ملکیت مانا جائے گا کیوں کہ وہی اس کا حق دار ہے اور اس میں کوئی جھگڑا کرنے والا پایا نہیں جاتا ہے،اس صورت میں حاکم اس مال میں سے اس پر خرچ کرے گا،اس کی شکل یہ ہے کہ حاکم اٹھانے والے کو جو اس کی تربیت اور پرورش کر رہا ہے کو اس کے مفادات اور ضرورتوں پر خرچ کرنے کی اجازت دے گا،اگر بچے کو لینے والا خود سے حاکم یا قاضی کی اجازت کے بغیر لقیط پر خرچ کرے تو وہ اس مال کا ضامن ہوگا،اور خرچ کیا ہوا مال بچے کو واپس کرنے کا اس کو پابند اور مکلّف بنایا جائے گا۔

جس طرح یتیم کا مال ولی کے پاس امانت ہوتا ہے اور وہ حاکم کی اجازت کے بغیر اس امانت کو اس پر خرچ کرے تو ضامن ہو جاتا ہے اور اسی طرح کا مال یا اس کی قیمت یتیم کو واپس کرنے کا مکلّف بنایا جاتا ہے۔

اس مال کا تصرف حاکم کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے کیوں کہ مال کی ولایت قریبی رشتے دار کے لئے ثابت نہیں ہوتی سوائے والد اور دادا کے،ان کو مال میں بھی ولایت حاصل رہتی ہے،پھر اس اجنبی کو کیسے مال کی ولایت حاصل ہوگی جس کے بچے سے رشتے داری کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

چوں کہ حاکم ان لوگوں کا ولی مطلق ہوتا ہے جن کا کوئی ولی نہیں ہوتا،اس لئے اس کے مال میں تصرف کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے۔

یا تو وہ خود اس پر خرچ کرے یا خرچ کرنے کی اس شخص کو اجازت دے جس کے حوالے بچہ ہو۔

اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو بیت المال سے نفقہ دیا جائے گا۔
اگر لقیط کے پاس کوئی مال نہ ہو تو اس کا نفقہ بیت المال پر واجب ہوتا ہے کیوں کہ بیت المال اس کا ذمے دار ہے۔
اس حکم پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔
یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لقیط کے نفقہ کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو وہ سبھی اس بات پر متفق ہو گئے کہ بیت المال سے نفقہ دیا جائے۔
جب لقیط کے پاس مال نہ ہو تو وہ نبی کریم ﷺ کے اس عمومی فرمان میں داخل ہے: ''جو مال چھوڑے تو اس کے ورثاء کے لئے ہے اور جو بوجھ (فقیر وغریب اولاد اور اہل) چھوڑے وہ مجھ پر ہے''۔ دوسری روایت میں: جو قرض یا ضیاع (ضائع ہونے والا جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو) چھوڑ دے تو وہ میرے پاس آئے تو میں اس کا ذمے دار ہوں'' (بخاری، الاستقراض: ۲۲۶۸، ۲۲۶۹، مسلم: الفرائض: ۱۶۱۹)

جب لقیط بڑا ہو جائے تو کیا حاکم نفقہ کا مبلغ واپس لے گا؟

حاکم نے بیت المال سے لقیط پر خرچ کیا ہو تو اس کے بڑے اور مالدار ہونے پر واپس نہیں لے گا کیوں کہ یہ نفقہ بطور خرچ نہیں کیا جاتا ہے بلکہ بطور استحقاق ہوتا ہے، جیسا کہ شوہر اپنی بیوی پر اور اپنے بچوں پر خرچ کرتا ہے۔

جب بیت المال میں کوئی مال نہ ہو تو لقیط پر نفقہ کا کیا حکم ہے؟

اگر بیت المال میں اتنا مال نہ ہو کہ لقیط کے نفقات کے لئے کافی ہو جائے مثلا ایسے بچوں کی بہت بڑی تعداد ہو یا ان پر خرچ کرنے سے زیادہ اہم مصارف پائے جائیں تو حاکم کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کے ذمے مالداروں سے اتنا قرض لے جو لقیط کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوتا ہو، اور خوشحالی کی صورت میں قرض خواہوں کا قرض ادا کرے۔

لقیط پر توجہ

مذکورہ بالا احکام سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے لقیط پر توجہ دینے ،ان کی تربیت کرنے اوران کی دیکھ ریکھ کرنے کی بڑی ذمے داری عائد کی ہے اور شریعت میں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

اگر مسلمانوں میں ایک لقیط ضائع ہوجائے تو مسلمان گنہ گار ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح حکومت بھی گنہ گار ہے اگر وہ اس کے بارے میں لاپرواہی برتے اوراس کو والد کی توجہ اور ماں کی شفقت بقدر ممکن فراہم نہ کرے، اگر حکومت کے پاس اس کے اخراجات کے لئے مال موجود نہ ہوتو اس کے لئے مالدار سے قرض لینا ضروری ہے۔

لقیط کی تربیت منھ بولا بیٹا بنانے کی اجازت نہیں دیتی:

لقیط کی تربیت کرنے اوراس پر توجہ دینے کی ترغیب سے اس کو منھ بولا بیٹا بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

البتہ اللہ تعالی نے ان دوامور کے درمیان واضح فرق کیا ہے:

جہاں تک توجہ ،تربیت اور دیکھ ریکھ کا تعلق ہے تو یہ سب واجب ہے اوراس کا مصدر اسلامی بھائی چارگی ،انسانی رحم دلی ہے، جہاں تک منھ بولا بیٹا بنانے کا سوال ہے تو ہم اس کو نسب کو گھڑنا کہتے ہیں چنانچہ یہ حرام اور باطل ہے، کیوں کہ نسب کا مصدر ولایت یا نکاح ہے اور لقیط اوراس شخص کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جواس کو منھ بولا بیٹا بنانا چاہتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بیٹے کو وراثت میں حق ملتا ہے اوراس کی وجہ سے اس پر ذمے داریاں عائد ہوتی ہے،اس کو خرچ کرنے میں حق ہے اوراس پر خرچ کرنا واجب بھی ہوتا ہے۔

یہ نکاح حرام ہونے ، دیکھنے ،تنہائی میں ساتھ رہنے اور اختلاط کے حلال وجائز ہونے کی بنیاد ہے، اگر منھ بولا بیٹا بنانے کو اس (ولدیت) پر قیاس کیا جائے اور منھ بولا بیٹا بنانے والے کا اس لقیط کو بیٹا ماننا جائز ہوجائے ،تو اس کے وارث بننے والوں پر ظلم ہوگا اور خود اس پر اوراس کے حقیقی وارثوں پر اس وقت ظلم ہوجائے گا جب جھوٹے وارث ان کو چھوڑ کر وراثت تقسیم کریں گے یا وراثت میں حقیقی وارثوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔

جب اس لقیط اور اس عورت کے درمیان بہن کا قانون نافذ کیا جائے جو اس کی کسی بھی صورت میں بہن نہیں ہے تو اس میں اخلاق اور فضیلت پر ظلم ہے کہ وہ حقیقی بھائی کی طرح اس کے ساتھ اختلاط رکھے جب کہ وہ اجنبی ہے، اور اس کو اس لڑکی کے ساتھ شادی کے ساتھ روک دیا جائے جب کہ اس کے لئے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا حرام نہیں ہے۔

ان تمام امور کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالی نے منھ بولا بیٹا بنانے کو حرام کردیا جس میں غیر موجود نسب کو گڑھا جاتا ہے پھر نسبی رشتے کے تمام حقوق دیئے جاتے ہیں اور اس پر اس کے ثابت احکام نافذ ہوتے ہیں۔

اسلامی شریعت منھ بولا بیٹا بنانے سے بے نیاز کردیتی ہے اور لقیط کے مفادات کو پورا کرتا ہے جس کا اصول اس کی تربیت، اس پر توجہ اور اس کی دیکھ ریکھ ہے۔

متبنی (منھ بولا بیٹا بنانے) کے حرام ہونے کی دلیل:

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''**وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۔ اُدْعُوْهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَا أَخْطَأْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا**'' (الاحزاب: ۴-۵) اور اللہ نے تمھارے منھ بولوں کو تمھارے بیٹے نہیں بنایا، یہ تمھارے منھ سے نکلی ہوئی بات ہے، اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی رہنمائی کرتا ہے، ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرکے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والی بات ہے، پس اگر تم کو ان کے والد کے بارے میں معلوم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں اور تمھارے دوست ہیں، اور تم پر تمھاری غلطیوں پر کوئی گناہ نہیں، لیکن ان پر گناہ ہے جو تم عمداً دل کے ارادے کے ساتھ کرتے ہو، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

شرعی حکم سے انحراف اور جاہلیت کی طرف واپسی:

متبنی کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالی کا یہ واضح فرمان ہے، لیکن بہت سے لوگ

جاہلیت کی طرف پچھلے پیر لوٹ گئے ہیں، ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ یتیم خانوں میں جاتے ہیں اور وہاں کسی بچے کو لے کر اپنا بیٹا بنا دیتے ہیں اور سول رجسٹروں میں اس کا نسب اپنے ساتھ ملا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی معصیت کے شکار ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف سے منع کردہ سب سے بدترین چیز یعنی حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے کے مرتکب ہو جاتے ہیں، وہ قرآن وحدیث کے صریح حکم کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ یہ لوگ اس معاملے میں دور جاہلیت کے کافروں سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں، جب کہ عہد جاہلیت میں لوگ اعلان کرتے تھے کہ یہ میرا منھ بولا بیٹا ہے، حقیقی بیٹا نہیں اور یہ لوگ حقیقت کو مٹا دیتے ہیں اور دستاویزات میں اس کا نسب اپنے نسب کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور اس کو حقیقی بیٹا ثابت کرتے ہیں، اسی طرح وہ اپنے خاندان میں ایسے شخص کو داخل کر دیتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہے، یہ شخص اس خاندان کی اپنے لئے غیر محرم عورتوں کے ساتھ بلا جھجک اختلاط رکھتا ہے اور اس کی بنیاد پر ان کے ساتھ شادی حرام قرار دی جاتی ہے جب کہ وہ عورتیں اس کے لئے حلال ہیں اور ان کے ساتھ اختلاط اور محارم کی طرح ان کے ساتھ رہنا حرام ہے۔

اس کی وجہ سے وارث اپنی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ لقیط دوسرے کا مال باطل طریقے پر لیتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے بگاڑ پائے جاتے ہیں جن میں یہ جاہل اور گنہ گار لوگ ارادہ کے ساتھ اور بلا ارادہ پڑتے ہیں، اس طرح وہ اللہ تعالی کے غضب کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ قیامت کے دن سخت ترین سزا کے مستحق ہو جائیں گے، جب کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔

وقف

وقف کی تعریف:

وقف کے لغوی معنی "روکنے" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: وقفتُ کذا: میں نے اس کو روکا۔

وقف کے شرعی معنی یہ ہے کہ ایسے مال کو روکنا جس کے باقی رہتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو، موجودہ مباح مصرف سے خود کو تصرف سے الگ کر کے۔

اس تعریف میں مذکورہ قیود اور پابندیوں کی تفصیلات آگے آرہی ہیں:

وقف کے مشروع ہونے کی دلیل:

وقف شریعت اسلامی کا ایک حکم ہے بلکہ یہ ثواب کا کام ہے اور شریعت میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن اور حدیث میں اس کے بہت سے دلائل ملتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ" (آل عمران: ۹۲) تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک تم اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت کریمہ سنی تو وقف کرنے کی خواہش کی اور نبی کریم ﷺ کے پاس مشورہ کرنے کے لئے آئے۔

امام بخاری (کتاب الوصایا: ۲۶۰۷) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جب یہ آیت کریمہ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" نازل ہوئی تو ابوطلحہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اللہ تبارک وتعالی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اور میرا سب سے پسندیدہ مال

بیرحاء (باغ) ہے (راوی کہتے ہیں: یہ ایک باغ تھا جہاں رسول اللہ ﷺ جاتے تھے اور وہاں سایہ حاصل کرتے تھے اور اس کا پانی پیتے تھے) وہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے، میں اس سے نیکی اور اجر وثواب کی امید کرتا ہوں، اللہ کے رسول! آپ جہاں اس کو مناسب سمجھتے ہیں رکھیئے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واہ ابوطلحہ! یہ نفع بخش مال ہے، ہم نے تم سے یہ قبول کرلیا اور یہ تمہارے پاس واپس کردیا، پس تم اس کو اپنے رشتے داروں میں تقسیم کرو"۔چنانچہ ابوطلحہ نے اپنے رشتے داروں پر اس کو صدقہ کیا، روای کہتے ہیں: ان میں انس اور حسان بھی تھے۔

یہ بھی فرمان الٰہی ہے: "وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ" (آل عمران: ۱۱۵) اور وہ جو بھلائی کرتے ہیں ان کا حق نہیں مارا جائے گا اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں خیر عام ہے جو خیر کی تمام قسموں کو شامل ہے، ان میں وقف بھی ہے۔

اس تعلق کی بہت سی حدیثیں ہیں:

امام مسلم (۱۶۳۱: کتاب الوصیۃ) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب انسان مرتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین کے: صدقہ جاریہ یا ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے" علماء کے نزدیک صدقہ جاریہ سے مراد وقف ہے اور ولد صالح سے مراد جو اللہ تعالی کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو پورا کرنے والا ہو۔

امام بخاری (کتاب الشروط: ۲۵۸۶) اور امام مسلم (کتاب الصیۃ ۱۶۳۲) نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو نبی ﷺ کے پاس اس بارے میں مشورہ کرنے کے لئے آئے اور کہا: اللہ کے رسول! مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے، میں نے اس سے زیادہ بہترین مال نہیں پایا، پس آپ اس سلسلے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کے اصل کو روکو اور اس کو صدقہ کرو

۔راوی کہتے ہیں: چنانچہ عمرؓ نے اس کو صدقہ کیا کہ اس کو نہ بیچا جائے اور نہ اس کو ہبہ کیا جائے اور نہ اس کو وراثت میں تقسیم کیا جائے اور اس کو فقراء، رشتے داروں، غلاموں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں، مسافروں اور مہمانوں پر وقف کر دیا، جو اس کا ذمے دار ہے اس کو بھی بھلے طریقے سے اس میں سے کھانے اور غیر مالدار کو کھلانے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں ہے۔

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مال جمع نہ کرنے والے کو کھلائے۔

یہ مشہور ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف ہے۔

صحابہ میں وقف کا عام رواج ہو گیا تھا یہاں تک کہ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں کوئی ایسا باقی نہ رہا جو قدرت رکھتا ہو مگر اس نے وقف نہ کیا ہو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسی انصاری صحابہ نے وقف کیا ہے۔

وقف مشروع کرنے کی حکمت:

ہم نے یہ بات بتا دی ہے کہ وقف مشروع ہے، بلکہ یہ ثواب کا کام ہے جس پر مومن کو اجر ملتا ہے، اسی وجہ سے کسی شک کے بغیر اس کو مشروع کرنے کے بہت سے فائدے اور بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

اس سے اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اللہ سے تقرب کا راستہ کھل جاتا ہے اور اس کو مزید اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، مومن کے دل میں اس عمل خیر سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام نہیں ہے جو اس کو اللہ تعالی کے قریب کر دے اور اس کی محبت میں اضافہ کر دے۔

۲۔مومن شخص کی خواہش اور رغبت کی تکمیل، وہ اللہ تعالی کی عبودیت اور اس سے اپنی محبت کے اظہار پر دلیل پیش کرتا ہے، کیوں کہ اللہ تبارک وتعالی کی محبت عمل اور انطباق کے میدان میں ہی واضح ہوتی ہے اور ظاہر ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ" (آل عمران: ۹۲) تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

۳۔ مومن کی یہ خواہش پوری ہوتی ہے کہ اس کی وفات کے بعد خیر باقی اور جاری رہے اور اس کا ثواب موسلا دھا بارش کی طرح اس کو قبر میں بھی پہنچتا رہے، جب دنیا سے اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور اس کے لئے وہی باقی رہتا ہے جو اس نے اپنی زندگی میں اللہ تعالی کے راستے میں روکے رکھا ہوا ور وقف کیا ہو یا ایسے بچے کے وجود کا سبب بنا ہو جو صالح اور نیک ہو یا اس کے پاس ایسا علم رہا ہو جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں۔

۴۔ بہت سے اسلامی مفادات پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں، کیوں کہ وقف کی جائیدادوں کا اگر بہترین استعمال کیا جائے تو مسلمانوں کے بہت سے مفادات مثلاً مسجدوں کی تعمیر، مدارس کا قیام، علم کے احیاء اور شعائر مثلاً اذان، امامت کے قیام وغیرہ دوسرے مفادات اور شعائر کی تکمیل میں بہت بڑے اور عظیم فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اس کا بڑا اثر ہے۔

۵۔ بہت سے فقراء، مساکین، یتیم اور مسافرین کی ضرورت پوری ہوتی ہے جو حالات کی وجہ سے کمانے سے عاجز رہتے ہیں، اوقاف کے مال سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور ان کے دل خوش ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

وقف کے ارکان:

وقف کے مندرجہ ذیل چار ارکان ہیں:

وقف کرنے والا، وقف کی جانے والی چیز، جس پر وقف کیا جائے اور صیغہ۔

ان چاروں ارکان میں سے ہر ایک رکن کے کچھ شرائط ہیں:

۱۔ وقف کرنے والے کے لئے شرطیں:

اَ۔ اس کا اعتبار صحیح ہو یعنی وہ معتبر ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آزاد، بالغ اور عاقل ہو، چنانچہ غلام کا وقف صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اور اس کا مال اس کے آقا کا ہے، اسی طرح بچے اور پاگل کا وقف بھی صحیح نہیں ہے، چاہے یہ وقف ان کے سرپرستوں کی موجودگی میں ہی کیوں نہ ہو۔ اگر بچہ کچھ وقف کرے چاہے وہ ممیّز ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح پاگل وقف کرے تو یہ وقف باطل ہو جائے گا چاہے ان دونوں کے ولی اس کی اجازت دے دیں

،کیوں کہ بچہ اور پاگل دونوں شرعی اعتبار سے معتبر نہیں ہیں ،اسی وجہ سے ان دونوں کا وقف صحیح نہیں ہے اور ولی کے لئے بھی دونوں کے مال میں سے کچھ خیرات کرنا جائز نہیں ہے۔

ب۔خیرات کرنے کی اہلیت ہو، چنانچہ اس کا وقف صحیح نہیں ہے جس پر بے وقوفی یا مفلسی کی وجہ سے پابندی لگائی گئی ہو، کیوں کہ ان کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے چنانچہ ان کی طرف سے خیرات کرنا صحیح نہیں ہے اور ان کا مال ان کے حوالے کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

بیوقوف کے لئے یہ حکم اس کے مفاد کے لئے ہے اور مفلس کے لئے یہ حکم اس کے قرض خواہوں کے مفاد کے لئے۔

اللہ تبارک تعالی کا فرمان ہے:''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا''(النساء۔۵)اور تم اپنا مال بیوقوفوں کو مت دو جس کو اللہ نے تمھارے لیے قیام (زندگی گزارنے) کی چیز بنائی ہے۔

بیوقوف سے مراد یہاں وہ شخص ہے جو اپنے مال میں بہتر انداز میں تصرف نہ کرے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیوقوف کی تفسیر اسراف کرنے والے سے کی ہے جو اپنا مال حرام امور میں خرچ کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان:''الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان مالوں میں تمہارے معاش کی صلاح رکھی ہے۔

یہاں اللہ تبارک وتعالی نے مال کی نسبت اولیاء کی طرف کی ہے حالانکہ درحقیقت یہ مال بیوقوفوں کا ہے، کیوں کہ مال اولیاء کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور وہی اس کے نگراں ہوتے ہیں۔

امام حاکم (۲/۵۸ کتاب البیوع)اور امام دارقطنی وغیرہ نے حضرت کعب بن مالک سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر پابندی لگائی اور ان کا مال ان پر موجود قرض کی وجہ سے بیچ دیا اور اس کو قرض خواہوں میں تقسیم کردیا، جس کی وجہ سے ان کو اپنے حق کا ساتواں حصہ ملا، نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:''تمہارے لئے صرف اتنا ہی ہے''۔

ج: وہ مختار ہو، چنانچہ مجبور کئے ہوئے کا وقف صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مختار ہونا مکلّف ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔

مرض الموت میں وقف کرنے کا حکم

اگر کسی مریض کی حالت اتنی نازک ہو کہ اس کے فوت ہونے کا غالب گمان ہو اور ایسی صورت میں عام طور پر مریض انتقال کر جاتا ہو تو ایک تہائی مال سے زیادہ میں اس کا وقف جائز نہیں ہے، تا کہ وراثت میں وارثین کے حق کی حفاظت ہو، جہاں تک ایک تہائی یا اس سے کم مال میں وقف کا تعلق ہے تو اس کی مصلحت کی رعایت رکھتے ہوئے اس کا وقف جائز ہے تا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کو اجر وثواب ملے، اس کی دلیل امام بخاری (کتاب الجنائز:۱۲۳۳) اور امام مسلم (کتاب الوصیۃ: ۱۶۲۸) کی سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے سال میری عیادت کے لئے آئے، اس وقت میں سخت تکلیف میں مبتلا تھا۔ میں نے کہا: مجھے حد سے زیادہ تکلیف ہے اور میں مالدار ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے، کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے پوچھا: آدھا، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک تہائی اور ایک تہائی بھی بہت ہے، تم اپنے وارثین کو مالدار چھوڑو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تم ان کو فقیر چھوڑو جو لوگوں سے مانگتے پھریں''۔

کافر کے وقف کا حکم:

علمائے شافعیہ نے کہا ہے: کافر کا وقف صحیح ہے چاہے مسجد کے لئے ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ ہمارے عقائد کے اعتبار سے اس کے ثواب کا کام ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خیرات کرنے والوں میں سے ہے اور اس طرح کے خیرات میں نیت صحیح ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور نیت کے بارے میں معلوم ہی ہے کہ اسلام نے اس کی شرط رکھی ہے، کافر کو اس کے نفقات اور خیرات پر دنیا میں بدلہ دیا جاتا ہے، البتہ آخرت میں اس

کو کوئی بھی ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

امام مسلم (صفات المنافقین واحکامھم: ۲۸۰۸) نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اچھائی کے بارے میں کسی مسلمان پر ظلم نہیں کرتا، اس کی وجہ سے اس کو دنیا میں دیا جاچکا ہے اور اس کا یہ بدلہ آخرت میں دیا جاتا ہے، جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو اللہ تعالی کی خاطر اس کی کی ہوئی اچھائیوں کا بدلہ دنیا میں اس کو کھلایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ آخرت میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی اچھائی باقی کہاں رہتی ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے''

۲۔ موقوفہ چیز کے لئے شرطیں:

وقف کی ہوئی چیز کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

اَ۔ وقف کی ہوئی چیز عین ہو، چنانچہ عین کو چھوڑ کر صرف اس کے فائدوں کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے چاہے یہ منافع وقتی ہی ہو، مثلاً ایک سال کے لئے اپنے گھر میں رہنے کو وقف کردے یا ہمیشہ کے لئے رہنے کو وقف کردے کیوں کہ چیز اصل ہے اور منفعت اس کی فرع ہے، اور فرع اصل کے تابع ہوتی ہے، جب تک اصل وقف کرنے والے کی ملکیت میں باقی رہتی ہے تو منفعت بھی اس کی ملکیت میں باقی رہتی ہے، جس کی وجہ سے صرف منفعت وقف نہیں ہوسکتی۔

اگر موقوفہ چیز متعین نہ ہو تو بھی وقف صحیح نہیں ہے، اگر کوئی اپنے دو گھروں یا اپنی دو گاڑیوں میں سے کسی ایک کا تعین کئے بغیر وقف کردے تو یہ وقف صحیح نہیں ہے کیوں کہ موقوفہ چیز متعین نہیں ہے، اس کی بات بیکار ہے، سنجیدہ نہیں۔

ب:۔ موقوفہ چیز وقف کرنے والے کی ایسی ملکیت ہو جس کو دوسرے کی ملکیت میں منتقل کرنا صحیح ہو اور اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو۔

اس بنیاد پر کسی ایسی چیز کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے جس کا وہ مالک نہ ہو کیوں کہ وقف میں موقوفہ چیز کی ملکیت اس سے کیسے منتقل کی جاسکتی ہے، اسی وجہ سے اپنی ملکیت میں نہ پائی

جانے والی چیز کو وقف کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔اسی قبیل سے آزاد انسان کا خود کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کی ذات کا وہ خود مالک نہیں ہے کہ وقف کر کے اس کو اپنی ملکیت سے نکال دے بلکہ اس کی ملکیت اللہ تبارک وتعالی کی ہے۔

اسی طرح چوپایوں کے صرف حمل کو اس کی ماؤں کے بغیر وقف کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ صرف حمل کی ملکیت کو منتقل کرنا صحیح نہیں ہے جب تک وہ اپنی ماں کے پیٹ میں رہتا ہے،اگر چوپائے کو وقف کر دیا جائے تو اس کے ساتھ حمل کو بھی وقف کرنا صحیح ہے۔

موقوفہ چیز کا منفعت والی ہونا ضروری ہے،اگر کوئی ایسی زمین وقف کر دے جو کھیتی یا تعمیر کے لائق نہ ہو یا پھٹے کپڑے وقف کر دے جن سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو تو یہ وقف صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وقف کا مقصود فائدہ اٹھانا ہے اور اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہے۔

ج:موقوفہ چیز سے دائمی نفع اٹھایا جا سکتا ہو، چنانچہ کھانے پینے کی چیزوں کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے جن سے فائدہ اٹھانا اس وقت صحیح ہے جب ان کو ختم کیا جائے۔

دائمی فائدہ اٹھانے سے مراد نسبتی دوام ہے، ابدی دوام نہیں، یعنی وہ چیز اجرت پر دینے سے اس کے بدلے منفعت حاصل ہوتی ہو،اگر کوئی گاڑی یا چوپایہ وقف کر دے تو یہ وقف صحیح ہے،اگر چہ گاڑی کا نفع ہمیشہ باقی نہیں رہتا ہے، بلکہ وہ ختم بھی ہو سکتی ہے، یہی مسئلہ چوپائے کا ہے،موقوفہ چیز سے فی الفور فائدہ اٹھانا شرط نہیں ہے بلکہ مستقبل میں فائدہ اٹھانا بھی کافی ہے،اگر کوئی چھوٹا چوپایہ وقف کر دے تو یہ وقف صحیح ہے، کیوں کہ مستقبل میں اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔

د۔موقوفہ چیز کی منفعت مباح ہو،اس میں کوئی حرمت نہ ہو،اسی وجہ سے ایسی چیزوں کا وقف صحیح نہیں ہے جن کی منفعت حرام ہے مثلاً لہو ولعب کے آلات ، کیوں کہ وقف تو ثواب کا کام ہے اور معصیت اس کے منافی ہے

بیت المال سے مسلمانوں کے امام اور خلیفہ کے وقف کے احکام

علماء شافعیہ نے مسلمانوں کے امام اور خلیفہ کے لئے یہ بات جائز قرار دی ہے کہ

مسلمانوں کے بیت المال کی کوئی زمین وقف کردے، اگر اس میں مسلمانوں کا مفاد دیکھے، علماء نے وقف کے لئے وقف کرنے والے کی ملکیت کی شرط رکھی ہے، کیوں کہ خلیفہ بیت المال کے اموال کا مالک نہیں رہتا ہے، اس کے باوجود علماء نے اس طرح کے وقف کو صحیح کہا ہے، اور اس پر عمر بن الخطابؓ کی طرف سے ''شوارف عراق'' زمین کو وقف کرنے سے استدلال کیا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الروضۃ'' میں لکھا ہے: اگر امام مال غنیمت کی زمین وقف کرنا بہتر جانے جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے تو جائز ہے اگر غنیمت حاصل کرنے والے اس زمین سے عوض کے بدلے یا بلاعوض راضی ہوں''۔

جائیدادوں کا وقف

زمین، گھر، تجارتی کمپلکس، کنوؤں اور چشموں کو وقف کرنا جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ فی الحال یا مستقبل میں ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔

اس کی دلیل قرآن حدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے، ہم نے شروع میں حضرت جابر رضی اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو قدرت ہو مگر اس نے وقف نہ کیا ہو''۔ امام شافعی کا فرمان ہے: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسّی انصاری صحابہ نے وقف کیا ہے۔ یہ بات معلوم ہی ہے کہ زیادہ تر ان لوگوں نے زمین، گھر اور کنوؤں کو وقف کیا تھا۔

منقولہ مالوں کو وقف کرنے کا حکم

اسی طرح منقولہ مالوں مثلاً چوپایوں، گاڑیوں، جنگی سازوسامان، کپڑوں، بستروں، برتنوں اور مفید کتابوں کو وقف کرنا صحیح ہے۔

امام بخاری (الجھاد: ۲۶۹۸) اور امام نسائی (الخیل: ۶/۲۲۵) نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ کی راہ میں اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے گھوڑے کو روکے (وقف کردے) تو اس کا آسودہ ہونا، سیراب ہونا، اس کا بول وبراز اور پیشاب قیامت کے دن اس کے میزان میں ہوگا''۔

امام بخاری (کتاب الزکاۃ:۱۳۹۹) اور امام مسلم (کتاب الزکاۃ:۹۸۷) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جہاں تک خالد کا تعلق ہے تو تم خالد پر ظلم کرتے ہو، کیوں کہ اس نے اپنی زرہوں اور جنگی سازو سامان کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیا ہے۔

مشاع یعنی مشترکہ ملکیت کو وقف کرنے کا حکم

مشاع اس ملکیت کو کہتے ہیں جو مشترکہ ہو اور ایک کا حصہ دوسرے کے حصے سے الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

مشترکہ ملکیت کو وقف کرنا بھی صحیح ہے، چاہے یہ منقولات میں سے ہو یا جائیدادوں میں سے، چاہے کوئی ایک شخص اپنا حصہ وقف کرے یا سبھی لوگ اپنا اپنا حصہ وقف کر دیں، ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ یہ تمام وقف شرعی طور پر جائز ہے۔

امام نسائی (الاحتباس ۶/۲۳۰۔۲۳۱) نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: جو سو حصے خیبر میں مجھے ملے ہیں میرے نزدیک اس سے زیادہ عمدہ مال میں نے نہیں پایا ہے، میں اس کو صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کے اصل کو روکے رہو اور اس کے فائدے کو اللہ کی راہ میں وقف کرو۔

امام بخاری (کتاب الوصایا:۲۲۱۹) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا: "بنونجار! مجھے اپنا یہ باغ بیچو"۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ اللہ کی قسم! ہم اس کی قیمت صرف اللہ سے چاہتے ہیں۔

خطیب شربینی نے اپنی کتاب "مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الألفاظ المنھاج للامام النووی" میں لکھا ہے۔ امت تمام زمانوں میں کسی نکیر کے بغیر مسجدوں میں چٹائیوں اور قندیلوں کو وقف کرنے پر متفق ہے۔

۳۔ موقوف علیہ کے لئے شرطیں

موقوف علیہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ متعین ہو، ایک ہو یا زیادہ ۲۔ غیر متعین ہو یعنی فقراء وغیرہ پر وقف، ان سے میں سے ہر ایک کی چند شرطیں ہیں۔

جب موقوف (جس پر وقف کیا جائے) متعین ہو چکا ہے ایک ہو یا زیادہ تو اس کے لئے مندرجہ ذیل شرط ہے:

اس شخص پر وقف جس کا مالک بننا ممکن ہو، یعنی وہ حقیقت میں موجود ہو۔

چنانچہ اپنی اولاد پر وقف کرنا جب کہ حقیقت میں اس کی اولاد نہ ہو، اسی طرح فلاں شخص کی اولاد میں سے غریبوں پر وقف کرے اور وقف کے وقت ان میں کوئی فقیر ہی نہ ہو تو اس طرح کا وقف صحیح نہیں ہے اسی طرح جنین (پیٹ کے بچے) پر وقف صحیح نہیں ہے، میت، چوپایے اور نہ گھر وغیرہ ایسی چیزوں پر وقف صحیح ہے جن کا وقف کی حالت میں مالک ہونے کے صحیح ہونے کا تصور بھی نہ ہو۔

اسی بنیاد پر مصحف اور شرعی علوم کی کتابوں کو غیر مسلم پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کو ان کا مالک بنانا جائز نہیں ہے، واقف کا اپنی ذات پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ یہ تحصیل حاصل ہے، وقف سے پہلے بھی وہ اس کی ملکیت میں ہی ہے اور وقف کے بعد کوئی نئی چیز رونما نہیں ہوئی ہے۔

کافر پر وقف کرنے کا مسئلہ

علمائے شافعیہ نے کافر پر وقف کی اجازت دی ہے اگر وہ وقف کرنے والے کا مقصود معصیت اور گناہ نہ ہو، کیوں کہ ذمی کو خیرات دینا جائز ہے، اسی طرح اس پر وقف کرنا بھی جائز ہے۔

اگر وقف کے وقت گناہ کی رعایت کرنا واضح ہو مثلاً گرجا گھر کے فادر پر اس کی گرجا گھر کی خدمت کرنے کی وجہ سے وقف کرے تو یہ وقف صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وقف کی مشروعیت کے لئے معصیت کی نفی کی گئی ہے۔

معاہدے میں داخل اور پناہ میں موجود کافر پر بھی ذمی کی طرح وقف کرنا صحیح ہے جب تک وہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں اور اپنے معاہدوں پر قائم ہوں۔

البتہ جنگجو کافر اور مرتد پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جب تک وہ اپنی اس حالت

پر رہیں گے تو ان کے لئے دوام نہیں ہے اور ان کے کفر پر رہتے ہوئے ان کا اقرار نہیں کیا جائے گا، جب کہ وقف صدقہ جاریہ ہے، جس طرح ایسی چیز کا وقف صحیح نہیں ہے جس کو دوام حاصل نہ ہو تو اس شخص پر وقف صحیح نہیں ہے جس کو دوام نہ ہو، شریعت میں ان دونوں سے جنگ کرنے اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام بخاری (کتاب الایمان:۲۵) اور امام مسلم (کتاب الایمان:۲۲) نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے لوگوں سے اس وقت تک جنگ کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، پس جب وہ اس طرح کریں تو مجھ سے ان کا خون محفوظ ہے سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے“۔

”سوائے اسلام کے حق کے“ کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو جائے جس پر اسلام میں قتل کی سزا ہو۔ ”اور ان کا حساب اللہ پر ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ جو انہوں نے اپنے دل میں چھپایا ہے اس کا حساب اللہ پر ہے۔

امام بخاری (کتاب الجھاد:۲۷۹۵) اور امام ترمذی (کتاب الحدود:۱۴۵۸) وغیرہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو اپنا دین تبدیل کرے تو اس کو قتل کردو“۔

غیر متعین موقوف علیہ کی شرطیں:

مثلاً فقراء، غریبوں، مساجد اور مدارس وغیرہ پر وقف صحیح ہونے کے لئے ایک شرط ہے کہ کسی گناہ پر وقف نہ ہو، کیوں کہ اس صورت میں وقف معصیت کے کام پر تعاون ہوگا اور گناہ کے وجود کو ثابت کرنے والا ہوگا، جب کہ وقف اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے چنانچہ وہ اور معصیت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہے جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

گذشتہ اصول کے مطابق ایسا وقف صحیح نہیں ہے جس کا فائدہ کافروں کی عبادت

گاہوں، مثلاً گرجا گھروں وغیرہ کو پہنچتا ہو، اور نہ ان کی خدمت پر وقف کرنا صحیح ہے اور نہ ان کے لئے بطور وقف چٹائیاں، فرش اور قندیلیں دینا اور نہ ان کی تعمیر اور ترمیم کے لئے وقف کرنا اور ان کے علاوہ ان سے متعلق دوسرے معاملات پر وقف کرنا صحیح ہے۔

اسی طرح فتنہ پروروں اور ڈاکوؤں کے لئے ہتھیاروں کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں معصیت اور گناہ میں تعاون ہوگا۔

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقراء، علماء و قراء، مجاہدین، کعبہ ومساجد، مدارس، سرحدوں، شفاخانوں اور جنازوں کی تکفین کے لئے وقف کرنا جائز ہے، بلکہ یہ مسنون اور ثواب کا کام ہے، دین نے اس کی ترغیب دی ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اس کی دلیل وہ تمام نصوص ہیں جو وقف کے مشروع ہونے اور اس کی ترغیب پر دلالت کرتے ہیں۔

مالداروں پر وقف:

شرعی طور پر مالداروں پر بھی وقف کرنا جائز ہے کیوں کہ ان پر صدقہ کرنا جائز ہے اور ان پر وقف کرنے میں اللہ تعالی کی معصیت بھی نہیں ہے، اسی طرح وقف مالک بناتا ہے اور وہ اس ملکیت کے اہل ہیں۔

فقیری اور مالداری کی حد:

اگر کوئی گھر وقف کردے اور اس سلسلے میں کہے: میں نے اس کو وقف کردیا تا کہ فائدہ فقراء کو پہنچے یا کہے: اس کا فائدہ مالداروں کو پہنچے۔ اب سوال یہ ہے کہ فقیر کون ہے اور مالدار کون؟

فقیر:

علماء نے وقف میں فقیری کی تعیین اور حد مقرر کرنے کے سلسلے میں کہا ہے: فقیر وہ ہے جس کو اس کے فقر کی وجہ سے زکوۃ دینا صحیح ہو، اس کے لئے اس کی فقیری کی وجہ سے وقف کرنا بھی صحیح ہے، اگر وہ اس طرح نہیں ہے تو اس پر وقف بھی صحیح نہیں ہے۔

اسی بنیاد پر مسکینوں پر وقف کرنا صحیح ہے، جب کہ وہ فقراء سے بہتر حال میں رہتے ہیں، کیوں کہ ان کو زکوۃ دینا جائز ہے، ایسی فقیر بیوی پر وقف کے فائدے کو صرف کرنا جائز نہیں ہے جس کو اس کا شوہر نفقہ دیتا ہو اور نہ ان بچوں کو دینا جائز ہے جو اپنے والد کے نفقہ کی وجہ سے آسودہ ہوں کیوں کہ ان کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے۔

مالدار:

اس کی تعیین میں علماء نے کہا ہے: مالدار وہ ہے جس کو زکوۃ دینا حرام ہے یا تو اپنی ملکیت کی وجہ سے یا اپنی طاقت وقوت اور کمائی یا دوسرے کے نفقہ کی وجہ سے مستغنی ہونے کی وجہ سے۔

نیک کاموں میں اللہ کی راہ میں وقف:

اگر کوئی وقف کرنے والا وقف کرتے وقت کہے: میں نے اپنی زمین وقف کردی تاکہ اس کا فائدہ نیک کاموں یا ثواب کے کاموں میں ہو تو اس وقف کے فائدوں کا کون مستحق ہوگا۔

اس طرح کے وقف کی صورت میں اس وقف کے فائدوں کے مستحق وقف کرنے والے کے رشتہ دار ہوں گے، اگر یہ نہ ہوں تو زکوۃ کے مستحق مستحق ہوں گے البتہ زکوۃ وصول کرنے والے اور مؤلفۃ القلوب اس سے مستثنی ہیں۔

اگر کہے: اللہ کے راستے میں وقف کردیا تو اس کے مستحق اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے ہوں گے جو زکوۃ کے حق دار بنتے ہیں۔

اگر وقف کرتے وقت خیر کے کاموں ثواب کے کاموں اور اللہ کی راہ دونوں کہے تو اس وقف کا ایک تہائی حصہ مجاہدین کے لئے، دوسرا وقف کرنے والوں کے رشتہ دار اور تیسرا حصہ زکوۃ کے مستحقین کو ملے گا، ان سے زکوۃ وصول کرنے والے اور مؤلفۃ القلوب مستثنی ہوں گے۔

مسجدوں کی زیب زینت اور قبروں پر تعمیر کے لئے وقف:

فقہاء نے کہا ہے کہ مسجدوں کی نقش نگاری کے لئے وقف صحیح نہیں ہے، اسی طرح

قبروں کی تعمیر کے لئے بھی صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مرے ہوئے لوگ بوسیدہ ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے ان پر تعمیر کرنا مناسب نہیں ہے اور نہ غیر مفید کاموں میں مال کو ضائع کرنا جائز ہے۔

علمائے کرام کے اس قول پر عام مسلمان آج کیا عمل کر رہے ہیں، جب کہ کبھی ان کے علماء ہی اس عمل پر ہمت افزائی کرتے ہیں یا وہ اس پر خاموش ہو جاتے ہیں؟!

فقراء اور مالداروں سے اور اوقاف سے حاصل شدہ آمدنی یا لوگوں کے چندوں کو بڑی مقدار میں جمع کرتے ہیں اور ان سے مسجد کی نقش ونگاری کرتے ہیں یا عظیم الشان منبر اور محراب بناتے ہیں، وہ اس سے ناواقف ہیں کہ یہ ناپسندیدہ اسراف، لوگوں کے دلوں کو ان کی نماز سے توجہ ہٹانے میں مال کو ضائع کرنا اور ان کی زیب وزینت کی چیزوں کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو ان کی عبادتوں سے مشغول کرنا ہے یا وہ تجاہل عارفانہ برتتے ہیں؟ گویا انہوں نے اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان نہیں پڑھا ہے: "قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ" (مؤمنون: ۱۔۲) مؤمن کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

جب مصلی کے سامنے اور اس کے قبلہ میں اور اس کے دائیں اور بائیں دل کو اپنی طرف مائل کرنے والی زیب وزینت اور نقش ونگار ہوں تو خشوع کہاں سے پیدا ہوگا؟! ولا حول ولاقوۃ الا باللہ۔

قبروں پر عمارت بنانا، ان کو پختہ بنانا اور گنبد اور مینار بنانا بھی اسراف میں شامل ہے، ان عمارتوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ قبریں نہیں محل ہیں، اور ان میں مدفون لوگ زندہ ہیں، وہ ان عمارتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں!!

بعض لوگ اپنی قبروں پر عمارت تعمیر کرنے پر اتنا مال خرچ کرتے ہیں اور وصیت کرتے ہیں کہ ان کی قبریں عظیم الشان بنائی جائیں جہاں ان کی موت کے بعد ان کی تدفین کی جائے، شرعی طور پر یہ باطل وصیت ہے اور یہ وقف بھی لغو ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے "المنہاج" میں تحریر کیا ہے: قبر کو پختہ بنانا، اس پر تعمیر کرنا، اور اس پر تحریر کرنا مکروہ ہے چاہے منہدم شدہ پرانے قبرستان میں ہی تعمیر کیا جائے گا۔

مغنی المحتاج میں خطیب شربینی نے لکھا ہے "ایسی تعمیر کو منہدم کیا جائے گا کیوں کہ یہ لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہے، اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ گنبد ہو یا گھر یا مسجد وغیرہ"۔

کافروں کا اپنی عبادت گاہوں پر وقف کرنے کے مسائل گذشتہ صفحات میں ہم نے بتا دیے ہیں کہ مسلمان کے لئے گرجا گھر وغیرہ پر کوئی چیز وقف کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس میں معصیت پائی جاتی ہے۔

اس مسئلہ میں ہم کہتے ہیں کہ ذمی کے لئے بھی گرجا گھر یا اپنی کسی عبادت گاہ کے لئے وقف کرنا ہماری اپنی شریعت اور عقیدے پر عمل کرتے ہوئے جائز نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت ہے جب ذمی ہمارے پاس مقدمہ پیش کریں اور ہم سے اس بارے میں حکم بیان کرنے کی درخواست کریں تو ہم گرجا گھر اور عبادت گاہوں پر ان کا وقف باطل ہونے کا فیصلہ کریں گے۔

اگر وہ اپنے مقدمات ہمارے پاس نہ لیں آئیں اور اس بارے میں فتوی نہ پوچھیں تو پھر ہم ان کو نہیں چھیڑیں گے اور ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں گے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل کافروں نے اپنی قدیم عبادت گاہوں اور گرجا گھروں پر وقف کیا ہو تو ہم اس کو باطل قرار نہیں دیں گے بلکہ جس طرح ہم نے ان عبادت گاہوں کو باقی رکھا ہے وقف کو بھی باقی رکھیں گے۔

۴۔ وقف کا صیغہ

(۱) صیغہ کی تعریف:

صیغہ وہ لفظ ہے جس سے مقصود معلوم ہو جائے یا لفظ کے قائم مقام کوئی چیز ہو مثلاً گونگے کا سمجھ میں آنے والا اشارہ یا اس کی تحریر، وقف کے صحیح اور مشروع ہونے کے لئے صیغہ کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) صیغہ کی قسمیں:

صیغہ کی دو قسمیں ہیں:

اَ۔ صریح: صریح وہ ہے جس میں مراد لئے ہوئے معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی کا

احتمال نہ ہو مثلاً کہے: میں نے اپنا گھر فقیروں پر وقف کردیا یا کہے: میرا گھر فقیروں پر وقف ہے یا یہ کہے: میں نے گھر کو فقیروں کے لئے روک دیا یا میں نے ان کے لئے اللہ کی راہ میں دیا۔

مقصود پر دلالت کرنے میں اس طرح کے صریح اور واضح الفاظ کے لئے نیت ضروری نہیں ہے، اس کا مسئلہ ہر قسم کے عقد میں صریح لفظ کی طرح ہے بلکہ اس میں صرف زبان سے بولنا کافی ہے۔

ب۔ کنایہ: وہ لفظ ہے جس میں مراد لیے ہوئے معنیٰ کے علاوہ دوسرے معنیٰ کا بھی احتمال ہو مثلاً کہے: میرا مال فقراء پر صدقہ ہے وغیرہ۔

کنایہ میں حرکات بھی شامل ہیں۔

کنایہ میں لفظ کے ساتھ نیت کا بھی پایا جانا ضروری ہے تاکہ عقد صحیح ہو جس طرح ہر عقد میں کنایہ کے الفاظ کا مسئلہ ہے۔

(۳) وقف کے صیغہ کی شرطیں

وقف کے صیغہ کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں چاہے صیغہ صریح ہو یا کنایہ:

اَ۔ لفظ ایسے بولنے والے کی طرف ہو جس کو مقصود کا احساس ہو یا گونگے کی طرف سے ایسی تحریر جس میں مقصود کی وضاحت ہو۔

ب۔ صیغہ وقت کی تعیین سے خالی ہو، اگر کوئی کہے: میں نے اپنی زمین طلبہ کے لئے ایک سال کے لئے وقف کردی تو یہ وقف باطل ہے، کیوں کہ اس میں وقت متعین کیا گیا ہے۔

وقت متعین کرنے کی شرط سے مستثنیٰ چیزیں:

علماء نے اس شرط سے مسجدوں، سرایوں اور قبرستانوں کو مستثنیٰ کیا ہے، اسی طرح کے دوسرے وہ امور جو غلاموں کو آزاد کرانے کی خاطر ہوں، چنانچہ علماء نے اس شرط کے بغیر وقف کے صحیح ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور شرط کو کالعدم قرار دیا ہے۔ اگر کوئی کہے: میں نے یہ زمین ایک سال کے لئے مسجد یا قبرستان یا سرایے کے لئے وقف کردی تو یہ وقف ہمیشہ کے لئے صحیح ہو جائے گا اور وقت لغو ہوگا۔

ج۔وقف کا مصرف بیان کیا جائے۔اگر کوئی صرف اتنا کہے: میں نے فلاں چیز وقف کر دی یا اللہ کی راہ میں دے دی اور مصرف کو واضح نہ کرے تو وقف صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ کس پر وقف کیا گیا ہے۔

د۔معلق نہ کرے؛ کیوں کہ وقف ایک ایسا عقد ہے جس میں فی الفور مالک بنانا ضروری ہے چنانچہ کسی شرط پر معلق بنانے سے وقف صحیح نہیں ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے: جب زید آئے تو میں نے اپنا گھر فقیروں پر وقف کر دیا۔اگر میری بیوی راضی ہے تو میں نے اپنی گاڑی فقیروں کے لئے وقف کر دی۔یہ وقف باطل ہے کیوں کہ اس طرح کی شرطیں عقد کے تقاضوں کے منافی ہیں،اس شرط سے وہ تمام امور مستثنی ہیں جو غلام آزاد کرانے سے مشابہ ہیں جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے تذکرہ کیا ہے۔اگر کوئی کہے کہ جب رمضان آئے تو میں نے اپنا گھر مسجد کے لئے وقف کر دیا۔

ھ۔کسی بھی طرح کی شرط نہ ہو۔وقف میں خیار شرط اس کے لئے صحیح نہیں ہے،اسی طرح خیار مجلس بھی صحیح نہیں ہے۔اگر کوئی کہے: میں نے اپنا چوپایہ فقیرں پر وقف کر دیا،اور میرے لئے تین دنوں کا اختیار ہے،یا کہے: مجھے اس کو جب چاہے بیچنے کا اختیار ہے۔ وقف کے تقاضے کے مطابق فی الفور وقف کے پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے کی وجہ سے یہ وقف باطل ہو جائے گا۔

موقوف علیہ کوئی متعین شخص ہو تو اس کا قبول کرنا شرط ہے

اگر وقف کسی متعین شخص پر ہو تو موقوف علیہ کا قبول کرنا شرط ہے اور یہ قبول وقف کرنے والے کی طرف سے کئے گئے ایجاب سے الگ سے رہنا ضروری ہے۔جب وہ متعین شخص اس وقف کو قبول کرے تو صحیح ہوگا،اگر رد کر دے تو باطل ہو جائے گا۔

اگر غیر متعین لوگوں پر وقف ہو مثلاً فقراء پر وقف یا مسجد پر وقف تو اس وقف کے صحیح ہونے کے لئے قبول کرنا شرط نہیں ہے کیوں کہ اس میں دشواری ہے۔

وقف کرنے والا اپنے وقف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟

وقف کرنے والے کے لئے اپنے وقف سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے وقف موقوفہ چیز کو وقف کرنے والے کی ملکیت سے نکال دیتا ہے،اسی طرح اس کے فائدوں کو بھی اس کے اختیار سے نکال دیتا ہے،لیکن علماء نے اس سے مستثنیٰ کیا ہے کہ اگر وہ اپنی ملکیت مسجد یا قبرستان یا کنواں بنانے کے لئے وقف کردے تو وہ باقی مسلمانوں کی طرح اس موقوفہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے،اسی بنیاد پر اپنی وقف کی ہوئی مسجد میں نماز پڑھ سکتا ہے،اپنے وقف کئے ہوئے کنویں سے پانی پی سکتا ہے اور اس کے وقف کئے ہوئے قبرستان میں اس کی تدفین کی جاسکتی ہے۔

اس کی دلیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینے تشریف لائے اور وہاں بئر رومہ کے علاوہ کوئی دوسرا میٹھے پانی کا کنواں نہیں تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا:"کون ہے جو رومہ کنویں کو خریدے گا اور اس میں مسلمانوں کے ڈول کے ساتھ اپنا ڈول ڈالے گا جنت میں اس سے بہتر چیز کے بدلے"۔چنانچہ میں نے اپنے خالص مال سے اس کو خریدا" (ترمذی نے حسن سند سے اس کو "المناقب" میں روایت کیا ہے:۳۷۰۴) نسائی:۸۔۶/۲۳۵ کتاب الاحیاء، بخاری کتاب الوصایا:۲۶۲۶)

بئر رومہ مدینہ میں ایک یہودی کی ملکیت تھا جس کا پانی وہ مسلمانوں کو بیچا کرتا تھا،ہر مشک ایک درہم کے بدلے،چنانچہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو خریدا اور مسلمانوں کے لئے اس شکل میں وقف کردیا کہ جس طرح مسلمان اس کنویں سے پانی لیں گے وہ بھی پانی لیں گے۔

وقف لازم ہونے پر مرتب ہونے والے احکام

وقف لازمی عقود میں سے ہے جس پر صرف عقد صحیح مکمل ہونے سے ہی آثار مرتب ہوتے ہیں:

أ۔وقف میں اختیار نہیں ہوتا،چنانچہ جب کوئی صحیح وقف کردے تو اس کو خیار مجلس نہیں رہتا،بالکل اسی طرح اس کو خیار شرط بھی حاصل نہیں رہتا۔

ب۔موقوفہ چیز کی ملکیت اللہ سبحانہ وتعالی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے چنانچہ اصل مالک ملکیت کے طور پر وقف میں تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا، نہ وہ اس کو بیچ سکتا ہے اور نہ اس کو ھدیہ میں دے سکتا ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا تصرف کر سکتا ہے۔

ج۔فائدہ اٹھانے کا حق ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن پر وقف کیا گیا ہو چاہے یہ لوگ خاص ہوں یا عام۔

موقوفہ چیز کی ملکیت

جب وقف کرنے والا کوئی عین چیز جائیداد یا گاڑی یا ہتھیار وغیرہ وقف کر دے تو موقوفہ چیز کی ملکیت اللہ سبحانہ وتعالی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے،پھر موقوفہ چیز واقف کی نہیں رہتی اور نہ ان کی جن پر وقف کی گئی ہے۔

موقوفہ چیز کے فائدے

اگر موقوف علیہ متعین ہو تو موقوفہ چیز کے منافع کا مالک وہی شخص بن جاتا ہے،اس کو ان منافع سے خود سے یا عاریت اور کرایہ پر دے کر دوسرے سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

اسی طرح وہ بعد میں بھی وقف کے حاصل شدہ فائدہ کا مالک ہوگا مثلاً اس پر وقف کئے ہوئے درختوں کے پھل اور اس پر وقف کئے ہوئے چوپایوں کا اون، دودھ اور اس کے بچے وغیرہ۔

اگر موقوف علیہ غیر متعین ہو مثلاً فقیروں یا غریبوں یا کسی ایک جہت پر وقف کیا جائے تو یہ موقوفہ چیز کی منفعت کے مالک نہیں ہوتے بلکہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

موقوفہ چیز کو بیچنا یا خریدنا ،ہدیہ دینا یا وراثت میں تقسیم کرنا نہ وقف کرنے والے کی طرف سے جائز ہے اور نہ موقوف علیہ کی طرف سے،چاہے موقوف علیہ متعین ہو یا متعین نہ ہو، بلکہ یہ اللہ تبارک وتعالی کی ملکیت میں باقی رہتا ہے،اس سے حاصل ہونے والے فائدے موقوف علیہ پر خرچ کیے جائیں گے، واقف نے جس کام کے لئے وقف کیا ہے حتی الامکان اس پر عمل کیا جائے گا۔

اس کی دلیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وقف ہے، کیوں کہ آپ نے اپنے

وقف میں یہ بات کہی تھی کہ نہ اس کو بیچا جائے ،نہ ھبہ کیا جائے اور نہ وراثت میں تقسیم کیا جائے (بخاری:۲۵۸۶، مسلم:۱۶۳۲)

موقوفہ چیز کے اخراجات

اگر موقوفہ چیز کو نفقہ اور اخراجات کی ضرورت ہو مثلا چوپایوں کا چارہ یا عمارتوں کی مرمت یا آلات کی درستگی تو وقف کے یہ اخراجات وقف کرنے والے کی طرف سے لگائی ہوئی شرط کے مطابق ہوں گے یا تو اس کے مال سے یا وقف کے مال سے، اگر وہ کوئی شرط نہ لگائے تو وقف کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے کیے جائیں گے اگر اس کی کوئی آمدنی موجود ہو، اگر موقوفہ چیز کی کوئی آمدنی نہ ہو یا اس کے منافع معطل ہوگئے ہوں تو اس کے اخراجات بیت المال پر لازم ہوں گے کیوں کہ بیت المال کا قیام ہی مسلمانوں کے مفادات کے لئے ہوتا ہے اور موقوفہ چیز پر خرچ کرنا ان کے مفاد میں ہے۔

موقوفہ چیز کا ضیاع اور اس سے متعلق احکام ومسائل

کبھی موقوفہ چیز ضائع ہوجاتی ہے تو اس صورت میں اس پر چند احکام نافذ ہوتے ہیں جو ضائع ہونے والی عین چیز اور ضائع ہونے کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں، یہ احکام مندرجہ ذیل ہیں:

أ۔ اگر موقوفہ چیز ایسا جانور ہو جس کا کھانا حلال نہ ہو اور وہ مرجائے تو اس کا چمڑا موقوف علیہ کو دیا جائے گا کیوں کہ دوسروں کے مقابلے میں وہی اس کا زیادہ حق دار ہے، اگر چمڑے کو دباغت دی جائے تو اس پر وقف ہوجائے گا، وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا ،البتہ وقف کرنے والے کے مقصد کی حتی الامکان حفاظت کے لئے اس کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

ب: اگر موقوفہ چیز ایسا جانور ہو جس کا کھانا حلال ہے اور موقوف علیہ کو یقین ہوجائے کہ یہ بیماری کی وجہ سے مرجائے گا تو ضرورت کی بنا پر اس کو ذبح کرنا جائز ہے، اس کا گوشت بیچا جائے گا اور اس جنس کا دوسرا جانور خریدا جائے گا اور اس کی جگہ اس کو وقف کیا جائے گا۔ایک قول یہ بھی ہے کہ اس جانور کا گوشت حاکم کے حوالے کیا جائے گا کہ وہ

مصلحت کو دیکھتے ہوئے اس بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے۔

ج: اگر موقوفہ چیز تلف ہو جائے، اگر تلف کرنے والے پر اس کی قیمت کا تاوان ہو، مثلاً کوئی اس کو زبردستی تلف کر دے تو موقوف علیہ تلف ہوئی موقوفہ عین چیز کی قیمت کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ اس قیمت سے اسی طرح کی دوسری چیز خریدی جائے گی اور اس کی جگہ وقف ہو جائے گی، یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ وقف کرنے والے کی غرض یعنی ثواب کے جاری رہنے کی رعایت رکھی جائے، اگر اس قیمت سے مکمل عین چیز خریدنا مشکل ہو جائے تو ایک حصہ خریدا جائے گا کیوں کہ یہ وقف کرنے والے کے مقصود سے زیادہ قریب بات ہے۔ اگر موقوفہ چیز ضمانت کے بغیر ضائع ہو جائے یا خود بخود تلف ہو جائے تو موقوفہ چیز کے ختم ہونے کی وجہ سے وقف بھی ختم ہو جائے گا۔

د۔ اگر عین موقوفہ چیز کی منفعت کسی غیر ضامن سبب سے معطل ہو جائے مثلاً کوئی درخت وقف کر دے تو سوکھ جائے یا سیلاب اور آندھی میں اکھڑ جائے اور سوکھنے سے پہلے اس کو دوبارہ بونا ممکن نہ ہو تو وقف منقطع نہیں ہوتا بلکہ وہ وقف ہی باقی رہتا ہے، اس کی جڑوں کو کرایہ وغیرہ پر دے کر فائدہ اٹھایا جائے گا تاکہ عین موقوفہ وقف باقی رہے، اس کو نہ بیچا جائے اور نہ ہبہ کیا جائے، اگر اس کو ختم کیے بغیر مثلاً جلائے اور دوسرے کاموں میں لائے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو تو یہ موقوف علیہ کے لئے جائز ہو جاتا ہے، البتہ اس کو بیچنا اور ہبہ کرنا جائز نہیں ہے۔

ھ: اگر موقوفہ چیز مسجد کی چٹائی یا اسی طرح کی دوسری چیزیں ہوں اور وہ بوسیدہ ہو جائے یا وہ جڑیں ہوں اور ٹوٹ جائے اور جلانے کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لائق نہ ہو تو اس کا بیچنا جائز ہے تاکہ وہ ضائع نہ جائے، یا فائدہ کے بغیر اس کو رکھنے کے لئے جگہ تنگ ہو جائے، اس کی قیمت سے تھوڑا سا پیسہ ملنا وقف کے ضائع ہونے سے بہتر ہے، اس کی ملی ہوئی قیمت مسجد کے مفاد میں خرچ کی جائے گی، اگر ممکن ہو تو اسی طرح کی چیز خریدی جائے۔

اگر جلانے کے علاوہ دوسرے کام کے لائق ہو تو اس کو بیچنا جائز نہیں ہے تاکہ اس عین چیز کو باقی رکھ کر وقف کرنے والے کی غرض حاصل کی جائے۔

و۔اگر مسجد منہدم ہو جائے اور اس کو دوبارہ تعمیر کرنا دشوار ہو تو کسی بھی صورت میں اس کو بیچنا جائز نہیں ہے کیوں کہ کسی دوسرے وقت میں اس کی دوبارہ تعمیر ممکن ہے، اگر اس مسجد کی آمدنی ہو جس کو اس کے مصالح میں خرچ کیا جاتا ہو تو دیکھا جائے گا کہ اس مسجد کی دوبارہ تعمیر کی توقع ہو تو اس آمدنی کو محفوظ رکھا جائے گا، اگر تعمیر جدید کی توقع نہ ہو تو اس کی آمدنی سب سے قریبی مسجد میں خرچ کی جائے گی۔

ز:اگر کسی مسجد کے منہدم ہونے کا اندیشہ ہو تو حاکم کے لئے اس کو گرا کر اسی کے پتھروں سے دوسری مسجد تعمیر کرنا جائز ہے، اس کے پتھروں اور دوسری چیزوں سے کوئی دوسری عمارت تعمیر نہیں کرنا چاہیے تا کہ وقف کرنے والے کے مقصد کی رعایت رکھی جائے۔

گرائی ہوئی مسجد سے قریب نئی مسجد کی تعمیر کرنا اولی اور بہتر ہے۔

ح:۔اگر کوئی کسی وادی پر پل بنا کر دے اور اس وادی کی آبادی نہ رہے جس کی وجہ سے پل کا استعمال معطل ہو جائے اور لوگوں کو دوسرے پل کی ضرورت پڑے تو اس پل کو ضرورت کی جگہ منتقل کرنا جائز ہے تا کہ حتی الامکان وقف کرنے کے مقصد کو باقی رکھا جائے۔

موقوف علیہ کی موت ہو جائے

ا۔اگر موقوف علیہ کی موت ہو جائے تو دیکھا جائے گا، اگر وقف کرنے والے نے اس مرے ہوئے شخص کے علاوہ دوسرا مصرف متعین کیا ہے تو یہ وقف اس کی طرف منتقل ہو جائے گا، وقف اس کی طرف منتقل ہو جائے گا جس کو متعین کیا ہو، مثلاً وقف کرنے والا کہے: میں نے یہ گھریا گاڑی میرے بچے پر وقف کردی پھر فقراء پر۔اگر دوسرا مصرف متعین نہ کرے تو موقوفہ چیز وقف ہی باقی رہے گی اور پہلے موقوف علیہ کی موت کی صورت میں وقف کرنے والے کے سب سے قریبی شخص کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

۲۔اگر دو لوگوں پر وقف کر دے پھر فقراء پر: مثلاً وہ کہے: میں نے اپنی زمین زید اور عمر پر وقف کردی پھر فقراء پر۔ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو وقف کا اس کا حصہ بھی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گا۔کیوں کہ وقف کرنے والے نے فقراء کی طرف وقف

کے منتقل ہونے کی شرط ان دونوں کی موت کو رکھا ہے اور یہ شرط ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔

ج۔جب دو شخصوں پر وقف کرے اور یہ کہہ کر فصل کردے کہ میں نے ان دونوں میں سے ہر ایک پر اس گھر کا آدھا حصہ وقف کردیا پھر فقراء پر،تو یہ دو وقف ہو جائیں گے،اس صورت میں ایک حصہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوگا بلکہ فقراء کی طرف منتقل ہوجائے گا۔

ابتداء میں اور دائمی طور پر وقف کا حکم

ابتداء اور دائمی اعتبار سے وقف کے مختلف احکام ہیں جن میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

أ۔اگر وقف موجود پر ہو مگر یہ کہ دوسرا حصہ منقطع ہو،مثلاً کوئی کہے: میں نے یہ لائبریری اپنی اولاد پر وقف کردی یا کہے: زید پر پھر اس کی نسل پر وقف کردی،اس سے زیادہ نہ کہے تو وقف صحیح ہے،کیوں کہ وقف کا مقصود رشتے داری اور دوام ہے۔جب وقف کا مصرف ابتداء میں بیان کردیا تو اس کو خیر کی راہ میں دائمی بنانا آسان ہے،جب مذکورہ مصرف ختم ہوجائے تو وقف باقی رہے گا کیوں کہ قریبی رشتے داروں پر صدقہ کرنا سب سے افضل ثواب کے کاموں میں سے ہے،کیوں کہ قریبی رشتے داروں پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی،جیسا کہ حدیث میں اس کا تذکرہ آیا ہے:امام ترمذی (کتاب الزکاۃ: ۶۵۸،حسن سند سے اس کو روایت کیا ہے)امام نسائی (الزکاۃ ۸۔۵/۹۲)اور امام ابن ماجہ (الزکاۃ:۱۸۴۴)نے سمعان بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ ہے اور رشتے دار پر دو ہے،صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی" اس وقت وقف وراثت کے رشتے داروں کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ رحم کے رشتے داروں کے فقراء کے لئے ہوگا،چنانچہ نواسی کو چچازاد بھائی پر مقدم کیا جائے گا۔

ب۔اگر وقف ابتداء میں ہی منقطع ہو مثلاً وقف کرنے والا کہے: یہ گھر میرے ہونے والے بچے پر وقف ہے پھر فقیروں پر تو یہ وقف پہلے میں باطل ہوجائے گا کیوں کہ فی الفور اس کو مالک بنانے کا امکان نہیں ہے،جیسا کہ اس کی تفصیلات پہلے گذر چکی ہیں،اور دوسرے میں بھی باطل ہے کیوں کہ یہ پہلے پر مرتب ہے۔

ج۔اگر وقف درمیان میں منقطع ہو مثلاً وقف کرنے والا کہے: میں نے یہ دکان خالد کے بچوں پر وقف کردی پھر ایک شخص پر پھر فقیروں پر تو یہ وقف صحیح ہے، کیوں کہ فی الحال اور مستقبل میں مصرف موجود ہے، خالد کے بچوں کے بعد اس کو فقراء میں خرچ کیا جائے گا، وقف کرنے والے کا سب سے قریبی رشتے دار اس کا مصرف نہیں ہوگا کیوں کہ انقطاع کی مدت معلوم نہیں ہے۔

موقوفہ چیز پر ولایت کے مسائل:

وقف کا کوئی نگراں رہنا ضروری ہے جو اس پر نظر رکھے اور اس کے مفادات کا خیال رکھے اور اس کی حفاظت کرے اور واقف کی طرف سے بیان کردہ جہت میں اس کے منافع کو خرچ کرے۔

وقف کی ولایت کے سب سے زیادہ حق دار لوگ

موقوفہ چیز پر ولایت کا سب سے زیادہ حق دار وہ شخص ہے جس کو خود وقف کرنے والا متعین کردے۔

اگر خود کو وقف کی نگرانی کے لئے متعین کرے تو اس کی نگرانی کا حق اسی کو ہوگا اور وہی اس کا زیادہ حق دار ہے، اگر کسی دوسرے شخص یا چند افراد کو متعین کرے تو اس کی شرط مانی جائے گی، چاہے وقف پر نگرانی کی ذمے داری اپنی زندگی کے دوران دے یا اس کی وصیت کرے کیوں کہ وہی صدقہ کے ذریعے اللہ تبارک وتعالی سے قریب ہونے والا ہے چنانچہ نگرانی میں اس کی شرط مانی جائے گی، جس طرح مصارف وغیرہ میں اس کی بات مانی جاتی ہے، اگر ذمے داری کسی شخص کے حوالے کرے، اگر وہ مرجائے تو دوسرے کے حوالے تو اس کے وقف کی نگرانی میں اس کی خواہش پوری کی جائے گی۔

عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے حوالے کیا پھر کہا کہ اس کے ذمے دار حفصہ کے گھر والوں میں سے اہل الرائے ہوں گے۔(امام ابوداود نے یہ روایت کی ہے: الوصایا: ۲۸۷۹) اگر وقف کرنے والا وقف کی نگرانی کے لئے کسی کو متعین نہ کرے تو اس وقت نگران قاضی ہوگا کیوں کہ وہی عمومی ذمے دار ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہ

وقف کی نگرانی کا زیادہ حق دار ہے۔

وقف کے نگراں کے لئے شرطیں

وقف کے نگراں میں مندرجہ ذیل شرطں کا پایا جانا ضروری ہے:

ا۔ عادل ہو یعنی وہ دینی امور میں استقامت رکھتا ہو، نگران میں عادل ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ نگرانی ولایت ہے اور ولایت عدالت کے بغیر صحیح نہیں ہے۔

۲۔ اپنی نگرانی میں موجود چیز میں تصرف کرنے کی اس میں طاقت اور صلاحیت ہو اور اس میں تصرف کے سب سے بہترین طریقے کی طرف راہ پانے کی اہلیت ہو۔

اگر نگران میں ان میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو حاکم موقوفہ چیز اس سے لے گا اور خود سے اس کی نگرانی کرے گا یا جس کو چاہے اس کا ذمے دار بنائے گا۔

اگر اس کی کمی زائل ہو جائے اور اس میں نئے سرے سے ولایت کی شرطیں پائی جائیں تو دوبارہ وقف کا ذمے دار بنے گا جب خود واقف نے اس کو نگران بنانے کی شرط لگائی ہو۔

نگران مصلحت کی راہوں میں ہی اس کو خرچ کرے گا اور اس سلسلے میں احتیاط کرے گا، کیوں کہ وہ دوسرے کے مفادات کی نگرانی کر رہا ہے، اس لیے وہ یتیم کے ولی کی طرح ہے۔

وقف کے نگران کی ڈیوٹی

وقف کے نگران کی ڈیوٹی مندرجہ ذیل ہے:

اُ۔ موقوفہ چیز کے امور کی انجام دہی مثلاً عمارت کی دیکھ بھال، اس کو کرایے پر دینا، آمدنی کو حاصل کرنا اور اس کے مستحقین میں اس کو تقسیم کرنا اور پوری احتیاط کے ساتھ اصل چیز اور آمدنی کی حفاظت کرنا، کیوں کہ اس کو یہی ذمے داری دی گئی ہے، اگر واقف مطلقاً نگرانی کی ذمے داری دے یا تمام امور اس کے حوالے کرے تو نگران یہ تصرف کرے گا، اگر بعض امور کی ذمے داری دے تو جتنی ذمے داری دی گئی ہے اتنی ہی ادا کرے گا اور وقف کرنے والے کی شرط کو پورا کرتے ہوئے اس سے زیادہ تصرف نہیں کرے گا، اس بارے میں اس کی شان وکیل کی طرح ہے جو اتنے حدود میں ہی تصرف کرسکتا ہے جتنے کا اس کو وکیل بنایا گیا ہے۔

ب:۔اگر وقف کرنے والا دو افراد کی شرط لگائے تو ان میں سے ایک شخص خود سے تصرف نہیں کرسکتا جب تک خود وقف کرنے والا یہ بات نہ کہے،اگر وقف کرنے والا یہ بات کہے تو اس کے لئے تصرف کرنا جائز ہے۔

اگر نگراں حاکم کے پاس مقدمہ پیش کرے اور اپنے لئے اجرت مقرر کرنے کی درخواست کرے تو حاکم کے لئے اس کے کام کے مناسب مزدوری مقرر کرنا جائز ہے،یہ اس وقت ہے جب حاکم کو اجرت کے بغیر وقف کی نگرانی کرنے والا کوئی دوسرا نہ ملے، نگران بھلے طریقے سے موقوفہ چیز کا پھل کھا سکتا ہے جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا:''اس پر کوئی گناہ نہیں جو اس کا ذمے دار ہو کہ وہ اس میں سے بھلے طریقے پر کھائے''۔

نگران اور موقوف علیہ کے درمیان اخراجات میں اختلاف ہو جائے

جب نگران منافع کو اس کے مستحقین میں خرچ کرنے کا دعوی کرے اور یہ لوگ اس کا انکار کردے تو دیکھا جائے گا:اگر وہ متعین ہوں تو ان کی بات مانی جائے گی اور ان کو حساب کا مطالبہ کرنے کا حق ہے،اگر موقوف علیہ متعین نہ ہوں تو حاکم حساب کتاب کا مطالبہ کرسکتا ہے،خرچ کی مقدار میں نگران کی تصدیق کی جائے گی اگر اتنے خرچ کا احتمال ہو،اگر حاکم اس پر الزام لگائے گا تو اس سے قسم لے گا۔

نگران کو معزول کرنے کے احکام

نگران میں اہلیت نہ ہو تو اس کو معزول کیا جائے گا جیسا کہ نگران کی شرطوں میں بتایا جاچکا ہے،اسی طرح وقف کرنے والا معزول کرے تو بھی معزول ہو جاتا ہے،اس وقت اس کے لئے کسی دوسرے کو نگران بنانا صحیح ہے،کیوں کہ نگران وکیل ہوتا ہے اور وکیل بنانے والے کو یہ حق رہتا ہے کہ وہ اپنے وکیل کو جب چاہے معزول کردے،مگر یہ کہ وقف کرنے والا وقف کے وقت اس شخص کی نگرانی کی شرط لگائے تو اس صورت میں اس کو معزول کرنا جائز نہیں ہے چاہے کسی مصلحت کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو،کیوں کہ عقد کے وقت جو شرط لگائی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

وقف کے بعض مسائل

۱۔ اگر وقف کرنے والا اپنے وقف کے بارے میں کہے: میں نے یہ گھر اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں پر وقف کیا تو یہ سبھی لوگ وقف کے مستحق ہوں گے اور وقف کا نفع تمام لوگوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا، مرد اور عورت کے درمیان نہ کوئی فرق ہے اور نہ بچے اور نواسے و پوتے کے درمیان، کیوں کہ ''اور'' کا لفظ ایک کو دوسرے سے ملانے کے لئے آتا ہے، ترتیب بیان کرنے کے لئے نہیں۔

۲۔ اگر کوئی کہے: میں نے یہ گھر اپنے بچوں پر وقف کیا تو اس وقف میں پوتے اور نواسے داخل نہیں ہوں گے، کیوں کہ اگر بچے موجود ہیں تو بچے کہنے سے اس میں پوتے اور نواسے داخل نہیں ہوتے ہیں، البتہ اگر صرف پوتے اور نواسے ہوں، بچے موجود نہ ہوں تو بچے کہنے سے پوتے اور نواسے مراد ہوں گے اور وہ وقف کے مستحق ہوں گے، کیوں کہ اس کا قرینہ پایا جاتا ہے، یہ بھی وجہ ہے کہ ایک مکلّف شخص کی بات کو لغو ہونے سے بچایا جائے۔

۳۔ اگر کہے: یہ باغ میری ذریت، میری نسل، میرے بعد والوں کے لئے وقف ہے تو اس میں پوتے اور نواسے اور ان کے بعد والے سبھی داخل ہو جائیں گے چاہے وہ مرد ہوں یا عورت کیوں کہ اس لفظ میں سبھی آجاتے ہیں۔

۴۔ اگر کوئی کہے: میں نے اپنا مال میرے غریب رشتے داروں پر وقف کیا تو وقف کرنے کے ساتھ نسب میں شریک ہر فرد اس وقف میں داخل ہو جائے گا چاہے وہ قریبی رشتے دار ہو یا دور کا، مرد ہو یا عورت، وارث ہو یا غیر وارث محرم ہو یا غیر محرم۔

۵۔ اگر کوئی وقف میں ابتدائی فرد کے ساتھ کوئی شرط مثلاً محتاجی کی شرط لگائے تو اس شرط کا بعد والے تماموں میں اعتبار ہوگا مثلاً کہے: میں نے یہ زمین میرے محتاج بچوں، پوتوں، نواسوں اور بھائیوں پر وقف کر دی تو محتاجی کی شرط ان سبھوں کے ساتھ ہوگی۔

۶۔ جس طرح مصلحتوں اور جہات پر مثلاً مسجدوں، مدرسوں، علماء اور فقراء پر خیراتی وقف معروف ہے اسی طرح رشتے داروں، بچوں، پوتوں و نواسوں اور ذریت پر وقف بھی معروف ہے۔

وقف مسلمانوں کے کارناموں میں سے ہے

وقف ثواب کے کاموں میں سے ہے اور عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے، وقف واقف کے ایمان کی سچائی، خیر میں اس کی رغبت ودلچسپی، مسلمانوں کے مفادات کی خواہش، ان سے محبت اور بعد میں آنے والی مسلم نسلوں سے محبت اور مسلسل ان کو فائدہ پہنچانے پر دلالت کرتا ہے، مسلمانوں نے وقف کے میدانوں میں نبی کریم ﷺ کے زمانے سے عظیم الشان مثالیں قائم کی ہیں چنانچہ مسلمانوں نے لاتعداد جائیدادیں وقف کی ہے اور بے انتہا مالوں کو اللہ کی راہ میں لگایا ہے اور ان کے اوقاف خیر کے بہت سارے پہلوؤں اور معروف وبھلائی کے بہت سے میدانوں کو شامل ہیں، مدارس، مساجد، شفاخانے، زمین، عمارتیں، کنویں، لائبریریاں، ہتھیار، فقراء پر، مجاہدین پر اور علماء پر، اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے میدانوں میں۔

مسلمانوں نے زندگی کا کوئی بھی میدان نہیں چھوڑا ہے، ہر میدان میں وقف کیا ہے، معاشرے کی کسی بھی ضرورت کو یوں ہی نہیں چھوڑا ہے، ہر ایک ضرورت کے لئے مال کو روکا ہے، دنیا کے گوشوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے مسلمانوں کے اوقاف اور اللہ کی راہ میں دیے ہوئے اموال کے بارے میں معلوم ہو جائے گا، اس میں ان کا حاکم بھی شریک ہے، محکوم بھی، قائدین بھی، فوجی بھی، تاجر بھی، کاریگر بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، یہاں تک کہ ہر مسلم ملک میں اتنی اوقاف ہیں کہ ان کی آمدنی کروڑوں ہے، اور ہر ملک میں ان اوقاف کے لئے الگ سے وزارت قائم کی گئی ہے جو ان چیزوں کی نگرانی کرتی ہے اور ہزاروں خاندان ان اوقاف کے ثمرات اور آمدنی سے زندگی گزار رہے ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسری بہت سی ضرورتیں اور متعدد مصالح ہیں جو ان اوقاف کی گود میں پروان چڑھ رہے ہیں اور مسلسل جاری ہیں، اللہ ان نیک بندوں کو بہترین بدلہ عطا فرمائے اور ان کو اجر عظیم سے نوازے لیکن ہمارے ان دنوں میں بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں وقف کا رواج بہت کم ہوگیا ہے اور مسلمان اسی طرح کے صدقات جاریہ میں اور مفید نیکی کے کاموں میں کنجوسی کر رہے ہیں۔

یہ بڑی افسوس ناک بات ہے، اگر اس سے کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کو اجر وثواب میں رغبت نہیں ہے اور آخرت اور اس کی نعمتوں پر ایمان کمزور ہوگیا ہے اور دنیا اور اس کی شہوتوں کی محبت میں اضافہ ہوگیا ہے اور لوگ اس فانی دنیا میں مشغول ہوگئے ہیں اور اس کو آخرت اور اس کی نعمتوں پر ترجیح دے رہے ہیں، ہم میں اللہ کا یہ فرمان بالکل صحیح ثابت ہوا ہے: "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا" (اعلیٰ: ۱۶) بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

گویا ہم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا ہے "وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقَى" (اعلیٰ: ۱۷) اور آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

لا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم.

وصیت

وصیت کی تعریف:

لغت میں وصیت کے معنی پہچانے کے ہیں۔

وصیت اور ایصاء دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

وصیت اسم مفعول بھی ہوتا ہے جس کے معنی مُوصی بہ ہے(جس کے بارے میں وصیت کی جائے)،اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:"مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا" (نساء۲)وصیت کے بعد جو تم کرتے ہو۔

اور مصدر بھی ہوتا ہے ایصاء کے معنی میں،اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:"شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ" (مائدہ۱۰۶)وصیت کے وقت تمھارے درمیان گواہی جب تم میں سے کسی کو موت آئے۔

لیکن فقہاء نے ان دولفظوں"وصية" اور"ایصاء" کے درمیان فرق کیا ہے،وہ کہتے ہیں:"أوصیت الیہ" کے معنی یہ ہے کہ میں نے مثلاً کوتاہ لوگوں کے امور کی نگرانی اس کے حوالے کی۔اس کو وصایۃ اور ایصاء کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔اور"أوصیت لہ" کے معنی یہ ہے: میں نے اس کو خیرات دی اور اس کو مال وغیرہ کا مالک بنایا۔فقہاء نے اس کو "وصية" کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

وصیت کے اصطلاحی معنی اور شرعی معنی :موت کے بعد کسی حق کو خیرات کرنا،اس خیرات کو وصیت کہا جاتا ہے کیوں کہ وصیت کرنے والے نے اس کے ذریعے اپنی آخرت کے خیر کو دنیا کے خیر کے ساتھ ملا دیا ہے۔

وصیت اور تملیک کی دوسری قسموں کے درمیان فرق

وصیت کی تعریف سے اس کے درمیان اور تملیک کی دوسری قسموں کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے کہ وصیت میں تملیک کا تعلق موت کے بعد ہے جب کہ دوسرے عقود مثلاً ہبہ وغیرہ میں تملیک زندگی ہی میں ہوتی ہے۔

وصیت کے دلائل:

وصیت شریعت اسلامی میں مشروع ہے اور اس کے دلائل قرآن، حدیث اور صحابہ کے عمل میں ملتے ہیں اور اس پر علمائے اسلام کا اجماع ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ'' (بقرہ: ۱۸۰) تم پر فرض کر دیا گیا جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر وہ مال چھوڑے والدین اور قریبی رشتے داروں کے لیے بھلائی کے ساتھ وصیت کو، یہ متقیوں پر فرض ہے۔

یہ بھی فرمان خداوندی ہے: ''مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ'' (نساء: ۱۱) وصیت پورا کرنے کے بعد جس کی وصیت کی جائے یا قرض کی ادائیگی کے بعد۔

اللہ عزوجل نے فرمایا: ''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ'' (مائدہ: ۱۰۶) اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو وصیت کے وقت تمھارے درمیان گواہی تم میں دو عادل لوگ ہیں۔

وصیت کے بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں:

امام بخاری (کتاب الوصایا: ۲۵۸۷) اور امام مسلم (کتاب الوصیۃ: ۱۶۲۷) نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان شخص کا یہ حق ہے، جس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وصیت کی جائے کہ وہ دو راتیں گزارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو''۔

یعنی احتیاط اور بردباری یہ ہے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہو، کیوں کہ موت

کب آتی ہے اس کو معلوم نہیں ہے جو اس کے اور اس کی خواہشات اور ارادوں کے درمیان موت رکاوٹ بن جائے۔

امام ابن ماجہ (الوصایا ۲۷۰۰) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''محروم وہ ہے جو وصیت سے محروم کردیا جائے''۔رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''جو وصیت پر مرا تو اس کی موت صحیح طریقے اور سنت پر ہوئی اور اس کی موت تقوی اور شہادت پر ہوئی اور اس کی موت مغفور ہو کر ہوئی'' (ابن ماجہ: الوصایا: ۲۷۰۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے اپنے کچھ مال کی وصیت کیا کرتے تھے۔

امام عبدالرزاق نے مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''صحابہ اپنی وصیتوں کی ابتداء میں لکھا کرتے تھے: **بسم اللہ الرحمن الرحیم** :**هذا ما وصى فلان بن فلان** ۔اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان رحم والا ہے، یہ وصیت فلان بن فلان نے کی ہے کہ وہ اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور گواہی دے کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں، اور اللہ قبروں میں مدفون لوگوں کو دوبارہ اٹھائے گا، اور اپنے گھر والوں میں سے چھوڑے ہوئے لوگوں کو وصیت کی کہ وہ اللہ سے ڈریں اور آپس میں صلاح وصفائی کریں، اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، اور ان کو وہی وصیت کی جس کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچوں کو کی ہے''**إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ** ''(بقرہ: ۱۳۲) بے شک اللہ نے تمھارے لیے دین (اسلام) کو منتخب کیا ہے، پس تمھاری موت اسی حال میں ہو کہ تم مسلمان رہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے فقہائے اسلام کا وصیت کے جائز ہونے پر اجماع ہے اور کسی سے بھی اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔

زندگی میں صدقہ کرنا وصیت سے افضل ہے:

زندگی میں صدقہ کرنا اس صدقہ سے بہتر، افضل، زیادہ ثواب کا باعث اور عظیم اجر فراہم کرنے والا ہے جس کو انسان اپنی موت کے بعد کرتا ہے، جس کو اصطلاح میں وصیت کہا جاتا ہے، کیوں کہ زندگی میں صدقہ اجر وثواب کے حاصل ہونے میں زیادہ سبقت رکھتا ہے اور مومن کے ایمان کی سچائی، خیر وبھلائی اور احسان کرنے کی رغبت وخواہش اور محبت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ "(مائدہ:۴۸) پس بھلے کاموں کی طرف لپکو۔

یہ بھی ارشاد باری تعالی ہے: "وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ "(المنافقون:۱۰) اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔

امام بخاری (الزکاۃ:۱۳۵۳) اور امام مسلم (الزکاۃ:۱۰۳۲) نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اللہ کے رسول! کون سا صدقہ سب سے عظیم اجر والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اس حال میں صدقہ کرو کہ تم صحت مند ہو اور تم میں بخل کے ساتھ حرص ہو، تمہیں فقر کا اندیشہ ہو، مالداری کی امید ہو، اور اس وقت تک انتظار مت کرو کہ روح حلقوم تک پہنچ جائے تو تم کہو: فلاں کے لئے یہ ہے، فلاں کے لئے یہ ہے، جب کہ وہ فلاں کے لئے تھا"۔

یعنی جب تم موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگو تو وصیت کرنے لگو، جب کہ یہ مال تمہارے ورثہ کو ہونے والا ہی ہے۔

امام ترمذی (الوصایا:۲۱۲۴) نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "اس شخص کی مثال جو موت کے وقت آزاد کرتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو اس وقت ہدیہ کرتا ہے جب آسودہ ہو جاتا ہے"۔

وصیت مشروع کرنے کی حکمت

شرعی اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ وصیت جائز نہ ہو، کیوں کہ اس کا تعلق اس مدت سے ہے جب وصیت کرنے والے کا حق اس کے مال میں منقطع ہو جاتا ہے، کیوں کہ موت اس کی ملکیت کو ختم کرنے والی ہے، لیکن حکیمانہ شریعت نے وصیت کی اجازت دی ہے، کیوں کہ اس میں وصیت کرنے والے، اس کے رشتے داروں اور معاشرے کا مفاد ہے، وصیت کرنے والے کا مفاد یہ ہے کہ وصیت پر اجر وثواب ملتا ہے اور موت کے بعد اس کا ذکر خیر ہوتا ہے۔

اس کے رشتے داروں کا مفاد اس لئے ہے کہ عام طور پر وصیت ان رشتے داروں کو کی جاتی ہے جو اسلامی شریعت کے نظام وراثت کے بموجب وارث نہیں ہوتے ہیں، چنانچہ وہ وصیت کی وجہ سے تھوڑے سے مال کے مستحق ہو جاتے ہیں، عام طور پر یہ لوگ اس کے ضرورت مند رہتے ہیں۔

معاشرے کا مفاد اس لئے ہے کہ وصیت خیر کے عمومی راستوں میں خرچ کرنے کا ایک دروازہ ہے مثلاً مساجد، مدارس، کتب خانے اور شفاخانے وغیرہ اور عمومی جہتوں میں خرچ کرنے کی ایک راہ ہے مثلاً فقراء، ایتام اور علماء۔

اسی وجہ سے وصیت اسلامی نظام میں معاشرے کی کفالت کے قوانین اور اصولوں میں سے ہے، اور اس میں جو خیر و بھلائی اور فائدہ ہے وہ مخفی نہیں ہے۔

وصیت کا حکم

شروع اسلام میں والدین اور رشتے داروں کو پورے مال کی وصیت کرنا ضروری تھا۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ" (بقرہ:۱۸۰) تم پر فرض کر دیا گیا جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر وہ مال چھوڑے والدین اور قریبی رشتے داروں کے لیے بھلائی کے ساتھ وصیت کو، یہ متقیوں پر فرض ہے۔

لیکن وجوب کا یہ حکم وراثت کی آیتوں اور احادیث مبارکہ سے منسوخ ہو گیا اور خیر

کے میدانوں میں وصیت کرنا ایک تہائی یا اس سے کم مال میں غیر وارث کے حق میں مستحب ہے۔

امام ابو داود (الوصایا: ۲۸۶۹) اور امام ترمذی (الوصایا: ۲۱۱۸) نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اِنْ تَرَکَ خَیْرًا اَلْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ" وصیت اسی طرح تھی یہاں تک کہ وراثت کی آیتوں نے اس کو منسوخ کر دیا۔

عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی اونٹنی پر خطاب کیا جب کہ میں اس کی گردن کے اندرونی حصے کے نیچے تھا اور وہ اونٹنی جگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں پر گر رہا تھا، پس میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ عزوجل نے ہر حق والے کو اس کا حق عطا کیا ہے، پس وارث کے لئے وصیت نہیں ہے، بچہ بستر والے کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے"۔ (ترمذی: الوصایا: ۲۱۲۲، نسائی: الوصایا ۶/ ۲۴۷)

"اس کے لئے پتھر ہے" کے دو مفہوم بیان کئے گئے ہیں: ایک یہ کہ اس کے لئے پتھر ہے یعنی اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، دوسرا مفہوم یہ کہ اس کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے گا، اس کو شریعت میں رجم کہتے ہیں جب کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اسلام میں رجم کی سزا ہے۔

ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، چنانچہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے"۔

(ابو داود، الوصایا: ۲۸۷۰)

وصیت کے دوسرے احکام

خیر کی راہوں میں غیر وارث کے لئے وصیت کرنا مستحب ہے، لیکن بعض حالات میں وصیت کرنا واجب ہوتا اور کبھی حرام، کبھی جائز اور کبھی مکروہ۔

کب وصیت کرنا واجب ہے؟

اس وقت وصیت کرنا واجب ہے جب آدمی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی شرعی حق ہو مثلاً زکوۃ اور حج باقی ہو اور وصیت نہ کرنے پر یہ حق ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اسی طرح کسی شخص کا حق

ہو مثلاً امانت اور قرض ہو، کیوں کہ اگر وہ نہیں بتائے گا تو اس بارے میں معلوم نہیں رہے گا۔

ب: کب وصیت کرنا حرام ہے؟

ان چیزوں کی وصیت کرنا حرام ہے جن کا استعمال شریعت میں حرام ہے مثلاً شراب یا عمومی اخلاق کو بگاڑنے والے منصوبوں میں خرچ کرنے کی وصیت کرے تو یہ وصیت باطل ہے، اس کو نافذ نہیں کیا جائے گا۔

والدین کو نقصان پہنچانے اور ان کو شریعت کی طرف سے مقرر کردہ حصے کو اپنے سے روکنے کے ارادے سے وصیت کرنا بھی حرام ہے۔

اللہ تبارک وتعالی نے وصیت کے ذریعے نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''غَیْرَ مُضَارٍّ وَصِیَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ'' (نساء:۱۲) جو نقصان پہنچانے والی نہ ہو، یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ علم والا اور حلم والا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کا کام کرتے ہیں پھر جب ان کو موت آتی ہے تو وہ وصیت میں نقصان پہنچاتے ہیں، اس کے نتیجے میں ان پر جہنم واجب ہو جاتی ہے''۔ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تلاوت کی: ''مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَا اَوْ دَیْنٍ غَیْرَ مُضَارٍّ وَصِیَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ'' (نساء:۱۱) وصیت پورا کرنے کے بعد جس کی وصیت کی جائے یا قرض کی ادائیگی کے بعد، جو نقصان پہنچانے والی نہ ہو، یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ علم والا اور حلم والا ہے۔ انھوں نے **وذلک الفوز العظیم** تک تلاوت کی۔ (ابو داود: ۲۸۶۷، الوصایا، ترمذی: الوصایا: ۲۱۱۸)

مکمل آیتیں اس طرح ہیں: ''تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ'' (نساء ۱۲-۱۳) یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے تو اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرتا ہے جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ج: جائز وصیت

دوست یا مالدار کے لئے وصیت کرنا جو عالم یا صالح نہ ہو، اگر وصیت میں نیکی اور صلہ رحمی کی نیت کرے تو یہ وصیت مستحب ہوگی کیوں کہ اس میں اطاعت کے معنی پائے جاتے ہیں۔

د۔ مکروہ وصیت

اگر وصیت کرنے والے کے پاس مال کم ہو اور اس کے فقیر وارثوں کو مال کی ضرورت ہو تو وصیت کرنا مکروہ ہے، اسی طرح فاسقوں اور گنہ گاروں کے لئے اس وقت صیت کرنا مکروہ ہے جب وصیت کرنے والے کو غالب گمان ہو کہ وہ اس مال کے ذریعے اپنے گناہوں میں مدد لیں گے۔

وصیت کے ارکان اور ہر رکن کی شرطیں:

وصیت کے چار مندرجہ ذیل ارکان ہیں:

وصیت کرنے والا، جس کے لئے وصیت کی جائے، وصیت کردہ چیز اور صیغہ۔ ان ارکان میں سے ہر رکن کی چند شرطیں ہیں جن کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس شخص کی وصیت صحیح ہے جس میں مندرجہ ذیل شرطیں پائی جائیں:

أ۔ عقل مند ہو، یہ شرط پایا جانا ضروری ہے خصوصاً ہدیوں اور خیرات میں، چنانچہ پاگل، بیوقوف کی وصیت صحیح نہیں ہے اور نہ بیہوش کی اور نہ نشے میں وصیت صحیح ہے، البتہ نشہ عمداً کیا ہوا تو وصیت ہو جائے گی، کیوں کہ یہ لوگ اپنی عقل کھو دیتے ہیں، جب کہ عقل مکلّف بنانے کی بنیاد ہے، اسی وجہ سے وہ خیرات کرنے کی اہلیت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

ب۔ بالغ ہو، کیوں کہ مکلّف ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے، اس بنیاد پر بچے کی وصیت صحیح نہیں ہے، چاہے وہ ممیّز کیوں نہ ہو، کیوں کہ وہ خیرات کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔

ج۔ وصیت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے کیوں کہ وصیت اپنے حق کو ہبہ کرنا ہے، جس میں ہبہ کرنے والے کی رضامندی اور اختیار رہنا ضروری ہے۔

د۔آزاد ہو، چنانچہ غلام کی وصیت صحیح نہیں ہے، وہ مکمل طور پر غلام ہو یا مدبر ہو یا مکاتَب، کیوں کہ غلام مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اور اس کے پاس جو کچھ ہے سب اس کے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شرطوں کی بنیاد پر مندرجہ ذیل لوگوں کی وصیت صحیح ہوتی ہے:

۱۔کافر، کیوں کہ وہ خیرات دینے کا اہل ہے۔

۲۔بیوقوفی کی وجہ سے جس پر پابندی لگائی گئی ہو، کیوں کہ اس کا اعتبار کرنا صحیح ہے اور اس کو موت کے بعد ثواب کی ضرورت ہے۔

جس کے لئے وصیت کی جائے اس کی شرطیں:

موصی لہ کی دو قسمیں ہیں: ایک متعین اور دوسرا غیر متعین۔

ان میں سے ہر ایک کی مخصوص شرطیں ہیں:

متعین موصی لہ کی شرطیں

متعین موصی لہ کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

أ۔وصیت کرنے والے کی موت کے وقت موصی لہ کی ملکیت کا تصور ممکن ہو، چنانچہ مرے ہوئے شخص کے حق میں وصیت صحیح نہیں ہے اور نہ کسی چوپائے کے حق میں، کیوں کہ مردار ملکیت کا اہل نہیں ہے، اسی طرح چوپایہ بھی مالک نہیں بن سکتا، یہ مسئلہ اس وقت ہے جب وہ چوپایے کے لئے وصیت کی تفصیل بیان نہ کرے، اگر تفصیل بیان کرے کہ چوپائے کے چارے پر خرچ کرنے کی وصیت کرے تو یہ وصیت صحیح ہے، اس صورت میں وصیت چوپائے کے مالک کے لئے ہوگی کیوں کہ اس کو چارہ دینے کی ذمے داری مالک پر ہے اور وصیت کرنے والے کی غرض کی رعایت کرتے ہوئے چوپائے کے چارے پر وصیت کو خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا تفصیلات کے مطابق وصیت کے وقت موجود حمل کے لئے وصیت کرنا صحیح ہے، اور یہ وصیت اس صورت میں نافذ کی جائے گی جب یہ حمل چھ مہینے سے کم مدت میں زندہ

پیدا ہو جائے اور اس میں پائیدار زندگی پائی جائے کیوں کہ یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے۔

ب۔ معصیت نہ ہو، چنانچہ کافر کے لئے مسلم غلام دینے کی وصیت کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ مصحف دینے کی وصیت کرنا جائز ہے، اس طرح اہل حرب کو ہتھیار یا مال دینے کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ ان سبھی امور میں معصیت پائی جاتی ہے۔

ج۔ موصی لہ متعین ہو، چنانچہ ان دولوگوں میں سے کسی ایک کے لئے وصیت صحیح نہیں ہے کیوں کہ موصی لہ مجہول ہے، موصی لہ سے ناواقفیت وصیت کی ہوئی چیز کو اس کے حوالہ کرنے سے مانع ہے چنانچہ اس وصیت کا فائدہ نہیں ہے۔

د۔ موصی لہ وصیت کے وقت موجود ہو چنانچہ ہونے والے حمل کے لئے وصیت صحیح نہیں ہے اور نہ ایسی مسجد کے لئے جو تعمیر کی جانے والی ہو۔

معین وصیت میں مسجد کی تعمیر، نئے سرے سے یا ترمیم یا اس کے مصالح ومفادات شامل ہیں۔

مسجد کے معنی میں مدرسہ، سرائے اور شفاخانہ داخل ہے، کیوں کہ اس میں ثواب ہے۔

اگر مطلقاً وصیت کرے مثلاً کہے: میں نے اس مسجد کے لئے وصیت کی اور تعمیر وغیرہ اس کے مصالح میں سے کسی مصلحت کا تذکرہ نہ کرے تو وصیت صحیح ہو جائے گی اور اس کو مسجد کے مفادات میں خرچ کیا جائے گا کیوں کہ عرف کا تقاضا یہی ہے۔

مذکورہ شرطوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قاتل کے لئے وصیت صحیح ہے کیوں کہ یہ عقد کے ذریعے مالک بنانا ہے تو ہبہ کے مشابہ ہو گیا، اسی طرح وارث کے لئے بھی وصیت کرنا صحیح ہے اگر باقی وارثین اس کی اجازت دیں، اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

غیر متعین موصی لہ کی شرطیں

غیر متعین مثلاً کسی عمومی جہت مثلاً فقراء، علماء، مساجد اور مدارس غیرہ کے لئے وصیت میں شرط یہ ہے کہ وصیت کسی معصیت کے لئے نہ ہو، چنانچہ غیر مسلموں کی عبادت گاہ قائم کرنے یا سینما وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے وصیت صحیح نہیں ہے کیوں کہ ایسی جگہوں پر وقف

ضائع ہوتا ہے اور لوگ اپنے مفادات ومصالح اور اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی سے غافل ہو جاتے ہیں۔

جن میدانوں میں وصیت کرنا جائز ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

أ۔اللہ کی راہ میں۔ اگر کوئی کہے: میں نے اپنا ایک تہائی مال اللہ کی راہ میں وصیت کی تو اس کی وصیت صحیح ہوگی کیوں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب کا کام ہے اور یہ وصیت زکوۃ کے حق دار مجاہدین میں صرف کی جائے گی جن کا تذکرہ اللہ تبارک وتعالی کے اس فرمان میں ہے: "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ" زکوۃ فقراء، مسکینوں، زکوۃ وصول کرنے والوں، تالیف قلوب کیے جانے والوں، غلاموں، قرض داروں، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہے، یہ اللہ کی طرف سے فرض کیا ہوا ہے اور اللہ خوب جاننے والا اور بڑا حکمت والا ہے۔(توبہ۶۰)

کیوں کہ شریعت کے عرف میں یہ نام ان ہی کے لئے ثابت ہے چنانچہ وصیت کرنے والے کی اس بات کو ان ہی پر محمول کیا جائے گا۔

ب۔علماء، اگر کوئی اپنے مال میں سے ایک لاکھ روپے علماء کے لئے وصیت کردے تو اس کی وصیت صحیح ہوگی کیوں کہ علماء مالک بننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور ان پر خرچ کرنا شریعت اسلامی کے نزدیک ثواب کا کام ہے، لیکن یہ وصیت شریعت اسلامی کے علماء پر صرف کی جائے گی، مثلاً مفسرین، محدثین، فقہاء اور علماء، عقائد وغیرہ دوسرے دینی علوم وفنون کے علماء کیوں کہ عرف عام میں ان ہی کو علماء کہا جاتا ہے، چنانچہ اس وصیت میں سے ادباء انجینئروں اور ڈاکٹروں اور ان کی طرح دوسرے دنیوی مواد کے علماء کو نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ عرف عام میں ان کو علماء نہیں کہا جاتا ہے، اگر عرف تبدیل ہو جائے اور عالم ہر اس شخص کو کہا جانے لگے جو کسی بھی فن میں سند کا حامل ہو تو اس وقت علماء کے لئے وصیت ہر قسم کے عالم میں صرف کی جائے گی، پھر علمائے شریعت کی تخصیص نہیں رہے گی۔

ج۔فقراء،ان میں مساکین بھی شامل ہیں،اسی طرح اگر کوئی مساکین کے لئے وصیت کرے تو اس میں فقراء بھی شامل ہوں گے،ان میں سے تین کو دینا کافی ہے کیوں کہ کم از کم جمع تین ہے۔

د۔آل بیت (حضور ﷺ کے خاندان والے) اگر کوئی کہے: میں نے اپنے ایک تہائی مال کی وصیت رسول اللہ ﷺ کے خاندان والوں کے لئے کی تو وصیت کیا ہوا مال بنو ہاشم اور بنو مطلب سے تعلق رکھنے والوں کو دیا جائے گا اور ان میں سے بھی تین پر اکتفا کرنا جائز ہے۔

ھ۔قریبی رشتے دار: اس میں وصیت کرنے والے کا ہر قریبی رشتہ دار داخل ہے چاہے باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے، البتہ اس میں وارثین شامل نہیں ہیں۔

و۔حج اور عمرہ: اگر کوئی کہے: میں نے اپنے مال میں سے ایک لاکھ روپے حج اور عمرہ کے لئے وصیت کردی تو یہ وصیت صحیح ہے، کیوں کہ حج اور عمرہ ثواب کا کام ہے اور یہ مال حج اور عمرہ کرنے والوں کو دیا جائے گا۔

اگر کوئی وصیت کرے کہ اس کی طرف سے حج کیا جائے تو اس کی وصیت صحیح ہے اور اس کی طرف سے اس کے شہر یا میقات سے حج کیا جائے گا جیسے وہ وصیت کرے، اگر وہ مطلقاً کہے اور جگہ کی تعیین نہ کرے تو کم سے کم درجہ پر محمول کرتے ہوئے اس کی طرف سے میقات سے حج کیا جائے گا اور عام طور پر لوگوں کا عمل یہ ہے کہ وہ میقات سے حج کرتے ہیں، اگر یہ عمومیت بدل جائے اور یہ عرف تبدیل ہوجائے تو عرف پر عمومی عمل کرتے ہوئے وصیت کرنے والے کے شہر سے حج کیا جائے گا جیسا کہ آج کل یہ عام بات ہے۔

موصی بہ (وہ چیز جس کی وصیت کی جائے) میں چند شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے، اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو وصیت صحیح ہوجاتی ہے، اگر شرطیں نہ پائی جائیں تو وصیت کالعدم ہوگی۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔موصی بہ ایسی چیز ہو جس سے فائدہ اٹھانا حلال ہو چنانچہ ایسی چیزوں کی وصیت صحیح نہیں ہے جس سے فائدہ اٹھانا حرام ہو مثلاً لہو ولعب کے آلات اور جوے کا ساز وسامان وغیرہ۔

ب۔وہ چیز منتقل کی جاسکتی ہو،چنانچہ قصاص کی وصیت کرنا صحیح نہیں ہے،اسی طرح حق شفعہ کی وصیت کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کو منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے،کیوں کہ اس کا مستحق اس کو منتقل نہیں کرسکتا ہے۔

مذکورہ دو شرطوں کی بنیاد پر مندرجہ ذیل امور میں وصیت صحیح ہے:

أ۔مجہول مال کی وصیت کرنا صحیح ہے مثلاً پیٹ کے حمل اور تھن میں موجود دودھ اور بکری کی پیٹھ پر موجوداُون کی وصیت کرنا،کیوں کہ وارث ان چیزوں میں حقیقی مالک کا نائب بن جاتا ہے،اس طرح موصی لہ بھی اس کے نائب بن جاتے ہیں اور خود وصیت مجہول چیز پر مشتمل ہوتی ہے۔

ب۔وصیت کے وقت معدوم چیز کی بھی وصیت صحیح ہے،تا کہ لوگوں پر نرمی کی جائے اور ان پر وسعت کی جائے،چنانچہ معدوم کی وصیت صحیح ہے جیسے مجہول کی وصیت صحیح ہے،اس کے صحیح ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیع سلم،مساقاۃ اور کرایہ سے معدوم کی ملکیت حاصل کرنا صحیح ہے،یہی مسئلہ وصیت کا بھی ہے۔

ج۔مبہم چیز کی وصیت صحیح ہے،مثلاً کہے:میں نے اپنے دو کپڑوں میں سے ایک کی وصیت کی،کیوں کہ وصیت میں جہالت کا احتمال ہوتا ہے،وارث ان دونوں میں سے ایک کو متعین کرے گا۔

د۔وقتی طور پر اور ہمیشہ کے لئے صرف منافع کی وصیت کرنا بھی صحیح ہے،کیوں کہ یہ مال ہے جو عوض کے مقابل ہوتا ہے،اسی طرح منافع کو چھوڑ کر صرف عین چیزوں کی بھی وصیت کرنا صحیح ہے کیوں کہ موصی لہ کو عین چیز کرایہ یا عاریت وغیرہ پر دے کر نفع پہنچایا جاسکتا ہے،اسی بنیاد پر عین چیز کی وصیت کسی ایک کے لئے اور منفعت کی وصیت دوسرے کے لئے صحیح ہے مثلاً گھر کی ملکیت کی وصیت زید کے لئے کرے اور وہاں رہنے کی وصیت خالد کے لئے۔

ھ۔ایسی نجاست کی وصیت کرنا صحیح ہے جس سے فائدہ اٹھانا حلال ہو مثلاً سدھایا ہوا کتا،گوبر اور محترم شراب،یہ وہ شراب ہے جو سرکہ بنانے کی غرض سے نچوڑی جائے،کیوں کہ وراثت میں اس کا منتقل ہونا ثابت ہے۔

ایجاب وقبول کی شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

اَ۔وصیت صریح یا کنایہ لفظ سے ہو۔

صریح یہ ہے کہ کہے: میں نے ایک ہزار روپیوں کی وصیت کی، یا کہے: میری موت کے بعد اس کو ایک ہزار روپئے دے دو، یا کہے: میری موت کے بعد اس کو دو، یا کہے: یہ میری موت کے بعد اس کے لئے ہے، صریح لفظ سے وصیت منعقد ہو جاتی ہے اور صرف اس لفظ کے کہنے سے صحیح ہو جاتی ہے، پھر اس کی یہ بات قبول نہیں کی جائے گی کہ اس نے وصیت کی نیت نہیں کی ہے۔

اس حکم میں گونگے کا سمجھ میں آنے والا اشارہ بھی ہے۔

کنایہ میں لفظ کے ساتھ نیت کا رہنا ضروری ہے کیوں کہ اس لفظ میں وصیت کے علاوہ دوسرے امور کا بھی احتمال رہتا ہے، چنانچہ نیت سے لفظ کے مراد لیے ہوئے معنی کی تعیین ہوتی ہے، کنایہ یہ ہے کہ مثلاً کہے: میری یہ کتاب زید کے لئے ہے۔ جو گونگا نہیں ہے اس کی تحریر کنایہ ہے جس سے وصیت نیت کے ساتھ منعقد ہوتی ہے جیسا کہ خرید فروخت کا مسئلہ ہے۔

ب: موصی لہ قبول کرے، اگر وصیت کسی متعین شخص یا اشخاص کے لئے ہو ،اگر وصیت عمومی جہت مثلاً فقیروں یا علماء وغیرہ کے لئے ہوتو قبول کرنے کی شرط نہیں ہے کیوں کہ اس میں دشواری ہے، اس وقت وصیت کرنے والے کا انتقال ہونا ضروری ہے۔

ج۔وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد موصی لہ قبول کرے، وصیت کرنے والے کی زندگی میں اس کے قبول کرنے یا رد کرنے کا اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ انتقال سے پہلے اس کو کوئی حق ہی نہیں ہے۔

اسی بنیاد پر اگر وصیت کرنے والے کی موت سے پہلے ہی موصی لہ کا انتقال ہو جائے تو وصیت باطل ہو جائے گی کیوں کہ وصیت، وصیت کرنے والے کے انتقال سے پہلے لازم نہیں ہوتی ہے، اگر وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد موصی لہ کا انتقال ہو جائے لیکن ابھی اس نے وصیت کو قبول نہ کیا ہو تو قائم مقام ہوں گے، وہ قبول کریں تو وہی اس کے وارث ہوں گے۔

وصیت کے حدود

ا۔ وصیت کرنے والے کے لئے ضروری ہے اور اس سے یہ درخواست کرنا مستحب ہے کہ وہ اپنی وصیت میں ایک تہائی سے اضافہ نہ کرے، یہ حکم سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بنیاد پر ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے موقع پر میرے اس مرض میں میری عیادت کی جس کی وجہ سے میں موت کے قریب پہنچ گیا تھا، کہا: اللہ کے رسول! میں جس تکلیف کا شکار ہوں آپ دیکھ رہے ہیں جب کہ میں مالدار ہوں اور میری وارث صرف میری ایک بیٹی ہے، کیا میں اپنے دو تہائی مال کو صدقہ کردوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا: کیا میں آدھا مال صدقہ کردوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، ایک تہائی مال اور ایک تہائی بہت ہے، تم اپنے وارثین کو مالدار چھوڑو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ ان کو فقیر چھوڑ دو کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں تم اللہ کی رضامندی کے لئے جو بھی خرچ کرتے ہو تو تم کو اس پر اجر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں ڈالتے ہو"۔ (یہ الفاظ مسلم کے ہیں: کتاب وصایا ۱۶۲۸، بخاری الوصایا: ۲۵۹۱)

اب مسئلہ یہ ہے کہ وصیت کرنے والا رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی مخالفت کرے اور ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

علمائے شافعیہ نے کہا ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنا شرعی اعتبار سے مکروہ ہے، لیکن صحیح ہے، البتہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نافذ نہیں کی جائے گی، اگر وارثین اجازت دے تو نافذ کی جائے گا، اگر یہ لوگ زیادہ کو رد کردیں تو بالاتفاق زیادہ کی وصیت باطل ہوجائے گی، کیوں کہ ایک تہائی سے زیادہ کی مقدار وارثوں کا حق ہے، اگر وہ اجازت دیں تو نافذ ہوجائے گی تا کہ وصیت کرنے والے کے زائد تصرف کو پورا کیا جائے۔

اگر وصیت کرنے والے کے وارثین نہ ہو اور وہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرے تو ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت باطل ہوگی کیوں کہ یہ مسلمانوں کا حق ہے چنانچہ کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے: وصیت کا ایک تہائی مال سے کم ہونا مستحب ہے، کیوں

کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک تہائی اور ایک تہائی بہت ہے''اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے وارثین کو مال دار چھوڑو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ ان کو غریب چھوڑو کہ وہ لوگوں سے مانگتے پھریں''۔

ب۔مال کا اعتبار وصیت کرنے والے کی موت کے وقت ہوگا،وصیت کے وقت نہیں،کیوں کہ وصیت انتقال کے بعد مالک بنانا ہے۔

اگر کوئی ایک ہزار روپے کی وصیت کرے اور وصیت کے وقت اس کے پاس تین ہزار روپے ہوں،جب کہ اس کے انتقال کے وقت صرف دو ہزار ہی باقی بچیں تو ان دو ہزار میں ایک تہائی وصیت ثابت ہوگی اور باقی رقم کی وصیت کا نفاذ وارثین کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر وہ اجازت دیں گے تو وصیت نافذ ہوگی،اگر رد کردیں تو زائد وصیت باطل ہو جائے گی۔

ج۔میت پر موجود قرض کو ادا کرنے کے بعد ایک تہائی کا اعتبار ہوگا۔

اگر کوئی ایک تہائی مال کی وصیت کرے تو اس کے قرض کے ادا کرنے کے بعد جو مال بچتا ہے اس میں ایک تہائی وصیت نافذ کی جائے گی۔اللہ تبارک وتعالی میراث کے بارے میں فرماتا ہے: ''مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِيٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ ''(نساء:۱۱) وصیت پورا کرنے کے بعد جس کی وصیت کی جائے یا قرض کی ادائیگی کے بعد۔

بالاجماع قرض وصیت پر مقدم ہے،اگر اس پر اتنا قرض ہو کہ پورا مال ختم ہو جائے تو اس کی وصیت نافذ نہیں ہوگی۔اگر وصیت کرنے والا اپنے مرض الموت میں اتنی وصیتیں اور خیرات کرے جو اس کے ایک تہائی مال سے زائد ہو اور وارثین زائد کی اجازت نہ دیں تو مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق وصیتوں اور خیرات کو نافذ کیا جائے گا۔

اگر ان خیرات میں سے بعض مکمل ہوں اور بعض معلق ہو تو مکمل کو معلق پر مقدم کیا جائے گا،کیوں کہ مکمل لازم ہے،اس سے رجوع ممکن نہیں ہے،برخلاف معلق کے،اس سے رجوع ممکن ہے،اگر کوئی ایک ہزار کی قیمت کا گھر وقف کردے اور اپنی موت کے بعد ایک ہزار کی وصیت کرے اور موت کے وقت اس کی وراثت تین ہزار ہوں تو وقف کو مقدم کیا

جائے گا اور وصیت کالعدم ہوگی ،البتہ وارثین اجازت دیں تو وصیت نافذ ہوگی کیوں کہ مرض الموت میں خیرات کو وراثت کے ایک تہائی سے دیا جائے گا۔

۲۔اگر اس کے تمام خیرات موت کے بعد متعلق ہوں اور وہ ایک تہائی سے زیادہ ہوں اور وارثین زیادہ کی اجازت بھی نہ دیں تو ایک تہائی کو حصوں کے بقدر تمام کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

اگر کوئی زید کے لئے سو،خالد کے لئے پچاس اور عمرو کے لئے پچاس کی وصیت کرے اور اس کا ایک تہائی مال ایک سو ہوتا ہوتو زید کو پچیس ، خالد کو پچیس اور عمرو کو پچیس دیے جائیں گے۔

۳۔اگر مرض الموت میں کئی مکمل خیرات جمع ہو جائیں مثلاً وقف اور صدقہ اور ان سب کو ملایا جائے تو ایک تہائی سے بڑھ جائے تو پہلے کو دوسرے پر مقدم کیا جائے گا یہاں تک کہ ایک تہائی مال ختم ہو جائے ،اس میں وارثین کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔جب مرض الموت میں مکمل خیرات جمع ہو جائیں اور وہ ایک ساتھ کئے ہوئے ہوں تو قیمت کے ذریعے ایک تہائی مال کو ان خیرات کے درمیان تقسیم کیا جائے گا کیوں کہ ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔

وارث کے لئے وصیت کے احکام ومسائل

أ۔وصیت میں اصل یہ ہے کہ غیر وارث کے لئے ہو،کیوں کہ اس کا مقصد ثواب حاصل کرنا اور زندگی میں جو کام نہیں کیا گیا ہے اس کا تدارک کرنا ہے،اور وارث وراثت سے اپنا حصہ پاتا ہے۔

اگر وصیت کرنے والا اس کی مخالفت کرتے ہوئے وارث کے لئے وصیت کرتا ہے تو اس وصیت کا کیا حکم ہے؟

مسلک شافعی کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ اس طرح کی وصیت جائز ہے،لیکن وارث کے حق میں اس کو نافذ نہیں کیا جائے گا جب تک دوسرے وارثین اس کی اجازت نہ دیں،اگر وہ

اجازت دیں گے تو یہ وصیت نافذ کی جائے گی۔

یہ حکم نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے اخذ کردہ ہے: ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، چنانچہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے''۔ (ترمذی: الوصایا: ۲۱۴۱، ابوداود: ۲۸۷۰، دونوں نے یہ روایت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے)

امام دارقطنی (۱۵۲/۴) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وارثین چاہیں''۔

اسی طرح علماء نے وارث کے لئے وصیت کا قیاس ایک تہائی سے زائد کی اجنبی کے لئے وصیت پر قیاس کیا ہے اور اس بنیاد پر کہا ہے: ایک تہائی سے زائد کی وصیت وارثین کی اجازت پر موقوف ہے، اسی طرح وارث کے لئے وصیت کا بھی یہی حکم ہے۔

ب۔ اگر کوئی اپنے کسی وارث کو وصیت کرے تو وصیت کرنے والے کی زندگی میں وارثین کے قبول کرنے اور نہ کرنے کا اعتبار نہیں ہوگا، کیوں کہ وصیت کرنے والے کی زندگی میں ان کو وارث کا کچھ بھی حق نہیں ہوتا، جس طرح کہ موصی لہ کو بھی کوئی حق نہیں رہتا ہے۔

جو وارث وصیت کرنے والے کی زندگی میں قبول کرے تو اس کو اس کے انتقال کے بعد رجوع کرنے کا حق ہے، اسی طرح اگر کوئی اس کی زندگی میں قبول نہ کرے تو اس کی موت کے بعد قبول کرنا بھی جائز ہے۔

ج۔ وصیت کرنے والے کے انتقال کے وقت موصی لہ کے وارث ہونے کا اعتبار ہوگا، اس کی وصیت کے وقت کا نہیں، اگر کوئی اپنے بھائی کے لئے وصیت کرے اور وصیت کے وقت اس کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر مرنے سے پہلے اس کو اولاد ہو جائے تو یہ صحیح ہے اور نافذ بھی کی جائے گی کیوں کہ یہ وصیت غیر وارث کے حق میں ہے، کیوں کہ وصیت کرنے والے کے انتقال کے وقت اس کا بچہ موجود ہے، اور نرینہ اولاد ہونے کی صورت میں بھائی کو وراثت نہیں ملتی ہے۔

د۔ اگر بعض وارثین کسی وارث کے لئے وصیت کی اجازت دیں اور دوسرے وارثین اس کا انکار کردیں تو ہر ایک کو فیصلے کا اختیار ہے، اس صورت میں انکار کرنے والے

کے حصے میں وصیت رد کی جائے گی اور اجازت دینے والوں کے حصے میں نافذ کی جائے گی ، یہ وارث میں ان کے حصوں کے بقدر نافذ کیا جائے گا۔

ھ۔اگر کوئی اپنے مرض الموت میں کسی وارث کو کوئی چیز ہدیہ میں دے یا اس پر وقف کردے یا اس کا کوئی قرض معاف کردے تو اس کا حکم بھی وارث کے حق میں وصیت کی طرح ہی ہوگا، اگر ورثین اجازت دیں گے تو اس کو نافذ کیا جائے گا۔

وصیت سے رجوع کا حکم

وصیت جائز عقود میں سے ہے، لازم عقود میں سے نہیں مثلاً عقد بیع اور عقد نکاح، اسی بنیاد پر وصیت کرنے والے کو اپنی وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے، پوری وصیت سے بھی رجوع کرسکتا ہے اور وصیت کے بعض حصے سے بھی، اور اس میں تبدیل کرنے اور اس میں شرطوں اور قیود کا اضافہ کرنے کا بھی اس کو حق ہے، کیوں کہ جس مال کی اس نے وصیت کی ہے ابھی اس کی ملکیت سے نکلا نہیں ہے، جب تک وہ زندہ ہے، وہ مال اس کی ملکیت ہے، چنانچہ اس کو مال میں جس طرح چاہے تصرف کرنے کا حق ہے۔

وصیت سے رجوع کا طریقہ کیا ہے؟

وصیت سے ایسے لفظ کے ذریعے رجوع کرنا صحیح ہے جو اس پر دلالت کرے مثلاً: میں نے وصیت کو باطل کیا یا میں نے وصیت سے رجوع کیا یا میں نے وصیت کو فسخ کیا یا کہے: یہ میرے وارثوں کے لئے ہے۔

وصیت کی ہوئی چیز میں کوئی ایسا تصرف کرے جس سے وصیت کے باطل ہونا یا اس سے اعراض معلوم ہوجائے تو بھی وصیت سے رجوع مانا جائے گا مثلاً جس چیز کی وصیت کی ہو اس کو بیچ دے یا اس کو مہر بنادے یا کسی کو ہدیہ میں دے یا قرض کے بالمقابل اس کو رہن میں رکھے اور اس کے حوالے کردے، اس طرح کے تصرف کا مطلب اس کو کالعدم کرنا ہے، کیوں کہ ان میں سے بعض تصرفات میں یہ مال اس کی ملکیت سے چلا جاتا ہے اور بعض میں بیع کے لئے پیش کرنے کی طرح ہوجاتا ہے مثلاً رہن کی صورت میں ہوتا ہے، سابقہ

تفصیلات کی بنیاد پر چند احکام ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ اگر کوئی متعین گیہوں کے بارے میں وصیت کرے پھر اس کو دوسرے گیہوں کے ساتھ ملا دے تو اس کو رجوع مانا جائے گا کیوں کہ اس وصیت کردہ چیز کو خلط ملط کرنے کی وجہ سے موصی لہ کے حوالے کرنا دشوار ہے۔

۲۔ اگر کوئی بوری میں سے ایک صاع گیہوں کی وصیت کرے پھر اس کے ساتھ اس سے اچھا گیہوں ملا دے تو اس کو رجوع مانا جائے گا، کیوں کہ اس نے ملا کر اس میں اضافہ کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اس زیادتی کے بغیر حوالے کرنا ممکن نہیں ہے۔

۳۔ اگر کوئی بوری میں سے ایک صاع گیہوں کی وصیت کرے پھر اس کو اس قسم کے گیہوں کے ساتھ ملا دے تو اس کو وصیت سے رجوع نہیں مانا جائے گا، کیوں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اسی طرح اگر اس سے گھٹیا گیہوں ملا دے تو بھی وصیت سے رجوع نہیں مانا جائے گا کیوں کہ یہ وصیت کردہ چیز میں عیب لگانے کی طرح ہو جائے گا جس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

۴۔ جب کوئی گیہوں کی وصیت کرے پھر اس کو پیس دے، یا آٹے کی وصیت کرے پھر اس کو گوندے یا روٹی بنا دے، روئی کی وصیت کرے پھر اس کو کاتے یا کاتے ہوتے کپڑے کو سیے یا کپڑے کی وصیت کرے تو اس کو سیے یا کسی زمین کی وصیت کرے پھر اس پر تعمیر کرے یا اس پر درخت لگائے تو ان سبھی چیزوں کو وصیت سے رجوع مانا جائے گا، اس کے دو مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

۱۔ موصی لہ کی طرف سے وصیت کے حق دار بننے سے پہلے موصی بہ کا نام ختم ہو جاتا ہے، گویا یہ موصی بہ کو تلف کرنے کی طرح ہے۔

۲۔ ان تصرفات کے دوران اس طرح کے تصرفات سے وصیت سے اعراض معلوم ہوتا ہے۔

ایصاء

ایصاء کی تعریف:

وصیت کی تعریف کے موقع پر ہم کہہ چکے ہیں کہ وصیت اور ایصاء کے ایک ہی معنی ہے ،البتہ فقہاء نے ''ایصاء'' کو قاصر اور عاجز لوگوں کے امور کی نگرانی کے موضوع کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

اسی بنیاد پر ایصاء یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھروسہ مند شخص کو اپنی اولاد کی نگرانی کرنے ،اپنی وصیت نافذ کرنے ،اپنے قرضوں کی ادائیگی اور اپنی امانتوں کو لوٹانے وغیرہ کی ذمے داری دے۔

وصی کی تعریف

گذشتہ تفصیلات سے وصی کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص ہے جو بچوں کی نگرانی ،امانتوں کو لوٹانے اور قرضوں کو ادا کرنے کی ذمے داری مالک کی طرف سے نیابت میں اور اس کی طرف سے مکلّف کرنے کی وجہ سے پوری کرے۔

ایصاء کا حکم

دراصل ایصاء مستحب ہے، البتہ کبھی یہ واجب ہو جاتا ہے۔

امام اوزاعی نے لکھا ہے: ''یہ بات ظاہر ہے کہ اگر ولایت کا حق دار نہ ہو تو اپنے بچوں کے سلسلے میں بھروسہ مند، باصلاحیت اور وجیہ شخص کو وصیت کرنا والد پر ضروری ہے جب اس کو ایسا شخص ملے اور اس کو غالب گمان ہو کہ اگر اس نے وصیت نہ کی تو اس کے مال پر کوئی خائن قاضی یا کوئی دوسرا ظالم قبضہ کرے گا، کیوں کہ والد پر اپنے بچے کے مال کو ضائع ہونے سے حفاظت کرنا ضروری ہے''۔

علامہ باجوری رحمۃ اللہ علیہ نے ''حاشیۃ الباجوری'' میں لکھا ہے: ''مذکورہ ایصاء مستحب ہے سوائے اس حق کی ادائیگی میں جس کو ادا کرنے سے وہ فی الحال عاجز ہو اور اس پر کوئی گواہ بھی نہ ہو تو اس وقت وصیت کرنا واجب ہے، کیوں کہ اس کی وصیت نہ کرنے سے یہ حق ضائع ہو جائے گا''۔

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایصاء اس صورت میں واجب ہے جب وصیت کرنے والے یا موصی لہ کے حقوق ضائع ہونے کا خطرہ ہو اگر اس کو واضح کر کے بیان نہ کیا جائے اور اس کی ذمے داری اٹھانے والے کو اس کی ذمے داری نہ دی جائے۔

اسی طرح اس وقت بھی واجب ہے جب چھوٹے بچوں کے ضائع ہونے یا ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اس صورت میں ان کے والد پر ایسے شخص کو وصیت کرنا ضروری ہے جس پر اس کو بھروسہ ہو، تا کہ وہ ان کے امور کی نگرانی کرے اور ان کے مفادات کی رعایت رکھے۔

مذکورہ بالا امور میں سے کوئی چیز نہ ہو تو ایصاء مستحب ہی رہتا ہے۔

ایصاء مشروع کرنے کی حکمت

ایصاء کو مشروع کرنے کی حکمت اس کی ضرورت پیش آنا اور لوگوں کے مفادات اور مصلحتوں کو پورا کرنا ہے۔

کبھی انسان موت کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اس کے اور لوگوں کے درمیان مادی تعلقات رہتے ہیں مثلاً اس کے پاس امانتیں اور عاریت میں لی ہوئی چیزیں رہتی ہیں، کبھی اس پر قرض رہتا ہے، اس کی موت کے بعد ان تمام ذمے داریوں کی ادائیگی کی نگرانی کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی اس کے عاجز بچے اور اولاد رہتی ہیں جن کو اپنے مالی امور میں تصرف کرنے کی صلاحیت اور قدرت نہیں رہتی، ان صورتوں میں مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جس میں ان امور کی نگرانی کرنے کی صلاحیت ہو تا کہ وہ ان امور کو انجام دے، اسی وجہ سے اسلام نے ایصاء کو مشروع کیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔

وصی کی شرطیں

وصی کے لئے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

أ۔وہ مکلّف ہو یعنی عاقل اور بالغ ہو، کیوں کہ جو عاقل اور بالغ نہیں ہے اس کو خود ایسے شخص کی ضرورت رہتی ہے جو اس کی نگرانی کرے اور اس کو سنبھالے پھر اس کی ولایت کیسے صحیح ہے کہ وہ دوسروں کی نگرانی کرے؟!

ب۔وہ آزاد ہو، کیوں کہ غلام اپنے مال میں تصرف نہیں کرسکتا تو اس کا وصی ہونا صحیح نہیں ہے کہ دوسرے کے مال میں تصرف کرے، چاہے اس کا آقا اس کی اجازت دے۔

ج۔مسلمان ہو، کیوں کہ یہ مسلمان پر ولایت کا مسئلہ ہے، چنانچہ کافر کو مسلمانوں کے امور کی نگرانی کے لئے وصی بنانا صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ متہم ہے اور اللہ نے اس کو مسلمانوں پر ولایت نہیں دی ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا" ۔(آل عمران:۱۱۸) اے ایمان والوں غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمھاری برائی میں کمی نہیں کرتے۔

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے: "وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا" (سورۂ نساء ۱۴۱) اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر راہ نہیں بنائے گا۔

لیکن ایک ذمی دوسرے ذمی کو وصی بنا سکتا ہے، اور ذمی مسلمان کو وصی بنا سکتا ہے۔

د۔وہ عادل ہو، کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو، اس میں صرف ظاہری عدالت کافی ہے یعنی اس کا ظاہری حال اس طرح ہو، چنانچہ فاسق کو وصی بنانا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ایصاء ولایت اور امانت داری ہے اور فاسق امین نہیں ہے۔

ھ۔وصیت کردہ چیز میں تصرف کی اہلیت رکھتا ہو اور اس میں اس کی صلاحیت ہو چنانچہ بیوقوف، بیمار، بہت ہی بوڑھے، مختل العقل، غافل وغیرہ کو وصی بنانا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح کے افراد کو ذمے دار بنانے میں مصلحت اور مفاد نہیں ہے۔

مندرجہ بالا شرطوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مندرجہ ذیل افراد کو وصی بنانا جائز ہے:

ا۔اندھا؛ کیوں کہ ان امور میں اس کو وکیل بنایا جاسکتا ہے جس کو وہ خود سے جان نہ سکتا ہو

ب۔عورت؛ کیوں کہ وہ تصرف کرسکتی ہے۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو وصی بنایا۔(ابو داود:الوصایا:۲۸۷۹) بلکہ عورت میں وصی کی تمام شرطیں پائی جائیں تو اس کو وصیت کرنا اولی ہے کیوں کہ وہ اولاد پر زیادہ شفیق اور مہربان رہتی ہے۔

وصی اور ایصاء سے متعلق بہت سے احکام ہیں جن کو اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

وصی کو اپنے علاوہ دوسرے کو وصی بنانے کا حق نہیں ہے کیوں کہ وصیت کرنے والے نے اس کا انتخاب کیا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے کے تصرف پر راضی نہیں ہوا ہے، یہ اس وقت ہے جب وصیت کرنے والا مطلقا وصی بنائے یا وکیل نہ بنانے کی بات کہے،البتہ اس کی اجازت دے تو دوسرے کو وصی بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

ب۔وصی کو موقت اور معلق بنانا جائز ہے،اگر کہے میں نے فلاں کو اپنے بچے کے بالغ ہونے تک یا میرے بھائی کے آنے تک وصی بنایا جائے تو یہ جائز ہے،اسی طرح اگر کوئی کہے:اگر میں مروں تو میں نے تم کو وصی بنایا تو یہ جائز ہے کیوں کہ وصی بنانے میں جہالت اور خطروں کا احتمال ہے جیسا کہ وصیت میں ہے،اور وصی بنانا امارت دینے کی طرح ہے،نبی کریم ﷺ نے غزوہ موتہ میں زید بن حارثہ کو امیر بنایا اور فرمایا اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر،اگر جعفر شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہؓ۔(بخاری،المغازی:۴۰۱۳)

ج۔اگر دو لوگوں کو وصیت کرے اور ان میں سے کسی کو تصرف میں تنہا آزادی نہ دے، بلکہ دونوں کے اجتماع کی شرط لگائے یا مطلقا وصی بنائے مثلاً کہے:میں نے زید اور عمر و کو وصی بنایا تو ان دونوں میں سے کسی ایک کو تنہا تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے،پہلے میں شرط پر عمل کرتے ہوئے اور دوسرے میں احتیاط کی خاطر،البتہ اگر وصی بناتے وقت وصیت کرنے والا ان دونوں میں سے ہر ایک کے انفرادی تصرف کی صراحت کردے مثلاً کہے:میں نے تم دونوں میں سے ہر ایک کو وصی بنایا تو ان دونوں کو انفرادی طور پر تصرف کرنے کا حق ہے،کیوں کہ وصیت کرنے

والے کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔

د۔عقد ایصاء دونوں طرف سے جائز عقد ہے، اس لیے وصی کو خود جب چاہے ایصاء سے معزول ہونے کا حق ہے جیسا کہ وکالت میں ہوتا ہے کیوں کہ وہ وصیت کرنے والے کا وکیل ہے، لیکن اس صورت میں خود کو معزول کرنا صحیح ہے جب وہی وصیت کی نگرانی کے لئے متعین نہ ہو اور موصی لہ کے مال کے تلف ہونے کا غالب گمان نہ ہو کہ کوئی ظالم ان کے مال پر قبضہ کرے گا، اگر یہ صورت حال ہے تو خود کو معزول کرنا جائز نہیں ہے اور اس کے معزول کرنے کو نافذ بھی نہیں کیا جائے گا کیوں کہ اس میں یتیموں کے مفادات کی رعایت ہے اور ان سے اور ان کے مال سے خطرات کو دفع کرنا ہے۔

ھ۔بچوں کے امور کا وصی بنانے میں شرط یہ ہے کہ بنانے والے کو ان پر ولایت حاصل ہو مثلاً باپ اور دادا۔

چنانچہ دادا کی موجودگی میں باپ کو دادا کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو وصی بنانے کا اختیار نہیں ہے کیوں کہ دادا کی ولایت شرعی طور پر ثابت ہے چنانچہ اس کو اپنے سے ولایت کو منتقل کرنا جائز نہیں ہے مثلاً شادی کرنے کی ولایت۔

و۔جب بچہ بالغ ہو جائے اور وصی سے خرچ کرنے میں جھگڑا ہو اور وہ دعوی کرے کہ وصی نے اسراف کیا ہے تو وصی کی بات قسم لے کر مانی جائے گی کیوں کہ وہ امین ہے۔

اگر بچے کے بالغ ہونے کے بعد مال دینے کے سلسلے میں وصی سے جھگڑا ہو تو بچے کی بات قسم لے کر مانی جائے گی، اس آیت کریمہ سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے: ”فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ“ (نساء:۶) پس جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ بناؤ۔

کیوں کہ وصی کے لئے یہ بات دشوار نہیں ہے کہ مال بچے کو دیتے وقت کسی کو گواہ بنائے یا بینہ قائم کرے۔

علمِ میراث

علمِ میراث کو علم الفرائض بھی کہا جاتا ہے۔

علم الفرائض کی تعریف

علم حقیقت کے مطابق کسی چیز کے ادراک کرنے کو کہا جاتا ہے۔

اسی طرح علم کا اطلاق حقیقت کے مطابق فیصلہ کرنے والے ذہن کے حکم پر بھی ہوتا ہے، اسی طرح مدون اصولوں اور واضح کردہ فنون پر بھی ہوتا ہے۔

فرائض؛ فریضہ کی جمع ہے، اس کے معنی حصے کے ہیں، علم میراث میں شریعت کی طرف سے حصے مقرر ہیں، اس لیے اس علم کو علمِ فرائض کہا جاتا ہے۔

فرض کے لغوی معنی مقرر کرنے کے ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "**فنصف ما فرضتم**" (بقرہ ۲۳۷) یعنی وہ نصف حصہ جس کو تم نے مقرر کیا ہے۔

فرض کے شرعی معنی شریعت میں وارث کے لیے مقرر کردہ حصے کے ہیں۔

علمِ فرائض کے اصطلاحی اور شرعی معنی؛ میراث کے مسائل اور اس حساب کا علم ہے جس سے وراثت میں ہر حق والے کے حق کی معرفت حاصل ہو۔

علمِ فرائض کو علم میراث بھی کہا جاتا ہے، مواریث میراث کی جمع ہے، یہ بھی قول ہے کہ یہ تراث اور ارث کی جمع ہے، میت سے جو وراثت حاصل کی جاتی ہے اس کو میراث کہا جاتا ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: "**ورث فلان غیرہ**" جب کوئی اس کی وراثت سے کوئی چیز پائے تو اس طرح کہا جاتا ہے۔ یا اس کی وفات کے بعد کسی معاملے میں اس کا جانشین بن جائے، اس معنی میں اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "**وللہ میراث السموات والأرض**" (آل عمران ۱۸۰) اور آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ کے لیے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وارث متوفی کے مال کی ملکیت میں جانشین بن جاتا ہے۔

وراثت کی مشروعیت

وراثت اسلام میں مشروع ہے اور قرآن وحدیث کے نصوص اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جو کوئی اس کی مشروعیت کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور اسلام سے مرتد ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مَا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا '' (نساء ۷) مردوں کے لیے ایک حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑیں اور عورتوں کے لیے ایک حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑیں، جو اس میں سے کم ہو یا زیادہ، یہ مقررہ حصہ ہے۔

اس موضوع پر حضرت محمد مصطفی ﷺ کی حدیثیں بھی بہت زیادہ ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: 'حصے ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، پس جو باقی بچے تو سب سے قریبی مرد کے لیے''۔ (بخاری: الفرائض ۶۳۵۱، مسلم: الفرائض ۱۶۵، حاکم: کتاب الفرائض ۴/ ۳۳۳)

وراثت کی مشروعیت پر اجماع ہے، اس میں کسی بھی مسلمان کا اختلاف نہیں ہے۔

دین میں علم فرائض کا مقام ومرتبہ

اسلامی شریعت میں وراثت کے احکام کو نمایاں مقام حاصل ہے، کیوں کہ مال میں اسلامی نظام کا یہ بہت بڑا حصہ ہے، اور اس کے احکام میں اکثر مسائل کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے، یہاں تک کہ بعض علماء نے کہا ہے: علم فرائض علوم میں سب سے افضل ہے یعنی علمِ اصولِ دین کے بعد، یہ علمِ توحید اور اس سے متعلق اسلامی عقائد کی معرفت ہے۔

علم فرائض کی تعلیم وتعلم کی ترغیب

نبی کریم ﷺ نے علمِ میراث کو سیکھنے کی ترغیب دی ہے اور اس سے لاپرواہی برتنے اور اعراض کرنے سے چوکنا کیا ہے۔

امام حاکم (۴/۳۳۳ کتاب الفرائض، انھوں نے اس روایت کو صحیح کہا ہے) نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیوں کہ میں ایسا شخص ہوں جس کی روح قبض ہونے والی ہے اور یہ علم بھی اٹھایا جانے والا ہے، اور فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ دو لوگ حصے میں اختلاف کریں گے تو وہ اپنے درمیان فیصلہ کرنے والا کسی کو نہیں پائیں گے''۔

امام ابن ماجہ نے صحیح سند (کتاب الفرائض ۲۷۱۹) سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرائض کو سیکھو، کیوں کہ یہ تمھارے دین میں سے ہے اور یہ نصف علم ہے اور یہ سب سے پہلا علم ہے جس کو میری امت سے چھینا جائے گا''۔

کہا گیا ہے کہ یہ نصف علم اس اعتبار سے ہے کہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

ایک زندگی کی حالت اور دوسری موت کی حالت، چناں چہ زندگی کی حالت کا تعلق نماز اور زکوۃ وغیرہ سے ہے اور موت کی حالت کا تعلق وراثت کی تقسیم اور وصیتوں وغیرہ سے ہے۔

علمِ میراث پر صحابہ اور فقہاء کی توجہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود علمِ فرائض کو سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے پر مسلسل توجہ دی ہے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''فرائض کو سیکھو، کیوں کہ یہ تمھارے دین میں سے ہے''۔

صحابہ میں بعض افراد اس علم کے ماہر تھے اور دوسروں پر امتیاز اور فوقیت رکھتے تھے، مثلاً حضرت علی بن ابو طالب، حضرت عبداللہ بن عبادہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ نبی کریم ﷺ نے زید بن ثابت کے سلسلے میں اس علم میں تفوق اور امتیاز کی گواہی دی ہے، چناں چہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم میں علمِ فرائض کا سب سے بڑا ماہر زید بن ثابت ہے''۔ (ترمذی: المناقب ۳۷۹۴، ابن ماجہ: المقدمۃ باب فضائل أصحاب رسول اللہ ۱۵۴، مسند امام احمد: ۳/۲۸۱)

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''جو فرائض کے بارے میں دریافت کرنا

چاہے تو وہ زید بن ثابت کے پاس چلا جائے''۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے زید کے انتقال کے روز کہا:

''آج مدینہ کے عالم کا انتقال ہو گیا''۔

تابعین رحمۃ اللہ علیہم نے اس علم کو بڑا مقام دیا ہے اور اس کو سیکھنے اور سکھانے پر بڑی توجہ دینے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقشِ پا کی پیروی کی ہے، ان میں سات فقہاء بڑے مشہور رہیں: سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابوبکر بن حارث بن ہشام، سلیمان بن یسار، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود۔

ان کے بعد تبع تابعین اور بعد والے علمائے کرام اور فقہاء نے بھی اس علم پر ویسی ہی توجہ دی ہے، اللہ ان سبھوں پر رحم فرمائے اور اپنی وسیع جنتوں میں ان کو بلند مقام عطا فرمائے اور ہم کو ان کے نہج پر چلنے اور ان کی سیرت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نظامِ وراثت کو مشروع کرنے کی حکمت

میراث کو مشروع کرنے اور میت کی وراثت کو اس کے وارثین میں تقسیم کرنے کی بہت سے حکمتیں ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

أ۔ انسان کی فطرت کو راضی کرنا: کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اور اس میں بچوں کی محبت رکھی جس میں انسان اپنی زندگی کی زینت، اپنی عمر کا امتداد اور اپنے بقا کے مظہر کو دیکھتا ہے، اسی وجہ سے ہم انسان کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر تھکتا ہے، محنت کرتا ہے اور کوشش وجد وجہد کرتا ہے، اس جد وجہد اور سرگرمی سے زندگی خوش گوار ہوتی ہے، اور زندگی میں خیر پروان چڑھتا ہے، اگر دین وراثت کو حرام قرار دیتا تو انسانی زندگی میں کام کرنے کی رغبت وخواہش ختم ہو جاتی اور وہ تنگ دل ہو جاتا، اس کی زندگی تاریک ہو جاتی، اور وہ اپنی کوشش کو ضائع ہوتے اور ان لوگوں کے ہاتھوں میں جاتے ہوئے دیکھتا جس کو پسند نہیں کرتا ہے، اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت کے خلاف ہوتا اور انسان کی خوشی ختم ہو جاتی۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا '' (کہف ۴۶) مال اور بچے دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔

یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ'' (آل عمران ۱۴) لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں میں سے شہوتوں کی محبت رکھ دی گئی ہے۔

ب: خاندان کے دائرے میں معاشرتی کفالت کی تکمیل ہوتی ہے، کیوں کہ وراثت کی راہ سے لوگوں کے پاس مال آتا ہے اور اس میں بڑا مفاد اور مصلحت ہے۔

ج: انسان کی موت کے بعد صلہ رحمی؛ کیوں کہ میراث میں حصہ میت کے رشتے داروں؛ بھائی اور بہن وغیرہ کو ملتا ہے۔

علم فرائض کے مراجع

علم فرائض کے اصول وضوابط اور احکام چار مندرجہ ذیل مصادر سے اخذ کردہ ہیں:

قرآن کریم، حدیثِ نبوی، اجماع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادات۔

علم فرائض کا مقصد

علم فرائض کا مقصد یہ ہے کہ میراث میں ہر وارث کا حق معلوم کیا جائے۔

علم فرائض کا موضوع

علم فرائض کا موضوع وراثت (ترکہ) ہے۔

ترکہ کی تعریف

ترکہ وہ تمام چیزیں ہیں جن کو میت اپنی موت کے بعد چھوڑتا ہے یعنی منقولہ مال مثلاً سونا، چاندی، تمام قسم کی نقدی اور فرنیچر وغیرہ، یا غیر منقولہ مثلاً زمین، گھر وغیرہ، یہ تمام چیزیں ترکہ کے لفظ میں داخل ہیں اور اس کو مستحقین میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

میراث کے احکام پر عمل کرنا واجب ہے

وراثتی نظام قرآن، حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے، اس بارے میں اس کی

شان نماز، زکوۃ اور حدود کے احکام کی طرح ہے، جس کو منطبق کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، اور اس میں کوئی تبدیلی کرنا یا اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے، چاہے زمانہ کتنا بھی زیادہ گزرے، کیوں کہ یہ حکیم اور حمید کی طرف سے مشروع کردہ ہے، اس میں خصوصی اور عمومی مصلحتوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ''(نساء۱۳۔۱۴) یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے تو اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرتا ہے جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرتا ہے تو اللہ اس کو آگ میں ڈال دیتا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

اللہ عزوجل کا یہ بھی فرمان ہے: ''وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّکُوْنَ لَهُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ''(احزاب ۳۶) اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے ان کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔

میت کے ترکہ سے پانچ حقوق مندرجہ ذیل ترتیب سے متعلق ہوجاتے ہیں:

۱۔وفات سے پہلے ترکہ میں موجود چیزوں سے متعلق قرض مثلاً رہن، چناں چہ جو کوئی رہن رکھے اور اس کو حوالے کرے اور وہ دوسرا کوئی مال ترکہ میں نہ چھوڑے پھر اس کا انتقال ہوجائے تو اس قرض کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے گا، یہاں تک کہ میت کی تجہیز وتکفین پر بھی اس کو مقدم کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی چیز خریدے اور اس پر قبضہ نہ کرے اور اس کی قیمت بھی ادا نہ کرے پھر اس کا انتقال ہو جائے تو بائع اس کا میت کی تجہیز و تکفین سے زیادہ حق دار ہے، اسی طرح زکوۃ کا حق ہے یعنی وہ مال جس پر زکوۃ واجب ہو، کیوں کہ یہ مال زکوۃ کی وجہ سے رہن میں رکھا ہوا ہے، چناں چہ اس کو تجہیز و تکفین پر مقدم کیا جائے گا۔

۲۔ میت کی تجہیز و تکفین

باقی قرضوں، وصیت نافذ کرنے اور وارثین کو ان کا حق دینے پر میت کی تجہیز و تکفین کو مقدم کیا جائے گا، کیوں کہ یہ ضروری امور میں سے ہے، جو میت کے حق سے انسان ہونے کے اعتبار سے متعلق ہوتا ہے، اس کو عزت و شرافت حاصل ہے، تاکہ اس کو قبر میں دفن کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔

مطلوبہ تجہیز و تکفین ہر وہ چیز ہے جو میت پر اس کی وفات کے وقت سے تدفین عمل میں آنے تک شروع امور کے دائرے میں اسراف اور کنجوسی کے بغیر خرچ کیا جاتا ہے۔

میت کی تجہیز و تکفین میں ان لوگوں کی بھی تجہیز و تکفین شامل ہے جن کا نفقہ ان پر واجب ہے، مثلاً بیوی اور بچہ وغیرہ، اگر اس کی بیوی اس کے مرنے سے چند منٹ پہلے انتقال کر جائے یا اس کا چھوٹا بچہ اس سے چند لحات پہلے مر جائے تو ان دونوں کی تجہیز و تکفین اس کے مال سے کرنا ضروری ہے جس طرح ان دونوں کی زندگی میں اس پر ان کا نفقہ واجب تھا۔

اگر مرا ہوا شخص فقیر ہو، جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کی تجہیز و تکفین کی جا سکے تو اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ اس شخص پر ہوگا جس پر اس کی زندگی میں اس کا نفقہ واجب ہے، اگر یہ بھی مشکل ہو تو بیت المال اس کی تجہیز و تکفین کا ذمے دار ہے، اگر بیت المال نہ ہو یا اس کے پاس مال نہ ہو تو مالدار مسلمانوں پر اس کی تجہیز و تکفین واجب ہے۔

۳۔ میت کے ذمے موجود قرض: تجہیز و تکفین کے بعد اور وصیت نافذ کرنے اور وراثت تقسیم کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا، چاہے یہ اللہ تبارک وتعالی کا قرض ہو مثلاً زکوۃ، نذر، کفارہ، یا حقوق العباد ہو مثلاً قرض وغیرہ۔

البتہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی اللہ تعالی کے حقوق سے پہلے کی جائے گی۔

۴۔ بچے ہوئے مال میں سے ایک تہائی مال کی وصیت: یہ بالاتفاق قرض کے بعد اور وارثین میں وراثت تقسیم کرنے سے پہلے ہے۔

قرآن میں اس کو پہلے بیان کیا گیا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ" (نساء ۱۱) وصیت کے بعد جو تم کرتے ہو یا قرض کی ادائیگی کے بعد۔

یہاں قرض پر وصیت کو مقدم کرنے سے اس کے واجب ہونے پر دلالت نہیں ہے، بلکہ وصیت کو یہاں مقدم اس پر توجہ دینے اور وارثین کو اس کو نافذ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے کیا گیا ہے، کیوں کہ وارثین کی طرف سے اس میں تساہل برتنے کا اندیشہ رہتا ہے، کیوں کہ ان کو وصیت کے نفاذ میں اپنے حق کی مخالفت نظر آتی ہے۔

امام ترمذی (الوصایا ۲۱۲۳) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وصیت سے پہلے قرض کا فیصلہ کیا اور تم قرض سے پہلے وصیت کو پڑھتے ہو۔

۵۔ وراثت کی تقسیم: ترکہ سے متعلق یہ آخری حق ہے اور وارثین کے درمیان ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

وراثت کی شرطیں

وراثت کی چار شرطیں ہیں:

۱۔ مورّث (میت) کی موت کا یقین ہو جائے یا اندازاً اس کو مرے ہوئے لوگوں میں شمار کیا جائے مثلاً جنین اس کی ماں پر ایسے جرم کی وجہ سے ماں کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد مردہ باہر نکل آئے جس میں ایک غلام یا باندی واجب ہوتی ہے، چناں چہ اس بات کا اندازہ لگایا جائے گا کہ جنین جرم سے پہلے زندہ تھا اور اس بات کا اندازہ لگایا جائے گا کہ اس کو موت اس کی ماں کے خلاف جرم کرنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں اس کی طرف سے ایک غلام یا باندی بطور جرمانہ مجرم پر ضروری ہو جاتا ہے۔

یا مورّث کو حکماً مردوں میں شمار کیا جائے مثلاً قاضی اپنے اجتہاد سے مفقود الخبر کی

موت کا فیصلہ دے۔

۲۔مورّث کی موت کے بعد وارث کی زندگی کا یقین ہو جائے، چاہے ایک لحظہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔وارث کی میت سے رشتے داری قرابت، نکاح یا ولاء سے ثابت ہو۔

۴۔وراثت کی جہت تفصیل سے معلوم ہو، یہ قاضی کے ساتھ مخصوص ہے، چناں چہ وراثت کی شہادت (گواہی) کو مطلقاً قبول نہیں کیا جائے گا، مثلاً گواہ قاضی سے کہے: یہ وارث ہے۔تو کافی نہیں ہے بلکہ اس کی گواہی میں وارث بننے کی جہت کو بھی بیان کرنا ضروری ہے، گواہ کا صرف اتنا کہنا بھی کافی نہیں ہے: یہ اس کا چچا زاد بھائی ہے، بلکہ اس رشتے داری اور درجہ کو جاننا بھی ضروری ہے جس میں دونوں جمع ہوتے ہوں۔

وراثت کے ارکان

وراثت کے تین ارکان ہیں:

۱۔مورّث: وہ میت جس کے دوسرے وارث بنتے ہیں۔

۲۔وارث: وہ شخص جو وراثت کے اسباب میں سے کسی سبب کے پائے جانے کی وجہ سے میت کی طرف منسوب ہوتا ہے، ان اسباب کا تذکرہ اگلے صفحات میں آرہا ہے۔

۳۔موروث: وہ ترکہ جس کو میت اپنی موت کے وقت چھوڑتا ہے۔

وراثت کے اسباب

سبب کی تعریف:

لغت میں سبب کہتے ہیں اس چیز کو جس سے دوسرے تک پہنچا جائے۔

اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جس کی موجودگی سے کوئی دوسری چیز وجود میں آئے اور اس کی عدم موجودگی سے کوئی چیز معدوم ہو جائے۔

میراث کی تعریف

میراث اور رارث دونوں کے معنی ایک ہی ہے، لغت میں اس کے معنی بقا اور کسی چیز کا ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہونے کے ہیں۔

رارث کا استعمال موروث اور تراث کے معنی میں ہوتا ہے، لغت میں اس کے معنی اصل اور بقیہ کے ہیں، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلاً لَّمًّا'' (فجر ۱۹) اور تم وراثت کا مال ہپ ہپ کھاتے ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''**ابقوا على مشاعركم، فإنكم على إرث أبيكم إبراهيم**'' **يعني على أصله وبقية دينه.** (ابوداود: المناسک ۱۹۱۹، ترمذی: الحج ۸۸۳، نسائی: الحج ۵/۲۵۵، ابن ماجہ: المناسک ۳۰۱۱) تم اپنے مشاعر پر قائم رہو، کیوں کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی اصل پر ہو۔

وراثت کے اصطلاحی معنی: جسے بنانے کے قابل حق جو وراثت کے مستحق کے لیے اس شخص کی موت کے بعد ثابت ہوتا ہے جس کو یہ حق ان دونوں کے درمیان رشتے داری وغیرہ مثلاً زوجیت اور ولاء کی وجہ سے حاصل رہتا ہے۔

وراثت کے اسباب چار ہیں

۱۔ نسب: اس سے مراد رشتے داری ہے، اس کے ذریعے والدین اور ان کی اولاد وارث بنتی ہے مثلاً بھائی بہن، حقیقی یا علاتی بھائیوں کی اولاد۔

اولاد اور ان کی اولاد مثلاً بچے اور بچیاں اور ان کے بچے۔

۲۔ نکاح: یہ شادی کا عقد صحیح ہے، چاہے اس کے بعد جماع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یا خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اس کے ذریعے شوہر بیوی ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں۔

یہ دونوں طلاقِ رجعی کی عدت میں بھی ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں۔

البتہ نکاح فاسد کی صورت میں وراثت نہیں ہوتی ہے، چاہے اس کے بعد جماع یا خلوت ہوئی ہو، مثلاً ولی یا گواہوں کے بغیر نکاح ہو، یہی حکم نکاحِ متعہ کا بھی ہے۔

۳۔ولاء: لغت میں اس کے معنی قرابت کے ہیں اور یہاں مراد آزاد کرنے والا ہے، یہ عصبہ بنتا ہے جس کا سبب آزاد کرنے والے شخص کا آزاد کردہ غلام پر احسان ہے، آزاد کرنے والا مرد ہو یا عورت، آزاد کرنے والے کے (مرد) عصبہ بھی عصبہ بنتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''**الولاء لحمة كلحمة النسب**'' (مسند امام احمد ۱/۱۹۱،۱۹۴) ولاء نسب کی قرابت کی طرح قرابت ہے۔

البتہ آزاد کردہ غلام اپنے آزاد کرنے والے کا وارث نہیں بنتا ہے۔

۴۔اسلام: مندرجہ بالا اسباب میں سے کوئی سبب پایا جانے والا کوئی وارث نہ ہو تو مسلمان کے ترکہ کا وارث بیت المال ہوگا، اس کی دلیل امام ابوداود کی روایت ہے، انھوں نے صحیح سند سے (الخراج والإمارة ۲۹۵۶) مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اہل وعیال چھوڑے تو مجھ پر ہے اور جو کوئی مال چھوڑے تو اس کے وارثین کے لیے ہے اور میں اس شخص کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو، میں اس کی طرف سے دیت دیتا ہوں اور اس کا وارث بنتا ہوں''۔

یہ بات معلوم ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود کے لیے کسی چیز کے وارث نہیں بنتے ہیں، بلکہ آپ اس کو مسلمانوں کے مفادات میں خرچ کرتے ہیں، کیوں کہ وہ میت کی طرف سے عصبہ کی طرح دیت ادا کرتے ہیں، چناں چہ امام اس میت کا ترکہ بیت المال میں جمع کرتا ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو یا وہ جس کو چاہے دیتا ہے، اسی بنیاد پر بیت المال ردّ ذوی الفرائض اور ذوی الارحام پر مقدم ہے، ردّ کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

بیت المال کے تعلق سے متاخرین کا موقف

متاخر شافعیہ نے بیت المال کے وارث نہ ہونے کا فتوی دیا ہے، کیوں کہ بیت المال کے وارث بننے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ منظم ہو، منظم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ترکہ اس کے شرعی مصارف میں خرچ کیا جائے۔

اب بیت المال منظم نہیں ہے، بلکہ اس کے منظم ہونے سے حضرت عیسی علیہ السلام

کے نزول تک نا امیدی ہے۔

اسی وجہ سے متاخر شوافع نے شوہر بیوی کے علاوہ حصے داروں پر ردّ کرنے کا فتوی دیا ہے، اگر اصحابِ فروض میں سے ایسے افراد موجود نہ ہوں جن پر ردّ ہوتا ہو تو ذوی الارحام وارث ہوں گے، اسی بنیاد پر علمِ فرائض کے بہت سے علماء نے وراثت کے اسباب میں بیت المال کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔

موانعِ ارث

مانع کی تعریف:

لغت میں مانع رکاوٹ کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کے پائے جانے سے عدم لازم آتا ہے اور اس کی عدم موجودگی سے موجودگی لازم نہیں آتی ہے، اس کی مثال غلامی ہے، اس کی موجودگی سے آدمی وارث نہیں ہوتا ہے اور اس کی عدم موجودگی سے وراثت کا وجود اور عدم وجود لازم نہیں آتا ہے۔

موانعِ ارث تین ہیں:

۱۔ ہر قسم کی غلامی:

یہ دونوں طرف سے رکاوٹ ہے، چناں چہ غلام وارث نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اگر وہ وارث ہوگا تو وراثت میں ملا ہوا مال اس کے مالک اور آقا کا ہوگا، حالاں کہ وہ متوفی شخص کے لیے بالکل اجنبی ہے۔

اس کا بھی کوئی وارث نہیں بنتا، کیوں کہ اس کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ اور اس کا مال اس کے مالک کا ہوتا ہے۔

البتہ مبعض؛ جس کا بعض حصہ آزاد ہوتا ہے اور بعض حصہ غلام، اس کے بعض آزاد حصے کے مطابق ملکیت کی وراثت اس کے وارثین میں تقسیم کی جائے گی۔

۲۔ قتل: قاتل مقتول کا وارث نہیں بنتا ہے چاہے اس کو عمداً قتل کرے یا غلطی سے، کسی حق کی بنیاد پر یا کسی حق کے بغیر، یا اس کو قتل کرنے کا فیصلہ دے یا اس کے خلاف ایسی گواہی

دے جس سے قتل واجب ہوتا ہو یا اس کے خلاف گواہی دینے والے کے عادل ہونے کی گواہی دے، کیوں کہ قتل رشتے داری کو توڑتا ہے اور رشتے داری ہی وراثت کا سبب ہے۔

ابوداود (الدیات ۴۵۶۴) نے عمرو بن شعیب سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے عمرو کے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قاتل کے لیے کچھ بھی نہیں ہے''۔ یعنی میراث میں سے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے: ''قاتل وارث نہیں بنتا ہے''۔

لیکن مقتول اپنے قاتل کا وارث بنتا ہے، مثلاً بیٹا اپنے والد کو اتنا زخمی کردے کہ وہ موت کے قریب پہنچ جائے، پھر زخمی کرنے والا بیٹا اپنے زخمی باپ سے پہلے مر جائے تو باپ اپنے قاتل بیٹے کا وارث بنے گا، کیوں کہ اس کے وارث بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

۳۔ اختلافِ دین یعنی ایک کافر اور دوسرا مسلمان ہو، اسی وجہ سے کافر مسلمان کا وارث نہیں بنتا ہے اور مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا ہے، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان ''موالات'' کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ یعنی کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں رہتی ہے۔

امام بخاری (الفرائض: ۶۳۸۳) اور امام مسلم (کتاب الفرائض: ۲۶۱۴) نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث بنتا ہے''۔

اسلام سے مرتد ہونے والا بھی کافر ہے، وہ بھی کسی مسلمان کا وارث نہیں بنتا اور کوئی مسلمان اس کا وارث نہیں بنتا، بلکہ مرتد کا مال بیت المال کے لیے مال فئی ہے، چاہے اس نے یہ مال اسلام میں کمایا ہو یا مرتد ہونے کے بعد کفر کی حالت میں۔

البتہ کافر اپنی ملتوں کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں، چناں چہ نصرانی یہودی کا، یہودی مجوسی کا اور مجوسی بت پرست کا وارث بنتا ہے، اسی طرح یہودی نصرانی کا، مجوسی یہودی کا، بت پرست مجوسی کا بھی وارث بنتا ہے، کیوں کہ وراثت میں کفر ایک ہی ملت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنّٰی

تُصْرَفُوْنَ" (یونس ۳۲) پس حق کے بعد صرف گمراہی ہی ہے، پھر تم کہاں بھٹکے پھر رہے ہو۔

لیکن فقہاء نے کافروں کا ایک دوسرے سے وارث بننے سے ذمی اور حربی کے درمیان کی وراثت کو مستثنی کیا ہے، انھوں نے کہا ہے: یہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے ہیں، چاہے ان دونوں کا تعلق ایک ہی ملت سے کیوں نہ ہو، مثلاً دونوں یہودی ہوں، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان موالات منقطع ہو جاتا ہے۔

مرد وارثین

مذکورہ بالا تین اسباب؛ نسب، نکاح اور ولاء کی وجہ سے وارث بننے والے مرد دس ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیٹا

۲۔ پوتا اور نیچے تک

۳۔ باپ

۴۔ دادا، اوپر تک

۵۔ بھائی چاہے میت کا حقیقی بھائی (جن کے باپ اور ماں ایک ہوں) ہو یا علاتی بھائی (جن کا باپ ایک ہو، ماں الگ الگ ہوں) یا اخیافی بھائی (جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں)

کیوں کہ قرآن کریم میں مطلقاً بھائی کا تذکرہ آیا ہے، اگر چہ بھائیوں کے اعتبار سے حصے مختلف بنتے ہیں۔

۶۔ حقیقی بھتیجہ اور علاتی بھتیجہ، البتہ اخیافی بھتیجہ ذوی الارحام میں سے ہے، وہ حصے کی بنیاد پر وارث نہیں بنتا ہے۔

۷۔ حقیقی چچا اور علاتی چچا، البتہ اخیافی چچا ذوی الارحام میں سے ہے۔

۸۔ حقیقی چچا زاد بھائی اور علاتی چچا زاد بھائی، البتہ اخیافی چچا زاد بھائی حصے کی بنیاد پر وارث نہیں بنتا ہے، بلکہ وہ ذوی الارحام میں سے ہے۔

۹۔شوہر

۱۰۔آزاد کرنے والا مرد اور اس کے عصبہ بنفسہ

اگر ان کو تفصیل سے شمار کیا جائے تو ان کی تعداد پندرہ ہو جاتی ہے۔

کیوں کہ پانچویں قسم میں تین افراد ہیں اور چھٹی، ساتویں اور آٹھویں قسم میں دو دو ہیں۔

وارث عورتیں

مذکورہ بالا اسباب؛ نسب، نکاح اور ولاء کی بنیاد پر وارث بننے والی عورتیں اختصار کے ساتھ سات ہیں اور تفصیل کے ساتھ دس، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔بیٹی

۲۔پوتی، نیچے تک

۳۔ماں

۴۔دادی و نانی، اوپر تک

۵۔بہن؛ حقیقی، علاتی اور اخیافی

۶۔بیوی یا بیویاں

۷۔آزاد کرنے والی عورت

جب مذکورہ بالا سب مرد موجود ہوں تو وارث بننے والے مردوں کی ترتیب:

جب کسی شخص کے انتقال کے وقت مذکورہ بالا سبھی مرد موجود ہوں تو ان میں سے صرف تین وارث ہوں گے، کیوں کہ وہ کسی بھی حال میں محجوب (وراثت سے محروم) نہیں ہوتے ہیں، باقی سب لوگ بالاجماع وارث نہیں بنتے ہیں، کیوں کہ وہ محجوب بن جاتے ہیں۔

یہ تین مرد باپ، بیٹا اور شوہر ہیں۔

اگر وارث ہونے والی سبھی عورتیں موجود ہوں

اگر مذکورہ بالا سبھی عورتیں موجود ہوں تو ان میں سے صرف پانچ عورتیں وارث بنتی

ہیں: بیٹی، پوتی، ماں، حقیقی بہن اور بیوی۔

وارث مرد اور عورتیں جمع ہوں

اگر وارث مرد اور عورتیں کسی کے انتقال کے وقت موجود ہوں تو ان میں سے پانچ وارث بنتے ہیں اور باقی محجوب ہو جاتے ہیں: بیٹا، بیٹی، باپ، ماں اور شوہر یا بیوی۔

نوٹ:

فقہاء نے لکھا ہے: اگر مذکورہ بالا مردوں میں سے صرف ایک مرد ہو تو وہ پورے مال کا وارث ہو جاتا ہے سوائے شوہر اور اخیافی بھائی کے یہ دونوں پورے مال کے وارث نہیں بنتے ہیں۔

عورتوں میں سے صرف کوئی ایک عورت ہو تو پورے مال کی وارث نہیں بنتی ہے، سوائے آزاد کرنے والی عورت کے، وہ پورے مال کی وارث بنتی ہے۔

وراثت کی قسمیں

وراثت کی دو قسمیں ہیں: فرض یعنی حصے کی بنیاد پر وراثت اور عصبہ کی بنیاد پر وراثت

فرض کے لغوی اور اصطلاحی معنی

لغت میں لفظِ فرض کے بہت سے معانی ہیں؛ کاٹنا، مقرر کرنا وغیرہ اور اصطلاح میں فرض اس حصے کو کہتے ہیں جو وارث کے لیے شریعت میں مقرر کیا گیا ہے جس میں صرف ردّ کی بنیاد پر اضافہ ہوتا ہے اور عول کی بنیاد پر کمی ہوتی ہے۔

اللہ عزوجل کی کتاب قرآن مجید میں مقررہ حصے

قرآن کریم میں مقررہ حصے چھ ہیں:

آدھا (۱/۲)، پاؤ (۱/۴)، آٹھواں حصہ (۱/۸)، دو تہائی (۲/۳)، ایک تہائی (۱/۳)، چھٹا حصہ (۱/۶)

علماء کے اجتہاد سے مقررہ حصے

علماء نے اپنے اجتہاد سے قرآن کریم میں مذکورہ چھ حصوں میں ایک اور حصے کا اضافہ کیا ہے، وہ ہے ثلث ماقی یعنی بعض وارثین میں وراثت تقسیم کرنے کے بعد بچے ہوئے مال میں سے ایک تہائی حصہ، یہ اس وقت ہوتا ہے جب دادا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوتا ہے اور صرف ماں باپ کے ساتھ میاں بیوی میں سے کوئی ایک وارث ہوتا ہے، اس کی تفصیلات اگلے صفحات میں آ رہی ہیں۔

عصبہ کے معنی

عصبہ کے لغوی معنی آدمی کی اپنے باپ کی طرف سے رشتے داری؛ اس کو عصبہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ باپ کی وجہ سے ہی عصبہ بنتا ہے۔

عصبہ کے اصطلاحی معنی؛ ہر وہ شخص جو تنہا ہونے کی صورت میں پورا مال لیتا ہے یا تنہا نہ ہو تو باقی حصے داروں میں وراثت تقسیم ہونے کے بعد بچا ہوا مال لیتا ہے، اگر حصے داروں کو دے کر کچھ نہ بچے تو اس کو کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

وراثت میں حصے داروں کو مقدم کرنے کے مسائل واحکام

وراثت میں عصبہ بننے والے اور حصے دار بننے والے دونوں قسم کے افراد موجود ہوں تو وراثت میں عصبہ بننے والوں پر حصے داروں کو مقدم کیا جائے گا، اس کی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ”مقررہ حصوں کو ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، پس جو بچے تو سب سے قریبی مرد کے لیے ہے“۔ (بخاری: کتاب الفرائض ۶۳۵، مسلم: الفرائض ۱۶۱۵) بخاری و مسلم دونوں نے یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کی ہے۔

نصف کے حصے دار بننے والے اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

وارثین میں سے پانچ لوگ آدھی میراث کے حق دار بنتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے لیے نصف حصے کا وارث بننے کے لیے چند شرطیں ہیں، نصف میراث کے وارث بننے والے مندرجہ ذیل افراد ہیں:

۱۔شوہر

شوہر کے لیے نصف وراثت کا وارث بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے، وہ یہ کہ بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ پوتے پوتیاں ہوں، چاہے یہ بچہ اسی شوہر کا ہو یا دوسرے شوہر کا، یہاں تک کہ زنا کی وجہ سے ہونے والا بچہ بھی نہ ہو، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ’’وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ‘‘ (نساء۱۲) اور تمھارے لیے آدھا ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو۔

بچے کی اولاد بچوں کی طرح ہی ہیں، اس پر علماے اسلام کا اجماع ہے، اور ’’ولد‘‘ کا لفظ عربی زبان میں بیٹے اور بیٹے کی اولاد کو شامل ہے۔

۲۔بیٹی

بیٹی کا نصف میراث کی حصے دار بننے کے لیے دو شرطیں ہیں:

۱۔وہ تنہا ہو، کوئی دوسری بیٹی نہ ہو۔

۲۔اس کے ساتھ اس کو عصبہ بنانے والا بھائی موجود نہ ہو۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ’’وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ‘‘ (نساء ۱۱) اگر وہ تنہا ہے تو اس کے لیے آدھا ہے۔

۳۔پوتی

پوتی کا آدھے حصے کی وارث بننے کے لیے تین شرطیں ہیں:

۱۔وہ تنہا ہو، کوئی دوسری پوتی نہ ہو۔

۲۔اس کو عصبہ بنانے والا اس کا کوئی بھائی نہ ہو۔

۳۔اس کے ساتھ میت کا کوئی بیٹا یا بیٹی نہ ہو۔

مندرجہ بالا تین شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں پوتی کا نصف حصے کی وارث ہونے کی دلیل اجماع ہے، فقہاء نے کہا ہے: بیٹے کی اولاد چاہے نرینہ ہو یا زنانہ؛

وراثت میں اولاد کی قائم مقام ہوتی ہیں۔

۴۔حقیقی بہن

اس کے آدھی وراثت کی حق دار بننے کے لیے چار شرطیں ہیں:

ا۔میت کا کوئی بیٹا یا بیٹی، پوتا یا پوتی نہ ہو۔

۲۔وارث کا کوئی اصل مثلاً باپ اور دادا نہ ہو۔

۳۔وہ تنہا ہو، کوئی دوسری بہن نہ ہو۔

۴۔اس کو عصبہ بنانے والا اس کا کوئی بھائی نہ ہو۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا النِّصْفُ مَا تَرَكَ" (نساء ۱۷۶) اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال میں سے نصف ہے۔

۵۔علاتی بہن

نصف وراث کی حق دار بننے کے لیے پانچ شرطیں ہیں؛ چار شرطیں حقیقی بہن میں مذکورہ شرطیں ہی ہیں اور پانچویں شرط یہ ہے کہ میت کا کوئی حقیقی بھائی یا حقیقی بہن نہ ہو، اس کی دلیل سابقہ آیت ہے، کیوں کہ آیت میں بہن سے مراد حقیقی بہن اور علاتی بہن ہے، اس استدلال کی دلیل اجماع امت ہے۔

ایک چوتھائی کے حق دار اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

ا۔شوہر:

بیوی کی میراث میں شوہر کے ایک چوتھائی کے وارث بننے کے لیے شرط یہ ہے کہ بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو یا بیوی کے بیٹے کی اولاد نہ ہو، چاہے یہ بچے اسی شوہر سے ہوں یا کسی دوسرے شوہر سے، بچی ہو یا بچہ۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ'' (نساء ۱۲) پس اگر ان کو بچہ ہو تو تمھارے لیے ان کی چھوڑی ہوئی وراثت میں سے ایک چوتھائی ہے۔

ہم نے پہلے یہ بات بتادی ہے کہ وراثت میں، محجوب بنانے میں اور عصبہ ہونے اور بنانے میں بیٹے کی اولاد بھی خود اس کی اولاد کی طرح ہی ہوتی ہیں۔

۲۔ بیوی یا بیویاں

بیوی ایک ہو یا زیادہ، وہ ایک چوتھائی کی وارث بنتی ہے، اگر شوہر کی کوئی اولاد یا بیٹے کی اولاد نہ ہو، چاہے وہ اسی بیوی سے ہوں یا کسی دوسری بیوی سے۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ'' (نساء ۱۲) اور ان (عورتوں) کے لیے تمھاری چھوڑی ہوئی میراث میں ایک چوتھائی ہے اگر تمھاری کوئی اولاد نہ ہو۔

آٹھویں حصے کے حق دار اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

میت کی وراثت میں آٹھویں حصے کی وارث صرف بیوی یا بیویاں بنتی ہیں، جب میت کی اولاد ہو یا میت کے بیٹے کی اولاد ہو، چاہے یہ مرد ہوں یا عورت، اس پر علماء کا اجماع ہے، اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے: ''فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم'' (نساء ۱۲) پس اگر تمھاری اولاد ہو تو ان کے لیے تمھاری چھوڑی ہوئی میراث میں آٹھواں حصہ ہے۔

دو تہائی کے حق دار اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

چار لوگ دو تہائی کے وارث بنتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے چند شرطیں ہیں، یہ چار لوگ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ میت کی دو یا دو سے زائد بیٹیاں

دو تہائی کے وارث بننے کے لیے ان کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ ان کو عصبہ

بنانے والا کوئی مرد نہ ہو اور وہ ہے میت کا بیٹا، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے:
"فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ" (نساء ۱۱) پس اگر وہ دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لیے میراث میں دو تہائی حصہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کی دو بیٹیوں کے حق میں ان کے والد کی میراث کے دو تہائی حصے کا فیصلہ کیا۔ (ترمذی: الفرائض ۲۰۹۳، حاکم: الفرائض ۴/۳۳۴)

۲۔ میت کے بیٹے کی دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں

ان کے دو تہائی حصے کی وارث بننے کے لیے دو شرطیں ہیں:

۱۔ ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہ ہو۔

۲۔ میت کی کوئی اولاد نہ ہو، نہ بیٹے ہوں اور نہ بیٹیاں۔

ان کو بیٹیوں پر قیاس کیا گیا ہے یا ان کو لفظ "ولد" میں اس اعتبار سے شامل کیا گیا ہے کہ اس لفظ کا استعمال حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں ہوتا ہے۔

۳۔ دو یا دو سے زیادہ حقیقی بہنیں

ان کے دو تہائی حصہ کی وارث بننے کی تین شرطیں ہیں:

۱۔ ان کو عصبہ بنانے والا کوئی مرد نہ ہو، مثلاً بھائی۔

۲۔ میت کا وارث بننے والا کوئی فرع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی) نہ ہو۔

۳۔ میت کا کوئی اصل نہ ہو مثلاً باپ یا دادا۔

ان کے دو تہائی حصے کے وارث بننے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ" (نساء ۱۷۶) پس اگر وہ دو ہوں تو ان کے میت کی میراث میں دو تہائی ہے۔

۴۔ دو یا دو سے زیادہ علاتی بہنیں

یہ دو تہائی حصے کی وارث چار شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں بنتی ہیں، تین

شرطیں وہی ہیں جن کا تذکرہ حقیقی بہنوں کی شرطوں میں ہوا ہے اور چوتھی شرط یہ ہے کہ میت کا حقیقی بھائی یا بہن نہ ہو۔

اس کی دلیل اجماع ہے، مذکورہ آیت کے بارے میں اجماع ہے کہ یہ آیت حقیقی بہنوں اور علاتی بہنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، البتہ اخیافی بہنیں اس میں داخل نہیں ہیں۔

امام ترمذی (الفرائض ۲۰۹۸) نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں بیمار ہوگیا تو آپ ﷺ میری عیادت کے لیے آئے، آپ نے مجھے بیہوش پایا، آپ کے ساتھ ابوبکر اور عمر بھی تھے، وہ دونوں پیدل تھے، رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر انڈیلا جس کی وجہ سے مجھے ہوش آیا، میں نے کہا: اللہ کے رسول! میں اپنے مال میں کیسے فیصلہ کروں؟ یا یہ دریافت کیا: میں اپنے مال کے ساتھ کیا کروں؟ آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی نو بہنیں تھیں، یہاں تک کہ یہ آیتِ میراث نازل ہوئی: ''يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ''۔ وہ آپ سے فتوی دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: اللہ تم کو کلالہ کے سلسلے میں فتوی دیتا ہے۔

مکمل آیت یہ ہے: ''وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ، فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' (نساء ۱۷۶) اور وہ (مرد) اس (عورت) کا وارث ہوتا ہے اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو، اگر وہ دو عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی چھوڑی ہوئی میراث میں سے دو تہائی ہے، اگر وہ بھائی اور بہنیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے بقدر دیا جائے گا، اللہ تم کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک تہائی کے حق دار اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

دو قسم کے لوگ ایک تہائی کے وارث بنتے ہیں:

۱۔ماں

دوشرطوں کے پائے جانے سے ماں ایک تہائی مال کی وارث بنتی ہے:

۱۔میت کا کوئی فرع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی) نہ ہو۔

۲۔میت کے دویا دو سے زیادہ بھائی یا بہن نہ ہوں، چاہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی

اس کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: ''فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ'' (نساء ۱۱) پس اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو اس کی ماں کے لیے ایک تہائی ہے۔

۲۔ایک سے زیادہ اخیافی بھائی اور بہنیں

اگر ایک سے زیادہ اخیافی بھائی اور بہنیں ہوں تو وہ ایک تہائی کے وارث ہوتے ہیں، چاہے صرف بھائی ہوں یا صرف بہنیں یا دونوں، اس صورت میں ایک تہائی میراث ان میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

ان کے وارث بننے کے لیے دوشرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔میت کا کوئی فرع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی) نہ ہو۔

۲۔میت کا باپ یا دادا نہ ہو۔

ان کے وارث بننے کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ ارشاد ہے: ''وَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ'' (نساء ۱۲) اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہیں۔

وہ ایک تہائی میں شریک ہیں کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک تہائی کو برابر تقسیم کیا جائے گا۔

دادا اپنی بعض حالتوں میں بھائیوں کے ساتھ ایک تہائی کا وارث بنتا ہے، جس کی تفصیلات دادا اور بھائیوں کی حالتوں میں آرہی ہیں۔

چھٹے حصے کے وارث اور ان کے وارث بننے کی شرطیں

سات قسم کے وارثین چھٹے حصے کے وارث بنتے ہیں اور ان کے وارث بننے کے لیے الگ الگ شرطیں ہیں۔

ا۔ باپ

باپ چھٹے حصے کا وارث صرف اس شرط کے ساتھ بنتا ہے کہ میت کا کوئی فرع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی) ہو۔

لیکن باپ میت کی بیٹی اور پوتی کی موجودگی میں حصے کی بنیاد پر چھٹا حصہ لیتا ہے، جب حصے داروں کو دینے کے بعد کچھ بچے تو یہ بقیہ مال عصبہ بن کر بھی لیتا ہے، انشاءاللہ اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

۲۔ ماں

ماں چھٹے حصے کی حق دار دو شرطوں سے بنتی ہے:

ا۔ میت کا کوئی فرع ہو جیسا کہ ہم نے باپ کے تذکرے میں بتا دیا ہے۔

۲۔ ایک سے زائد بھائی اور بہن ہوں، چاہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی۔

اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ" (نساء ۱۱) اور اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد ہو۔

دوسری شرط کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں ہے: "فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ" (نساء ۱۱) پس اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

۳۔ دادا

مندرجہ ذیل شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں دادا چھٹے حصے کا وارث بنتا ہے:

ا۔ میت کا کوئی وارث فرع (بیٹا بیٹی، پوتا پوتی) موجود نہ ہو۔

۲۔میت کا باپ نہ ہو، کیوں کہ باپ کی موجودگی میں دادا محجوب بن جاتا ہے، کیوں کہ باپ دادا کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے۔

دادا کے وارث بننے کی دلیل اجماع ہے اور وہ آیت کریمہ جس میں باپ کا چھٹے حصے کا وارث بننے کا تذکرہ آیا ہے، کیوں کہ دادا کو بھی باپ کہا جاتا ہے۔

۴۔وارث ہونے والی دادی ونانی یا دادیاں ونانیاں

دادی اور نانی صرف ایک شرط سے چھٹے حصے کی وارث بنتی ہیں، وہ شرط یہ ہے کہ میت کی ماں موجود نہ ہو۔

اگر وارث بننے والی دادیاں اور نانیاں موجود ہوں تو وہ بھی وارث بنتی ہیں، اگر کوئی شخص انتقال کر جائے، اس کی دادی اور نانی دونوں موجود ہوں تو دونوں وارث ہوں گی اور چھٹا حصہ ان دونوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

اگر میت کا باپ موجود ہو تو اس کی دادی محجوب ہو جائے گی، کیوں کہ میراث کے اس اصول پر عمل کرنے سے وہ محجوب بن جاتی ہے: ''جو میت تک کسی واسطے سے پہنچتا ہو تو وہ واسطہ اس کو محجوب کر دیتا ہے''۔

دادی اور نانی وارث بننے کی دلیل امام حاکم کی روایت ہے، انھوں نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دادی اور نانی کے لیے وراثت میں چھٹے حصے کا فیصلہ سنایا۔ (مستدرک حاکم: الفرائض ۴/۳۴۰، یہ روایت بخاری اور مسلم کی شرطوں پر ہے)

امام ترمذی (الفرائض ۲۱۰۲) وغیرہ نے قبیصہ بن ذویب سے روایت کیا ہے کہ ایک جدّہ (دادی یا نانی) حضرت ابوبکر کے پاس اپنی وراثت طلب کرنے کے لیے آئی۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے اس سے کہا: تمھارے لیے اللہ کی کتاب میں کچھ بھی نہیں ہے اور تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بھی کچھ نہیں ہے، تم واپس لوٹ جاؤ، یہاں تک کہ میں لوگوں سے دریافت کروں۔ یہ سن کر مغیرہ بن شعبہ نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر تھا تو آپ نے اس (دادی/نانی) کو چھٹا حصہ دیا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا:

کیا تمھارے ساتھ کوئی دوسرا ہے۔ محمد بن مسلمہ انصاری کھڑے ہوگئے اور انھوں نے وہی بات کہی جو مغیرہ بن شعبہ نے کہی تھی۔ چناں چہ حضرت ابوبکر نے اُس کو چھٹا حصہ دیا۔ راوی کہتے ہیں: پھر ایک جدّۃ (دادی یا نانی) عمر بن خطاب کے پاس اپنی وراثت طلب کرنے کے لیے آئی تو انھوں نے کہا: اللہ کی کتاب میں تمھارے لیے کچھ نہیں ہے، لیکن یہ چھٹا حصہ ہے، اگر تم دونوں اس میں جمع ہو جاتی ہو تو یہ تم دونوں (دادی اور نانی) کے لیے ہے اور تم میں سے جو بھی تنہا ہے تو وہ اس کے لیے ہے۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دادی/نانی کے لیے چھٹا حصہ ہے، چاہے وہ تنہا ہو یا ایک سے زائد۔

۵۔ ایک یا ایک سے زائد پوتیاں

جب تین شرطیں پائی جاتی ہیں تو ایک یا ایک سے زائد پوتیاں چھٹے حصے کی حق دار بنتی ہیں، یہ تین شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ایک یا زائد پوتیاں میت کی ایک بیٹی کے ساتھ ہوں۔

۲۔ پوتی یا پوتیوں کے ساتھ ان کو عصبہ بنانے والا پوتا نہ ہو، جب یہ شرطیں پائی جائیں تو پوتی یا پوتیاں دو تہائی مکمل کرنے کے لیے چھٹے حصے کی وارث بنتی ہیں۔

۳۔ میت کا کوئی بیٹا نہ ہو۔

اس کی دلیل امام بخاری (کتاب الفرائض ۶۳۵۵) کی روایت ہے کہ ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے بیٹی، پوتی اور بہن کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا: بیٹی کے لیے نصف ہے اور بہن کے لیے نصف ہے، ابن مسعود کے پاس جاؤ، وہ بھی میری تائید کریں گے۔ ابن مسعود سے دریافت کیا گیا اور ان کو ابوموسی کی بات بتائی گئی تو انھوں نے کہا: تب تو میں گمراہ ہوگیا ہوں اور میں ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں، میں اس بارے میں وہی فیصلہ کروں گا جو فیصلہ نبی کریم ﷺ نے کیا ہے: بیٹی کے لیے نصف، پوتی کے لیے ایک تہائی، دو تہائی مکمل کرنے کے لیے اور باقی بچا ہوا بہن کے لیے ہے۔ ہم ابو

موسیٰ کے پاس واپس آئے اور ہم نے ابن مسعود کی بات ان کو بتائی تو انھوں نے کہا: جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے تم مجھ سے مت پوچھو۔

۶۔ایک سے زائد علاتی بہنیں

مندرجہ ذیل شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں ایک یا زائد علاتی بہنیں چھٹے حصے کی وارث بنتی ہیں:

۱۔میت کا وارث فرع نہ ہو، مثلاً بیٹا، بیٹی، پوتا اور پوتی۔

۲۔میت کا وارث اصل نہ ہو، مثلاً باپ اور دادا۔

۳۔میت کا حقیقی بھائی نہ ہو۔

۴۔میت کی ایک ہی حقیقی بہن ہو۔

۵۔اس کے ساتھ اس کو عصبہ بنانے والا علاتی بھائی نہ ہو۔

جب یہ شرطیں پائی جائیں تو علاتی بہن یا بہنیں چھٹے حصے کی وارث بنتی ہیں، اس حکم کی دلیل اجماع ہے اور اس کو ایک بیٹی کے ساتھ پوتیوں پر قیاس کیا گیا ہے۔

۷۔اخیافی بھائی یا بہن

اخیافی بھائی یا بہن مندرجہ ذیل دو شرطوں سے چھٹے حصے کے وارث بنتے ہیں:

۱۔اخیافی بہن یا بھائی کو محجوب کرنے والا میت کا کوئی اصل یا فرع نہ ہو۔

۲۔اخیافی بھائی یا بہن تنہا ہو، اگر ایک سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی کے وارث بنتے ہیں جیسا کہ اس بارے میں گزر چکا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس بارے میں فرماتا ہے: ''وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ'' (نساء۱۲) اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ بٹتا ہو جس کا ماں باپ اولاد کچھ نہ چھوڑے اور ماں کی طرف سے اس کا بھائی یا بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ہے

ثلث باقی کے حق دار

دو طرح کے وارث ثلث باقی کے حق دار بنتے ہیں:

ا۔ دادا

بعض حالتوں میں دادا ثلث باقی کا حصے دار بنتا ہے، جب اس کے ساتھ میت کے حقیقی یا علاتی بھائی یا بہن موجود ہوں۔

اس موضوع کی تفصیلات اگلے صفحات میں آ رہی ہیں۔

۲۔ ماں

ماں ثلث باقی کی حصے دار دو مسئلوں میں بنتی ہے جن کو عمریتان (عمری مسئلے) کہا جاتا ہے، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دو مسئلوں میں ماں کو ثلث باقی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔
ان مسئلوں کو "غرّاوتین" بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہ مسئلے روشن ستاروں کی طرح مشہور رہیں۔

یہ دو مسئلے مندرجہ ذیل ہیں:

میت کے وارثین میں شوہر، ماں اور باپ ہوں۔

یا بیوی، ماں اور باپ ہوں۔

پہلے مسئلے میں شوہر کو میراث کا نصف ملے گا اور ماں بچی ہوئی میراث میں سے ایک تہائی لے گی اور باپ کو بچی ہوئی میراث ملے گی۔
اگر میراث چھ ہزار روپے ہوں تو شوہر کو تین ہزار روپے ملیں گے اور ماں کو ایک ہزار اور باپ کو دو ہزار۔
دوسرے مسئلے میں بیوی کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا اور ماں کو بچے ہوئے تین حصوں میں ایک تہائی یعنی ایک حصہ ملے گا اور بقیہ باپ کو ملے گا۔
اگر میراث بارہ ہزار روپے ہوں تو بیوی کو تین ہزار روپے ملیں گے اور ماں کو بھی تین

ہزار روپے، بچے ہوئے نو ہزار روپے میں سے ایک تہائی، ماں کو دینے کے بعد بچے ہوئے سبھی روپے باپ کو ملیں گے جو چھ ہزار ہیں۔

دونوں مسئلوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پہلے مسئلہ میں ماں کو چھٹا حصہ ملا اور دوسرے مسئلے میں ایک چوتھائی، فقہاء نے اللہ عزوجل کے اس فرمان کی تعبیر ثلث ماقی سے کی ہے: ''فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ '' (نساء ۱۱) پس اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو اس کی ماں کے لیے ایک تہائی ہے۔

ان دو مسئلوں میں ماں کو ثلث ماقی دینے کی حکمت یہ ہے کہ اگر ماں کو مکمل میراث میں ایک تہائی دیا جائے گا تو پہلے مسئلہ میں باپ پر اس کو فضیلت دینا ہو جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں اس کو چھ حصوں میں سے دو حصے ملیں گے جو ایک تہائی ہوتا ہے، اور باپ کو صرف ایک حصہ ملے گا جو میراث میں بچا ہوا مال ہے، جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں باپ کو ماں سے کچھ حصہ زیادہ ملتا ہے، اس میں ماں کو ایک چوتھائی حصہ ملتا ہے جو میراث کا ایک تہائی ہے اور باپ کو پانچ حصے ملتے ہیں جو میراث میں بچا ہوا مال ہے۔

شریعت میں یہ اصول معروف ہے کہ جب مرد اور عورت ایک ہی درجے کے ہوں تو عورت کو میراث میں عام طور پر مرد کا آدھا حصہ ملتا ہے، مثلاً بیٹا اور بیٹی، بہن اور بھائی وغیرہ، اس اصول کو اپناتے ہوئے ماں کو ثلث ماقی دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور جمہور صحابہ نے اس کی موافقت کی ہے۔

عصبہ کی بنیاد پر وراثت

ہم نے عصبہ کی تعریف کے وقت یہ بات بتادی ہے کہ عصبہ مرد رشتے دار ہیں، ان کو عصبہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ ان سے طاقت حاصل کرتا ہے۔

ہم نے عصبہ کی اصطلاحی تعریف بھی بیان کی ہے کہ عصبہ وہ شخص ہے جو تنہا ہونے کی صورت میں پورے مال کا مستحق بنتا ہے اور حصے داروں کی موجودگی میں ان کا حصے لینے کے بعد بچے ہوئے مال کا حق دار بنتا ہے، اگر کچھ نہ بچے تو محروم ہو جاتا ہے۔

عصبہ عاصب کی جمع ہے، لیکن فقہاء نے اس لفظ کو واحد کے لیے استعمال کیا ہے، کیوں کہ پورا مال لینے میں وہ جماعت کے قائم مقام ہے۔

عصبہ کی بنیاد پر وارث ہونے کے دلائل

قرآن اور حدیث میں اس کے بہت سے دلائل موجود ہیں۔

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (نساء ۱۷۶) اللہ تم کو تمھاری اولاد کے سلسلے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لیے عورتوں کے حصے کے دوگنا ہے۔

اللہ کا دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَإِنْ كَانُوْا إِخْوَةً رِجَالاً وَّنِسَاءً ا فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (نساء ۱۷۶) اگر وہ بھائی اور بہنیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے بقدر دیا جائے گا۔

دونوں آیتوں میں یہ دلیل ہے کہ بیٹا اور بھائی دونوں عصبہ ہونے کی بنیاد پر وارث ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی بہن کو بھی عصبہ بناتا ہے۔

امام بخاری (الفرائض ۶۳۵۱) اور امام مسلم (الفرائض ۱۵۱۶) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حصوں کو ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، پس جو بچے وہ سب سے قریبی مرد کے لیے ہے"۔

حدیث سے ہر قریبی رشتے دار مرد کے لیے عصبہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس بات پر بھی دلالت ہوتی ہے کہ جب متعدد لوگ عصبہ بنیں تو ان میں سے میت کے سب سے قریبی رشتے دار کو مقدم کیا جائے گا۔

عصبہ کی قسمیں

عصبہ کی دو قسمیں ہیں:

عصبہ نسبی اور عصبہ سببی:

عصبہ سببی

آزاد کرنے والا مرد یا عورت عصبہ سببی ہوتے ہیں اور اس کے عصبہ بنفسہ بننے والے بھی آزاد کردہ غلام یا باندی کے عصبہ بنتے ہیں، عصبہ بنفسہ آزاد کرنے والے کے قریبی مرد رشتے دار ہیں، ہم اس موضوع کی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کر رہے ہیں، کیوں کہ ہمارے زمانے میں غلاموں کا رواج نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی موضوع بن گیا ہے، اس کی بہت سے لوگوں کو ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

عصبہ نسبی

نسب کی بنیاد پر عصبہ بننے والے سب مرد؛ جن کا تذکرہ مرد وارثین کی بحث میں گزر چکا ہے، ان میں صرف شوہر اور اخیافی بھائی مستثنیٰ ہیں، وہ صرف حصے دار ہیں، وہ کبھی بھی عصبہ نہیں بنتے ہیں۔

چناں چہ باپ، دادا، بیٹا، پوتا، حقیقی بھائی، علاتی بھائی، حقیقی بھتیجا، علاتی بھتیجا، حقیقی چچا، علاتی چچا، حقیقی چچا زاد بھائی، علاتی چچا زاد بھائی، یہ سب عصبہ بنتے ہیں، اگر چہ ان میں سے بعض لوگ حصے کی بنیاد پر بھی وارث ہوتے ہیں مثلاً باپ اور دادا۔

عصبہ نسبی کی قسمیں

نسب کی بنیاد پر عصبہ بننے والوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ عصبہ بالنفس (خود سے عصبہ بننے والے)

۲۔ عصبہ بالغیر (دوسرے کی وجہ سے عصبہ بننے والے)

۳۔ عصبہ مع الغیر (دوسرے کے ساتھ عصبہ بننے والے)

ان تینوں قسموں کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

۱۔ عصبہ بالنفس (خود سے عصبہ بننے والے)

عصبہ بالنفس ہر وہ رشتے دار ہے جس کے اور میت کے درمیان کوئی عورت نہ ہو، ان

کا تذکرہ اوران کی تعداد کا ذکر گزر چکا ہے۔

عصبہ بالنفس کی جہتیں

۱۔بچوں کی جہت؛وہ میت کے فروع ہیں مثلاً بیٹا اور پوتا نیچے تک۔

۲۔باپ کی جہت؛وہ میت کے اصول ہیں مثلاً باپ اوردادا اوپر تک۔

۳۔بھائی کی جہت؛وہ میت کے والد کے فروع ہیں جن کے اورمیت کے نسب میں کوئی عورت بیچ میں نہ آتی ہو،مثلاً حقیقی بھائی،علاتی بھائی،حقیقی بھتیجا،علاتی بھتیجا۔

۴۔دادا کی جہت؛وہ میت کے دادا کے مرد فروع ہیں جن کے درمیان اور میت کے درمیان نسب میں کوئی عورت بیچ میں نہ ہو،مثلاً حقیقی چچا،علاتی چچا،حقیقی چچازاد بھائی اور علاتی چچازاد بھائی۔

عصبہ بالنفس کے وارث ہونے کا اصول اور قاعدہ

۱۔مذکورہ بالا ترتیب میں پہلی والی جہت کے عصبہ کی موجودگی میں بعد والے جہت کے عصبہ وارث نہیں بنتے ہیں،چناں چہ بچوں یا پوتوں کی موجودگی میں عصبہ کی بنیاد پر باپ اور دادا وارث نہیں بنتے ہیں اور باپ کی موجودگی میں بھائی اور بھائی کی موجودگی میں چچا وارث نہیں ہوتا ہے۔

۲۔جب ایک ہی جہت کے بہت سے لوگ ہوں؛مثلاً باپ اور دادا،یا بیٹا اور پوتا،بھائی اور بھتیجا،یا چچا اور چچازاد بھائی تو اس صورت میں قریبی رشتے دار کی موجودگی میں دور کا رشتے دار وارث نہیں بنتا ہے،چناں چہ باپ کی موجودگی میں دادا،بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں بنتا ہے،دوسرے الفاظ میں؛جو میت تک کسی واسطہ سے پہنچتا ہو تو اس واسطے کی موجودگی میں وہ وارث نہیں بنتا ہے۔

۳۔جب رشتے داری کی جہت ایک ہی ہو اور درجہ میں عصبہ برابر ہوں،لیکن میت سے رشتے داری میں طاقت میں اختلاف ہو تو رشتے داری میں طاقت ور کو کمزور پر مقدم کیا جائے گا،چناں چہ حقیقی بھائی علاتی بھائی پر مقدم ہوگا اور حقیقی چچا علاتی چچا پر مقدم ہوگا۔

۴۔ جب ایک ہی جہت، درجہ اور طاقت کے وارثین جمع ہوں تو وہ سب میراث کے مستحق بن جاتے ہیں اور ان کے درمیان میراث برابر تقسیم کی جائے گی مثلاً تین بیٹے ہوں یا چار بھائی ہوں۔

۲۔ عصبہ بالغیر

عصبہ بالغیر ہر وہ حصے والی عورت ہے کہ اگر اس کے ساتھ اس کا بھائی ہو تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ بن جاتی ہے، مثلاً بیٹی کے ساتھ بیٹا اور حقیقی بھائی کے ساتھ حقیقی بہن موجود ہو۔

اس اصول سے اخیافی بھائی بہن مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ یہ بھائی نہ خود سے عصبہ (عصبہ بالنفس) بنتا ہے اور نہ اپنی بہن کو عصبہ بناتا ہے۔

عصبہ بالغیر میں شرط یہ ہے کہ درجہ اور رشتے داری کی قوت میں یکسانیت ہو، چناں چہ حقیقی بہن علاتی بھائی کے ساتھ عصبہ نہیں بنتی ہے، کیوں کہ یہ بہن اس سے رشتے داری میں طاقت ور ہے، اور نہ بیٹی پوتے کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہے، کیوں کہ وہ پوتے سے زیادہ قریبی رشتے دار ہے۔

درجہ کی یکسانیت کے اصول اور قاعدہ سے پوتیاں مستثنیٰ ہیں، جب ان کے ساتھ پوتے کا بیٹا ہو جو پوتیوں سے کم درجہ کا ہو، یہ پڑپوتا پوتیوں کو ایک حالت میں عصبہ بناتا ہے، جب ان کو اس کی ضرورت ہو، اس کی شکل یہ ہے کہ میت کی دو بیٹیاں ہوں اور پوتیاں موجود ہوں، اس صورت میں دو بیٹیوں کو دو تہائی حصہ ملے گا اور پوتیوں کو کچھ بھی نہیں، اگر اس صورت میں پوتیوں کے ساتھ پڑپوتا بھی ہو تو یہ پوتیوں کو عصبہ بناتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر میراث کا باقی حصہ لیتا ہے۔

عصبہ بالغیر وہ عورتیں ہیں جو دو تہائی اور نصف کی حصے دار بنتی ہیں، جب ان کے ساتھ ان کا بھائی ہو تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں، یہ عورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیٹیاں بیٹے کے ساتھ

۲۔ پوتیاں پوتے کے ساتھ

۳۔ حقیقی بہنیں حقیقی بھائی کے ساتھ
۔علاتی بہنیں علاتی بھائی کے ساتھ

عصبہ بالغیر کی دلیل

اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (نساء ۱۷۶) اللہ تم کو تمھاری اولاد کے سلسلے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لیے عورتوں کے حصے کے دوگنا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے: "وَإِنْ كَانُوْا إِخْوَةً رِجَالاً وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (نساء ۱۷۶) اگر وہ بھائی اور بہنیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے بقدر دیا جائے گا۔

علماء نے بیٹیوں پر پوتیوں اور بہنوں کو قیاس کیا ہے، جس میں حقیقی اور علاتی دونوں شامل ہیں۔

۳۔عصبہ مع الغیر

عصبہ مع الغیر حقیقی یا علاتی بہن بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہوتی ہے۔

جب میت کی دو بیٹیاں اور ایک حقیقی یا علاتی بہن ہو تو بیٹیاں حصے کی بنیاد پر دو تہائی کی وارث ہوتی ہیں اور حقیقی یا علاتی بہن باقی بچے ہوئے ایک تہائی میراث کی عصبہ کی بنیاد پر وارث بنتی ہے۔

اسی طرح ایک پوتی یا پوتیوں کے ساتھ حقیقی یا علاتی بہن موجود ہو تو یہی صورت بنتی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے بیٹی، پوتی اور بہن کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا: اس بارے میں میں وہی فیصلہ کروں گا جو فیصلہ نبی کریم ﷺ نے کیا ہے: بیٹی کے لیے نصف، پوتی کے لیے چھٹا حصہ اور بچا ہوا بہن کے لیے۔(بخاری: الفرائض ۶۳۵۵)

میراث میں باپ کی حالتیں

میراث میں باپ کا تذکرہ ہم نے حصے داروں میں بھی کیا ہے اور عصبہ بننے والوں میں بھی، اسی وجہ سے میراث میں اس کی حالتیں الگ سے بیان کی جا رہی ہیں:

پہلی حالت: صرف حصے کی بنیاد پر وراثت

یہ اس وقت ہوتا ہے جب میت کا ایک ہی مرد فرع وارث ہو، مثلاً بیٹا یا پوتا۔

دوسری حالت: صرف عصبہ کی بنیاد پر وراثت

جب میت کا کوئی فرع وارث ہی نہ ہو چاہے مرد ہو یا عورت مثلاً بیٹا یا بیٹی، پوتا یا پوتی

پہلی حالت کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: ''وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ'' (نساء ۱۱) اور اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد ہو۔

دوسری حالت کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ'' (نساء ۱۱) پس اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

یعنی اس کے باپ کے لیے بچی ہوئی میراث ہے، کیوں کہ جب قرآن نے باپ کے حصے سے خاموشی اختیار کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کو دینے کے بعد بچا ہوا لے گا اور یہ عصبہ کی بنیاد پر اس کو ملے گا۔

تیسری حالت: حصہ دار بھی بنتا ہے اور عصبہ بھی

اگر میت کی وارث کوئی عورت ہو، ایک یا زائد مثلاً بیٹی یا پوتی تو باپ پہلے حصے کی بنیاد پر چھٹا حصہ لے گا پھر عصبہ کی بنیاد پر میراث کا بقیہ لے گا، اگر میراث میں کچھ بچ جائے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''حصے ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، کچھ بچے تو سب سے قریبی مرد کے لیے ہے'' (بخاری: الفرائض ۶۳۵۱، مسلم: الفرائض ۱۶۱۵)

اور اس مسئلہ میں باپ سب سے قریبی مرد ہے، اس میں پہلے وہ حصے کی بنیاد پر چھٹا

حصہ لے گا اور میت کی اولاد میں سے عورت اپنا حصہ لے گی اور باپ دوسری مرتبہ عصبہ کی بنیاد پر بچا ہوا مال لے گا۔

وراثت میں دادا کی حالتیں

ہم نے دادا کا بھی تذکرہ حصے داروں اور عصبہ بننے والوں میں کیا ہے، اسی وجہ سے دادا کی بھی وہی حالتیں ہیں جو باپ کی ہیں، چناں چہ وہ صرف حصے کی بنیاد پر بھی وارث بنتا ہے جس طرح صرف عصبہ کی بنیاد پر وراثت کا حق دار ہوتا ہے، اسی طرح حصہ دار بننے اور عصبہ بننے کی بنیاد پر ایک ساتھ وارث ہوتا ہے، لیکن بعض حالتوں میں دادا باپ کے بالکل الگ ہوتا ہے۔

وہ حالتیں جن میں دادا باپ سے الگ ہوتا ہے

مندرجہ ذیل تین حالتوں میں دادا باپ سے الگ ہوتا ہے:

۱۔جب دادا کے ساتھ میت کے حقیقی یا علاتی بھائی اور بہنیں ہوں، کیوں کہ باپ ان سبھوں کو محجوب کر دیتا ہے، جہاں تک دادا کا تعلق ہے تو وراثت میں ان کا شریک ہوتا ہے جس کی تفصیلات الگ باب میں آرہی ہیں۔

۲۔دوعمری مسئلوں میں؛ اگر ان مسئلوں میں باپ کی جگہ دادا ہو تو ماں مکمل ایک تہائی حصے کی حق دار بنتی ہے، ثلث باقی کی نہیں، جس طرح وہ باپ کے ساتھ ثلث باقی لیتی ہے۔

۳۔باپ اپنی ماں کو محجوب کر دیتا ہے، جب کہ دادا محجوب نہیں کرتا ہے۔

اگر میت کا باپ ہو اور دادی ہو تو یہ دادی باپ کی موجودگی کی وجہ سے وراثت سے محروم ہو جاتی ہے، جب کہ دادا ہو تو وہ محروم نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ وہ اس کے واسطے سے میت تک نہیں پہنچتی ہے۔

البتہ وہ اس صورت میں باپ کی طرح ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کی ماں محجوب ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہ اس کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے، جس طرح دادی باپ کی وجہ سے محجوب بن جاتی ہے۔

حجب

حجب کی تعریف

حجب کے لغوی معنی منع کرنے کے ہیں، اسی وجہ سے بادشاہ کے دربان کو ''حاجب الملک'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ لوگوں کو اس کے پاس جانے سے روکتا ہے۔

محجوب کے معنی ممنوع کے ہیں، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ''کَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ'' (مطففین ۱۵) ہرگز نہیں، بے شک ان کو اس دن ان کے رب سے روک دیا جائے گا۔

محجوب کے اصطلاعی معنی: وراثت کا سبب پائے جانے والے کو مکمل وراثت یا اس کے بڑے حصے سے محروم کردینے کے ہیں۔

حجب کی قسمیں:

حجب کی دو قسمیں ہیں:

اوصاف وصفات کی وجہ سے حجب جس کو ''حجب بالاوصاف'' کہا جاتا ہے۔

اور اشخاص کی وجہ سے حجب جس کو ''حجب بالاشخاص'' کہا جاتا ہے۔

۱۔ حجب بالاوصاف

حجب بالاوصاف کا مطلب وراثت کا سبب پائے جانے والے کو مکمل وراثت سے کسی ایسے وصف کی بنیاد پر محروم کردینا ہے جس وصف کے پائے جانے کی وجہ سے آدمی وارث نہیں بنتا ہے۔

وراثت سے محروم کرنے والے اوصاف کا تذکرہ موانع ارث میں کیا جاچکا ہے، وہ

مندرجہ ذیل ہیں:

غلامی، قتل اور کفر؛

ان کا تذکرہ دلائل کے ساتھ گزر چکا ہے، اس کو محجوب بالوصف کہا جاتا ہے۔

۲۔ حجب بالاشخاص

حجب بالاشخاص سے مراد کسی شخص کو مکمل وراثت یا اس کے بعض حصے سے اس بنیاد پر محروم کرنا کہ میت کا اس سے قریبی رشتے دار پایا جائے۔

حجب بالاشخاص کی قسمیں

حجب بالاشخاص کی دو قسمیں ہیں: حجب حرمان اور حجب نقصان

۱۔ حجب حرمان (وراثت سے مکمل طور پر محرومی)

حجب حرمان سے مراد کسی شخص کو وراثت سے مکمل طور پر محروم کر دینا، مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتا محجوب ہو جاتا ہے اور اس کو کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

۲۔ حجب نقصان (وراثت سے جزئی طور پر محرومی)

حجب نقصان سے مراد کسی شخص کو اس کے بڑے وراثتی حصے سے محروم کرنا ہے، مثلاً بیوی کے بچوں کی موجودگی میں شوہر کو اپنے نصف حصے کے مقابلے میں ایک چوتھائی ملتا ہے۔

وہ افراد جو مکمل طور پر محجوب نہیں ہوتے ہیں

چھ وارث مکمل طور پر محجوب نہیں ہوتے ہیں: باپ، ماں، بیٹا، بیٹی، شوہر اور بیوی۔

ان کے علاوہ سبھی وارثین مکمل طور پر محجوب ہو سکتے ہیں۔

وارثین میں سے کون مکمل طور پر محجوب ہوتے ہیں؟

مذکورہ بالا چھ وارثوں کے علاوہ سبھی وارثین مکمل طور پر محجوب ہو جاتے ہیں، وہ وارثین مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔دادا: باپ کی موجودگی میں دادا مطلقاً وراثت سے محروم ہوجاتا ہے، چاہے دادا حصے کی بنیاد پر وارث بنتا ہو یا عصبہ کی بنیاد پر، یا دونوں بنیادوں پر، کیوں کہ باپ دادا کے مقابلے میں میت کا قریبی رشتے دار ہے اور باپ کے واسطے سے دادا میت تک پہنچتا ہے، اور جو کوئی کسی واسطے سے میت تک پہنچتا ہے تو اس واسطے کی موجودگی میں وہ محجوب بن جاتا ہے۔

۲۔دادی اور نانی: ماں کی موجودگی میں محجوب ہوجاتی ہے چاہے دادی ہو یا نانی۔

اس کے علاوہ دادی باپ کی موجودگی میں بھی محجوب ہوتی ہے، کیوں کہ وہ باپ کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے۔

۳۔باپ کی جہت سے دور کی دادی: اگر میت کی دادی اور نانی ہو اور دونوں کا نسب جہت کے اعتبار سے مختلف ہو، یعنی ایک باپ کی طرف سے دادی ہو اور دوسری ماں کی طرف سے نانی ہو اور ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں میت سے قریب ہو مثلاً ایک نانی ہو اور دوسری دادی کی ماں تو ماں کی طرف سے قریبی رشتے دار یعنی نانی باپ کی طرف سے دور کی رشتے دار یعنی دور کی دادی کو محجوب کردیتی ہے اور اس کو تنہا چھٹا حصہ ملتا ہے، کیوں کہ اس کو دو طرح کی طاقت حاصل ہے، ایک درجے کی اور دوسرے ماں کی طرف سے ہونے کی، کیوں کہ ماں ہی اصل ہے اور دادیاں اور نانیاں اس کی فرع ہیں۔

اگر دادی قریب ہو اور نانی دور کی ہو مثلاً دادی ہو اور نانی کی ماں ہو تو امام شافعی کا مفتی بہ مسلک یہ ہے کہ دادی دور کی نانی کو محجوب نہیں کرتی ہے، بلکہ ان دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا، کیوں کہ باپ اس حالت میں اس کو محجوب نہیں کرتا ہے تو وہ دادی جو باپ کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے وہ بدرجہ اولی نانی کو محجوب نہیں کرے گی۔

۴۔پوتے اور پوتیاں: پوتے اور پوتیاں بیٹے کی موجودگی میں محجوب ہوجاتے ہیں چاہے میت کا بیٹا ان پوتوں اور پوتیوں کا باپ ہو یا چچا، کیوں کہ اس کے واسطے سے وہ میت تک پہنچتے ہیں یا وہ ان کے مقابلے میں زیادہ قریبی عصبہ ہے، اس حکم پر علما کا اجماع ہے۔

اسی طرح پوتا اپنے بعد والوں یعنی پڑپوتوں اور پڑپوتیوں کو محجوب کردیتا ہے، پوتیاں

دو بیٹیوں کی موجودگی میں مجوب ہوجاتی ہے، البتہ ان کے درجے کا یا ان کے نیچے کے درجے کا کوئی پوتا ہو تو وہ ان پوتیوں کو عصبہ بنا تا ہے۔

۸۔حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی بہن مندرجہ ذیل لوگوں کی موجودگی میں مجوب ہوجاتے ہیں:

۱۔باپ

۲۔بیٹا

۳۔پوتا

اس حکم پر علماء کا اجماع ہے کیوں کہ بیٹے اور باپ کی جہت بھائی کی جہت پر مقدم ہے۔

اس سے دادا مستثنیٰ ہے، کیوں کہ وہ حقیقی اور علاتی بھائی بہنوں کو مجوب نہیں کرتا ہے، بلکہ دادا اور یہ سب وارث بنتے ہیں، کیوں کہ وہ میت سے قریب ہونے میں برابر ہیں اور وہ دادا کے واسطے سے میت تک نہیں پہنچتے ہیں۔

علاتی بھائی بہن حقیقی بھائی کی موجودگی میں مجوب ہوجاتے ہیں اور حقیقی بہن کی موجودگی میں اس صورت میں مجوب ہوتے ہیں جب وہ ایک بیٹی یا ایک پوتی کے ساتھ ہو، کیوں کہ وہ اس صورت میں عصبہ مع الغیر بن جاتی ہے، اور حقیقی بھائی کی طرح بن جاتی ہے۔

دو حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی بہنیں بھی مجوب ہوجاتی ہیں، البتہ ان کے ساتھ علاتی بھائی ہو تو وہ سب اس کے ساتھ مل کر عصبہ بنتی ہیں اور وارث ہوتی ہیں۔

اخیافی بھائی باپ، بیٹے اور پوتے کی موجودگی میں مجوب ہوتا ہی ہے اور مندرجہ ذیل لوگوں کی موجودگی میں بھی مجوب ہوتا ہے:

۱۔بیٹی

۲۔پوتی

۳۔دادا

یہ حکم اجماع کی وجہ سے ہے۔

البتہ ماں کی موجودگی میں اخیافی بھائی محجوب نہیں ہوتا ہے، اگر چہ وہ ماں کے واسطے سے میت تک پہنچتا ہے، کیوں کہ واسطے کی وجہ سے محجوب ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ دونوں جہت یکساں ہوں مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا محجوب ہوجاتا ہے، اسی طرح ماں کی موجودگی میں دادی اور نانی، یا واسطہ تنہا ہونے کی صورت میں پوری میراث کا وارث بنتا ہو، مثلاً باپ کے ساتھ بھائی تنہا ہو تو باپ پوری میراث کا حق دار بنتا ہے، اس لیے کہ بھائی محجوب ہوجاتا ہے، ماں اپنے بچے کے ساتھ پورے میراث کی وارث نہیں بنتی ہے، کیوں کہ وہ ماں ہونے کی وجہ سے وارث بنتی ہے، اور بھائی بھائی ہونے کی وجہ سے وارث ہوتا ہے، ماں اگر تنہا ہو تو پوری میراث کی وارث نہیں بنتی ہے بلکہ صرف ایک تہائی کی وارث بنتی ہے۔

۶۔ حقیقی یا علاتی بھتیجے: یہ مندرجہ ذیل لوگوں کی موجودگی میں محجوب ہوجاتے ہیں:

۱۔ باپ کی موجودگی میں، کیوں کہ ان کے والدان کو محجوب کردیتے ہیں، چناں چہ ان کو میت کے باپ کا محجوب کرنا بدرجہ اولی ہوجائے گا۔

۲۔ دادا، کیوں کہ وہ ان کے والد کے درجے میں ہے۔

۳۔ بیٹا، کیوں کہ بیٹا خودان کے باپ کو محجوب کردیتا ہے تو ان کو بھی بدرجہ اولی محجوب کردے گا۔

۴۔ پوتا، اس کا بھی یہی مسئلہ ہے۔

۵۔ حقیقی بھائی، کیوں کہ وہ حقیقی یا علاتی بھتیجوں کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے۔

۶۔ علاتی بھائی، کیوں کہ یہ بھی ان کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے۔

حقیقی بھتیجہ علاتی بھتیجے کو محجوب کردیتا ہے، کیوں کہ وہ علاتی کے مقابلے میں میت سے رشتے داری میں زیادہ طاقت ور ہے۔

اخیافی بھائی کی اولاد وارثین میں سے نہیں ہیں، بلکہ ان کا شمار ذوی الارحام میں ہوتا ہے۔

۷۔ حقیقی یا علاتی چچا، ان کو مندرجہ ذیل لوگ محجوب کردیتے ہیں:

۱۔باپ

۲۔دادا

۳۔بیٹا

۴۔پوتا، نیچے تک

۵۔حقیقی بھائی

۶۔علاتی بھائی

۷۔حقیقی بھتیجہ

۸۔علاتی بھتیجہ

۹۔حقیقی بہن، جب بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو، کیوں کہ وہ عصبہ مع الغیر ہے، حقیقی بھائی کی جگہ پر۔

۱۰۔علاتی بہن، جب وہ بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو، کیوں کہ وہ عصبہ مع الغیر ہے، جیسا کہ ہم نے حقیقی بہن کے بارے میں بتایا ہے۔

۸۔چچازاد بھائی چاہے وہ حقیقی ہوں یا علاتی، مذکورہ بالا لوگوں کی موجودگی میں بھی محجوب ہوجاتے ہیں، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد کی موجودگی میں محجوب ہوجاتے ہیں:

۱۔چچا، چاہے حقیقی ہو یا علاتی، علاتی چچازاد بھائی کو حقیقی چچازاد بھائی محجوب کردیتا ہے۔

بھتیجہ کسی کو عصبہ نہیں بناتا ہے:

یہ بات جاننا ضروری ہے کہ بھتیجہ اپنی بہن کو عصبہ نہیں بناتا ہے، چاہے بھتیجہ حقیقی ہو یا علاتی، کیوں کہ بھتیجی نہ حصے کی بنیاد پر وارث بنتی ہے اور نہ عصبہ کی بنیاد پر، بلکہ وہ ذوی الارحام میں سے ہے۔

وہ لوگ جو حجبِ نقصان کے شکار ہوتے ہیں یعنی ان کا حصہ کم ہوتا ہے:

حجبِ نقصان کا شکار ہر وارث ہوتا ہے:

اولاد کی موجودگی میں شوہر کو نصف حصہ ملنے کے بجائے ایک چوتھائی حصہ ملتا ہے اور بیوی کو اولاد کی موجودگی میں ایک چوتھائی کے بجائے آٹھواں حصہ ملتا ہے، اولاد یا ایک سے زائد بھائیوں کی موجودگی میں ماں کو ایک تہائی کے بجائے چھٹا حصہ ملتا ہے۔

بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو آدھے کے بجائے چھٹا حصہ ملتا ہے، علاتی بہن کو حقیقی بہن کی موجودگی میں آدھے حصے کے بجائے چھٹا حصہ ملتا ہے، دوسرے بیٹے کی موجودگی میں بیٹا بھی حجبِ نقصان کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح باقی وارثین بھی حجبِ نقصان کا شکار ہوتے ہیں۔

حجبِ حرمان کا شکار ہونے والے دوسرے کو حجب نقصان کا شکار کرتے ہیں:

اس بات سے واقف ہونا ضروری ہے کہ مکمل طور پر محجوب ہونے والا (حجبِ حرمان) دوسروں کے بنسبت موجود کی طرح ہے اور دوسروں کو حجبِ نقصان کرتا ہے، چناں چہ میت کا دادا، ماں اور دو اخیافی بھائی ہوں تو اخیافی بھائی دادا کی وجہ سے محجوب ہوجاتے ہیں، اس کے باوجود وہ دو بھائی ماں کو ایک تہائی سے چھٹے حصے کا حق دار بناتے ہیں یعنی حجبِ نقصان کا شکار بناتے ہیں۔

اسی طرح اگر میت کا ایک حقیقی بھائی اور دوسرا علاتی بھائی ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ ایک سے زائد بھائی موجود ہیں، اگر چہ یہاں علاتی بھائی حقیقی بھائی کی موجودگی کی وجہ سے محجوب ہوجاتا ہے۔

وصف کی بنیاد پر محجوب ہونے والے کی موجودگی اور عدم موجودگی یکساں ہے

وصف کی بنیاد پر محجوب ہونے والا مثلاً کافر یا قاتل یا غلام، وہ کسی کو نہ مکمل طور پر محجوب کرتے ہیں اور نہ جزوی طور پر، بلکہ ان کی موجودگی اور عدم موجودگی یکساں ہے۔

اگر میت کا قاتل بیٹا اور ماں ہو تو ماں کو ایک تہائی ملے گا، حالاں کہ قاتل کا بیٹا موجود ہے، کیوں کہ وہ میراث سے محروم ہے اور وہ کسی کو محجوب نہیں کرتا ہے۔

المسألة المشرَّكة

اس کو"المسألة المشتركة" بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی مشترک مسئلہ کے ہیں اس کو مشترک مسئلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی حصے یعنی ایک تہائی میں حقیقی بھائی اور اخیافی بھائی شریک ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ کے چار ارکان ہیں:

شوہر۔ماں یا دادی۔دو یا دو سے زیادہ اخیافی بھائی یا بہنیں یا دونوں۔ایک یا زائد حقیقی بھائی، چاہے اس بھائی کے ساتھ ایک یا زائد حقیقی بہنیں موجود ہوں، حصے داروں اور عصبہ بننے والوں کی بحث میں مذکورہ اصول وضوابط کے تقاضے کے مطابق:

شوہر کو نصف ملے گا۔

ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اور اخیافی اولاد کو میراث کا ایک تہائی ملے گا۔

حقیقی بھائی مشہور اصول کے مطابق عصبہ بنے گا۔

تقسیم کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حصے دار اپنے حصوں کی بنیاد پر پوری میراث کو لے لیتے ہیں اور ترکہ میں حقیقی بھائی کو کچھ بھی نہیں بچتا ہے، جس کا وہ عصبہ بننے کی بنیاد پر مستحق ہوتا ہے، چناں چہ اصول کے مطابق اس کو کچھ بھی نہیں ملتا، کیوں کہ ترکہ میں کچھ بھی مال نہیں بچتا ہے، ہم نے عصبہ کی تعریف میں بتادیا ہے کہ وہ تنہا ہونے کی صورت میں پورے مال کا حق دار بنتا ہے اور تنہا نہ ہونے کی صورت میں باقی وارثوں کا حصہ دینے کے بعد بچے ہوئے مال کا مستحق بنتا ہے، اگر کچھ بھی نہ بچے تو وہ محروم ہو جاتا ہے، جب یہ مسئلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے یہی فیصلہ کیا۔

لیکن وارثین اس پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت عمر کے پاس واپس آئے اور انھوں نے کہا: امیر المومنین! فرض کیجئے کہ ہمارے والد دریا میں پھینکے ہوئے پتھر ہیں، تو کیا ہم سب بھائی کی ماں ایک ہی نہیں ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔ چناں چہ حضرت عمر اس بات پر مطمئن ہو گئے اور ایک تہائی حصے میں حقیقی بھائیوں اور اخیافی بھائیوں کے درمیان شراکت کا فیصلہ کیا اور ان کے درمیان ایک تہائی برابر برابر تقسیم کیا، گویا وہ سب صرف ایک ہی ماں کی اولاد ہیں، بہت سے صحابہ نے اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی، جن میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی ہیں، اس مسلک کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے، یہ مسلک عقل کے نزدیک قابلِ قبول بھی ہے اور انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے۔

دادااور بھائی بہنوں کی وراثت

ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ دادا تنہا ہواور اس کے ساتھ کوئی حقیقی یا علاتی بھائی نہ ہوتو میراث میں اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔

اسی طرح بھائی بہن کے ساتھ دادا نہ ہوتو مسئلہ کا حکم کیا ہے۔

ہم یہاں اس مسئلہ کو بیان کر رہے ہیں کہ دادا کے ساتھ بھائی بہن ہوں تو کیا حکم ہے؟

دادااور بھائی موجود ہوں تو اس کا حکم قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ہے، البتہ اس مسئلہ میں صحابہ کا اجتہاد ملتا ہے۔

اسی وجہ سے اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے، ان ہی کے اختلاف کی وجہ سے فقہی مسالک میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم دادا اور بھائیوں کی میراث میں فتوی دینے سے گھبراتے تھے، اور اس بارے میں کچھ کہنے سے ڈرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ وہ جہنم کی تہہ میں داخل ہوجائے تو وہ بھائیوں اور دادا کے درمیان فیصلہ کرے“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: ”ہم سے اپنے مشکل امور کے بارے میں دریافت کرو اور ہم سے دادا کے بارے میں سوال کرنے سے باز رہو، اللہ نہ اس کو مالک بنائے اور نہ اس کو باقی رکھے“۔

اس سے مقصود بددعا نہیں ہے بلکہ اس بارے میں فیصلہ کرنے میں دشواری کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا جب ابولولو نے

ان کو خنجر سے مارا اور آپ کے انتقال کا وقت قریب آیا: ''مجھ سے تین باتوں کو محفوظ رکھو: میں دادا کے سلسلے میں کچھ نہیں کہتا ہوں اور نہ کلالہ کے سلسلے میں کچھ کہتا ہوں، اور میں تم پر کسی کو والی نہیں بناتا ہوں''۔

ہم دادا اور بھائیوں کے مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہوئے کوئی بات نہیں کہتے ہیں، بلکہ ہم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کی توفیق سے کہتے ہیں:

وراثت میں بھائیوں کے ساتھ دادا کی حالتیں

حقیقی یا علاتی بھائی بہنوں کی موجودگی میں دادا کی دو حالتیں ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ دادا اور بھائی بہنوں کے ساتھ کوئی حصے دار موجود نہ ہو، مثلاً بیوی، بیٹی یا شوہر اور دادی وغیرہ۔

دوسری حالت یہ ہے کہ ان کے ساتھ کوئی حصے دار موجود ہو مثلاً بیوی اور بیٹی وغیرہ۔

پہلی حالت کے احکام

اس حالت میں بھائیوں کے ساتھ دادا کے لیے دو حکم ہیں جن میں سے دادا کے حق میں افضل کو اختیار کیا جائے گا یعنی جس میں دادا کو زیادہ حصہ ملتا ہے وہی اس کو دیا جائے گا۔

۱۔میراث میں سے ایک تہائی حصہ اگر یہ اس کے لیے بہتر ہو۔

۲۔مقاسمہ؛ اگر یہ دادا کے لیے بہتر ہو۔

مقاسمہ یہ ہے کہ دادا بھائی کی طرح ہوگا اور وہ ان کے ساتھ دو عورتوں کا حصہ لے گا، اگر یہ بھائی حقیقی یا علاتی ہوں یا بہنیں علاتی یا حقیقی ہوں۔

البتہ اخیافی بھائیوں کو میراث میں دادا کے ساتھ کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ دادا ان کو محجوب کر دیتا ہے، اس کا تذکرہ حجب کے باب میں ہو چکا ہے۔

دادا کے لیے مقاسمہ بہتر ہونے کی شکلیں

دادا کے لیے مقاسمہ ایک تہائی سے بہتر اور زیادہ نفع بخش اس وقت ہوتا ہے جب

بھائی اور بہن دادا سے دوگنا سے کم ہوں، اس کی بعض مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دادا اور ایک بھائی، اس صورت میں دادا کو آدھی میراث ملے گی اور بھائی کو آدھی۔

۲۔ دادا اور ایک بہن؛ اس صورت میں دو تہائی دادا کو اور ایک تہائی بہن کو ملے گا۔

۳۔ دادا اور دو بہنیں؛ اس صورت میں دادا کو نصف اور دو بہنوں کو نصف ملے گا۔

۴۔ دادا اور تین بہنیں، پانچ میں سے دو حصے دادا کو اور بہنوں کو تین حصے ملیں گے، ہر بہن کو ایک حصہ۔

۵۔ دادا، ایک بھائی اور ایک بہن، دادا کے لیے پانچ میں سے دو حصے، بھائی کے لیے دو اور بہن کو ایک حصہ ملے گا۔

دادا کو ایک تہائی بہتر ہونے کی شکلیں

دادا کے لیے ایک تہائی مقاسمہ سے بہتر اور زیادہ مفید اس وقت ہوتا ہے جب بھائی اور بہن دادا سے دوگنا سے زیادہ ہوں۔

اس کی بعض شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دادا اور تین بھائی؛ اگر دادا کو مقاسمہ کی بنیاد پر حصہ دیا جائے گا تو اس کو میراث کا ایک چوتھائی ملے گا جو ایک تہائی سے کم ہے، اس لیے اس کو ایک تہائی دیا جائے گا کیوں کہ یہ اس کے حق میں بہتر اور مفید ہے۔

۲۔ دادا، ایک بھائی اور تین بہنیں؛ اس صورت میں بھی دادا کے لیے ایک تہائی بہتر ہے، کیوں کہ اگر اس کو مقاسمہ کی بنیاد پر وراثت دی جائے گی تو اس کو سات میں سے دو حصے ملیں گے، اور ایک تہائی ان دو حصوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

مقاسمہ اور ایک تہائی برابر برابر ہوتے ہوں

یہ اس وقت ہوتا ہے جب بھائی بہن دادا سے دوگنا ہوں، یہ صرف مندرجہ ذیل تین شکلوں میں ہی ہوتا ہے:

۱۔ دادا اور دو بھائی؛ اگر دادا کو مقاسمہ کی بنیاد پر دیا جائے گا تو اس کو میراث کا ایک

تہائی ملے گا، اگر حصے کی بنیاد پر دیا جائے گا تو بھی ایک تہائی ہی ملے گا۔

۲۔ دادا اور چار بہنیں؛ اس میں بھی دونوں بنیادوں پر دادا کو ایک تہائی ہی ملے گا۔

۳۔ دادا، ایک بھائی اور دو بہنیں؛ مقاسمہ میں دادا کو دو حصے ملیں گے اور ایک تہائی کی صورت میں بھی دو حصے ہی ملیں گے، چناں چہ مقاسمہ اور ایک تہائی دونوں یکساں ہیں۔

جب مقاسمہ اور ایک تہائی مال برابر برابر ہو جاتے ہوں تو بہتر یہ ہے کہ دادا کو حصے کی بنیاد پر ایک تہائی دیا جائے، کیوں کہ حصہ عصبہ سے طاقت ور ہے اور وراثت میں اس کو عصبہ پر مقدم کیا جاتا ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کو مقاسمہ کی بنیاد پر وراثت دی جائے، تیسرا قول یہ ہے کہ مفتی کو اختیار دیا جائے، وہ جس طرح چاہے دادا کو وراثت دے۔

دوسری حالت کے احکام یعنی دوسرے وارثین بھی موجود ہوں

جب بھائیوں اور دادا کے ساتھ کوئی حصے دار بھی موجود ہو تو اس حالت میں تین احکام ہیں، ان میں جو دادا کے لیے بہتر ہے اس کو دیا جائے گا:

۱۔ مقاسمہ؛ جب یہ دادا کے لیے فائدہ مند ہو۔

۲۔ حصہ داروں کو حصہ دینے کے بعد بچی ہوئی میراث میں سے ایک تہائی، اگر یہ اس کے لیے بہتر ہو۔

۳۔ وراثت کا چھٹا حصہ، اگر یہ مذکورہ دونوں شکلوں سے بہتر ہو، اور دادا کی وراثت چھٹے حصے سے نہ اسماً کم ہوتی ہو اور نہ حقیقتاً۔

مقاسمہ کی شکلیں

شوہر، دادا اور بھائی؛

اس صورت میں شوہر کو آدھا ملے گا، اور آدھا باقی بچے گا، چناں چہ بھائی اور دادا کو برابر برابر دیا جائے گا اور میراث میں ان دونوں کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا، اس صورت میں مقاسمہ دادا کے لیے بہتر ہے، کیوں کہ شوہر کو آدھا ملتا ہے، اگر ثلث باقی دیا جائے تو چھٹا حصہ ملے گا اور جملہ میراث میں چھٹے حصے سے بھی یہ بہتر ہے۔

اگر شوہر کی جگہ بیوی اور ایک بھائی کی جگہ دو بہنیں ہوں تو بھی دادا کے لیے مقاسمہ ہی دونوں مذکورہ شکلوں سے بہتر ہے۔

ثلث باقی کی صورت

ماں، دادا، پانچ بھائی؛

اس مسئلہ میں ماں کو حصہ دینے کے بعد بچی ہوئی میراث کا ایک تہائی دادا کے لیے زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے، یعنی چھ میں سے ایک، اس کے بعد پانچ حصے بچتے ہیں، اگر دادا کو مقاسمہ کی بنیاد پر دیا جائے گا تو اس کو چھ میں سے ایک حصہ سے بھی کم ملے گا، اگر اس کو چھٹا حصہ دیا جائے گا تو چھ میں سے ایک ملے گا، لیکن اگر اس کو ثلث باقی دیا جائے گا تو اس کو ایک اور دو تہائی (ڈیڑھ سے زیادہ) حصہ ملے گا، اور یہ دادا کے لیے بہتر اور زیادہ فائدہ مند ہے۔

چھٹے حصے کی صورت

شوہر، ماں، دادا اور دو بھائی؛

اس صورت میں دادا کو چھٹا حصہ مقاسمہ اور ثلث باقی سے بہتر اور مفید ہے۔

کیوں کہ اس صورت میں شوہر کو نصف ملے گا اور ماں کو چھٹا حصہ، شوہر اور ماں کا حصہ نکالنے کے بعد ایک تہائی میراث باقی بچتی ہے، اگر دادا کو مقاسمہ کی بنیاد پر دیا جائے گا یا اس کو ثلث باقی دیا جائے گا تو بچی ہوئی میراث میں سے ایک تہائی ملے گا جو چھٹے حصے سے بھی کم ہے، اسی وجہ سے اس کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی بچا ہوا چھٹا حصہ دو بھائیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

مقاسمہ اور ثلث باقی کے برابر ہونے کی صورت

مندرجہ ذیل صورت میں دادا کے لیے مقاسمہ اور ثلث باقی دونوں یکساں ہوتے ہیں؛ ماں، دادا اور دو بھائی؛

اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور دادا کو ثلث باقی اور دو بھائیوں کو بچا ہوا،

اگر ہم میراث کو اٹھارہ حصے فرض کرلیں تو ماں کے حصے میں تین حصے آئیں گے اور پندرہ حصے باقی بچیں گے، اگر دادا کو پندرہ کا ایک تہائی دیں گے تو پانچ حصے ملیں گے، اگر مقاسمہ کی بنیاد پر دیں گے تو بھی اٹھارہ میں سے پانچ حصے ہی ملیں گے، چناں چہ اس صورت میں دادا کے لیے مقاسمہ اور ثلث ما بقی دونوں یکساں ہیں۔

مقاسمہ اور چھٹا حصہ برابر ہونے کی شکل

شوہر، دادی، دادا اور بھائی؛

شوہر کے لیے نصف، دادی کے لیے چھٹا حصہ، ان دونوں کو حصے دینے کے بعد میراث کا ایک تہائی بچتا ہے جو چھ حصوں میں سے دو حصے ہیں، اگر دادا کو مقاسمہ کی بنیاد پر دیا جائے گا تو اس کا حصہ چھ میں سے ایک بنتا ہے، اگر اس کو چھٹا حصہ دیا جائے تو بھی اتنا ہی ہوتا ہے، اس صورت میں مقاسمہ اور چھٹا حصہ دونوں یکساں بنتے ہیں۔

چھٹا اور ثلث ما بقی یکساں ہونے کی شکل

شوہر، دادا اور تین بھائی؛

شوہر کو نصف حصہ دینے کے بعد نصف بچے گا، اگر ہم وراثت کے چھ حصے بنائیں تو شوہر کو تین حصے ملیں گے اور تین حصے باقی بچیں گے، اگر ہم دادا کو چھٹا حصہ دیں گے تو اس کا حصہ ایک بنے گا، اگر ہم اس کو ثلث ما بقی دیں گے تو بھی چھ میں سے ایک حصہ بنے گا، چناں چہ اس صورت میں چھٹا حصہ اور ثلث ما بقی دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

چھٹا حصہ، ثلث ما بقی اور مقاسمہ یکساں ہونے کی صورت

شوہر، دادا اور دو بھائی؛

شوہر کے لیے نصف ہے اور دادا کو دو بھائیوں کے ساتھ نصف، اگر ہم میراث کے چھ حصے بنائیں اور دادا کو چھٹا حصہ دیں تو اس کا حصہ چھ میں سے ایک بنے گا، اگر ثلث ما بقی دیں تو بھی ایک حصہ بنے گا، اور مقاسمہ کی بنیاد پر دیں تو بھی اتنا ہی ملے گا۔

دادا کو چھٹے حصے سے کم نہیں ملتا

بھائیوں کے ساتھ دادا کا حصہ چھٹے حصے سے کم نہیں ہوتا ہے، اگر حصے داروں کو دینے کے بعد صرف چھٹا حصہ ہی بچے تو وہ دادا کو دیا جائے گا اور بھائیوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا، اس کی صورت یہ ہے:

دو بیٹیاں، ماں، دادا اور بھائی؛

اس صورت میں دو بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا اور ماں کو چھٹا حصہ، دادا بچا ہوا چھٹا حصہ لے گا اور بھائی کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

اگر حصے داروں کو دینے کے بعد چھٹے حصے سے کم باقی بچے تو بھی دادا اسماً چھٹا حصہ لے گا اور مسئلہ میں عول (اس کی تفصیلات آ رہی ہیں) ہوگا، اس کی صورت یہ ہوگی:

شوہر، دو بیٹیاں، دادا اور بھائی؛

شوہر کے لیے ایک چوتھائی اور دو بیٹیوں کے لیے دو تہائی، ان دونوں کو حصے دینے کے بعد چھٹے حصے سے کم بچتا ہے، چناں چہ دادا کو عول کی بنیاد پر چھٹا حصہ ملے گا، جس طرح دوسرے حصے داروں کو بھی عول کی بنیاد پر ان کا حصہ ملے گا، عول کی تفصیلات ان شاء اللہ اگلے صفحات میں آ رہی ہیں۔

عول کہتے ہیں اصل مسئلے کے حصوں میں زیادتی کو، اس سے ہر وارث کے حصے میں کمی واقع ہوتی ہے۔

اگر حصے داروں کو دینے کے بعد میراث میں کچھ نہ بچے تو بھی میراث میں دادا کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور اس مسئلہ میں عول ہوگا اور بھائی محروم ہو جائے گا۔

اس کی شکل یہ ہے: دو بیٹیاں، شوہر، ماں، دادا اور بھائی؛

بیٹیوں کو دو تہائی، شوہر کو ایک چوتھائی، ماں کو چھٹا حصہ اور دادا کو چھٹا حصہ اور بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں، اس مسئلہ میں بھی عول ہوتا ہے، چناں چہ ہر وارث اپنا حصہ عول کی بنیاد پر لے گا۔

ہم نے پہلے یہ بات بتادی ہے کہ دادا کو حقیقی یا علاتی بھائی بہن کے ساتھ حکم میں بھائی مان لیا جائے گا جو عورتوں کو عصبہ بناتا ہے اور دادا کے لیے بہتر ہوتو وہ دوعورتوں کے بقدر حصہ لیتا ہے، لیکن ایک حالت میں وہ بھائیوں کے مخالف ہوتا ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ ماں اور بھائی ہوتو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی ملتا ہے، چھٹا حصہ نہیں، اگر دادا کی جگہ بھی بھائی ہوتا یعنی دو بھائی ہوتے تو ماں کو چھٹا حصہ ملتا۔

کیوں کہ دو بھائی ماں کو ایک تہائی سے محجوب کر کے چھٹے حصے کے حق دار بناتے ہیں، لیکن دادا اور بھائی ماں کو محجوب کر کے چھٹے حصے کا حق دار نہیں بناتے ہیں، کیوں کہ اس صورت میں دادا بھائی کے مشابہ نہیں ہے بلکہ اس کے مخالف ہے۔

اسی طرح یہ مسئلہ بھی ہے: بیوی، ماں، دادا، بہن؛

بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا، ماں کو مکمل ایک تہائی اور باقی میراث کو دادا اور بہن میں مقاسمہ کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا، دادا کو بہن کے دوگنا حصہ ملے گا۔

دادا کے ساتھ حقیقی اور علاتی بھائی ہوں

کبھی مسئلہ میں دادا کے ساتھ حقیقی بھائی اور علاتی بھائی رہتے ہیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی حصے دار وارث ہو یا نہ ہو، اس مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ حقیقی بھائیوں کے ساتھ علاتی بھائیوں کو بھی شمار کیا جائے گا تا کہ وہ دادا کے حصے کو کم کرے، پھر حقیقی بھائی علاتی بھائیوں کو محجوب کردیں گے، جس طرح دادا کی غیر موجودگی میں بھی علاتی بھائی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں محجوب ہوجاتے ہیں، ان مسائل کو "**مسائل المعادة**" کہا جاتا ہے۔

اس کی مثال: دادا، حقیقی بھائی، علاتی بھائی؛

اس مسئلہ میں حقیقی بھائی کے ساتھ علاتی بھائی کو بھی شمار کیا جائے گا، جس سے دادا کو نصف ملنے کے بجائے ایک تہائی مقاسمہ کی بنیاد پر ملے گا، پھر حقیقی بھائی کی وجہ سے علاتی بھائی محجوب ہوجائے گا، کیوں کہ وہ رشتے داری میں علاتی سے زیادہ طاقت ور ہے، پھر وہ اپنا حصہ لے گا۔

یہی صورت اس مسئلہ میں بھی ہے جب دادا اور بھائیوں کے ساتھ کوئی حصے دار

وارث موجود ہو، اس کی صورت یہ ہے: دادا، بیوی، حقیقی بھائی اور علاتی بھائی؛

بیوی کو ایک چوتھائی دیا جائے گا، اور علاتی بھائی کو حقیقی بھائی کے ساتھ شمار کیا جائے گا، دادا کو ثلث باقی ملے گا کیوں کہ مقاسمہ کی صورت میں بھی اتنا ہی ملتا ہے، پھر باقی میراث حقیقی بھائی کو دی جائے گی اور علاتی بھائی کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

اگر دادا کے ساتھ حقیقی بہن یا بیٹی ہوں اور علاتی بھائی یا بہنیں ہوں تو بھی یہی حکم ہے کہ حقیقی بہن یا بہنوں کے ساتھ علاتی بھائیوں اور بہنوں کو شمار کیا جائے گا۔

لیکن یہاں معاملہ اوپر بیان کردہ معاملے سے مختلف ہے، یہاں ایک بہن ہو تو نصف لے گی اور دو ہوں تو دو تہائی، اگر اس کے بعد کچھ بچے تو علاتی بھائیوں اور بہنوں کو ملے گا، اگر باقی نہ بچے تو علاتی بھائیوں اور بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

اس مسئلہ کی مثال کہ حقیقی بہنوں کو دینے کے بعد علاتی بھائیوں اور بہنوں کو کچھ نہیں بچتا ہے یہ ہے: دادا، دو حقیقی بہنیں، علاتی بھائی؛

اس مسئلہ میں دادا کو ایک تہائی ملے گا، مقاسمہ کی صورت میں بھی اتنا ہی ملتا ہے، اس کے بعد دو تہائی باقی رہتا ہے، اور علاتی بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں ملتا ہے، کیوں کہ اس کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں ہے، حقیقی بہنیں دو تہائی لے لیتی ہیں۔

دوسری مثال: بیوی، دادا، حقیقی بہن، دو علاتی بھائی؛

اس مسئلہ میں بیوی کو ایک چوتھائی، دادا کے لیے بہتر اور مفید ثلث باقی ہے، ایک چوتھائی اور ثلث باقی کے بعد آدھا مال بچتا ہے، حقیقی بہن کو حصے کی بنیاد پر آدھا مال ملے گا اور علاتی بھائیوں کو کچھ بھی نہیں۔

دادا کے حصے کے بعد حقیقی بہن کو میراث کے آدھے مال سے کم بچے تو اس کو پورا مال ملے گا اور علاتی بھائیوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کی مثال: شوہر، دادا، حقیقی بہن، دو علاتی بھائی؛

شوہر کو نصف، جب دو علاتی بھائیوں کو دادا کے خلاف بہن کے ساتھ شمار کیا جائے تو

اس صورت میں دادا کے لیے بڑا حصہ چھٹا ہے یا ثلث مالِ باقی، شوہر کو نصف اور بچے ہوئے مال کا ایک تہائی یا چھٹا حصہ دینے کے بعد بچی ہوئی میراث حقیقی بہن کو ملے گی، جو نصف سے کم ہے، دو علاتی بھائی محروم ہو جائیں گے، کیوں کہ میراث میں سے ان دونوں کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے۔

اگر ایک حقیقی بہن یا ایک سے زائد حقیقی بہنوں کو حصہ دینے کے بعد کچھ بچے تو اس کو علاتی بھائی لیں گے۔

اس کی مثال چار زیدی مسائل ہیں جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، یہ چار مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ایک ''**مسألة عشرية**'' ہے، کیوں کہ اس میں دس حصے بنتے ہیں؛ دادا، حقیقی بہن، علاتی بہن؛

اس مسئلہ میں دادا کے لیے بڑا حصہ مقاسمہ کی بنیاد پر ملتا ہے، چناں چہ اس کو دو حصے ملیں گے اور علاتی بھائی کو بھی دو حصے ملیں گے، حقیقی بہن کو ایک حصہ ملے گا، لیکن حقیقی بہن علاتی بھائی کے حصے کو چھین لے گی جب کہ اس کو دادا کے خلاف بھائیوں میں شمار کیا جائے گا، اس کے بعد بہن کو نصف میراث دینے کے بعد بچا ہوا مال ہی علاتی بھائی کو دیا جائے گا۔

۲۔ ''**مسألة عشرينية**''، کیوں کہ اس میں بیس حصے بنتے ہیں؛

دادا، حقیقی بہن اور دو علاتی بہنیں؛

اس مسئلہ میں دادا کے لیے مقاسمہ بہتر ہے، چناں چہ اس کو مقاسمہ کی بنیاد پر وراثت دی جائے گی، دادا کے خلاف دو علاتی بہنوں کو حقیقی بہن کے ساتھ شمار کرنے کے بعد وہ نصف لے گی اور باقی بچا ہوا دو علاتی بہنوں کو ملے گا، اگر ہم اس مسئلہ میں بیس حصے مان لیں تو دادا کو آٹھ حصے ملیں گے اور حقیقی بہن کے حصے بارہ ہوں گے، اس کے بعد دو حصے باقی بچیں گے، ہر علاتی بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

۳۔ ''**مختصرة زيد**'' اس مسئلے کو اسی نام سے جانا جاتا ہے۔

ماں، دادا، حقیقی بہن، علاتی بھائی اور علاتی بہن؛

ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ ایک سے زائد بھائی بہن ہیں، اور دادا کے لیے اس مسئلہ میں چھٹا حصہ اور ماں کو دینے کے بعد باقی بچی ہوئی میراث میں ایک تہائی دونوں یکساں ہیں، چناں چہ وہ ثلث باقی لے گا، حقیقی بھائی کے ساتھ علاتی بھائی اور بہن کو دادا کے خلاف شمار کیا جائے گا پھر حقیقی بہن نصف لے گی اور باقی بچا ہوا علاتی بھائی اور بہن کو مرد کے لیے دو حصوں کے بقدر دیا جائے گا۔

اگر اس مسئلہ میں ۵۴ حصے مان لیے جائیں تو ماں کو نو حصے ملیں گے جو چھٹا حصہ ہے، دادا کے لیے ۱۵ حصے ہوں گے جو ثلث باقی ہے، حقیقی بہن کے ساتھ علاتی بھائی اور بہن کو شمار کرنے کے بعد اس کو ۲۷ حصے ملیں گے جو میراث کا نصف حصہ ہے، اس کے بعد تین حصے بچتے ہیں جن میں دو حصے علاتی بھائی کو اور ایک حصہ علاتی بہن کو ملے گا۔

۴۔ ”**تسعینیة زید**“، کیوں کہ اس میں ۹۰ حصے بنتے ہیں؛

ماں، دادا، حقیقی بہن، دو علاتی بھائی، علاتی بہن؛

ماں کو چھٹا حصہ، دادا کو ماں کا حصہ دینے کے بعد ثلث باقی دیا جائے گا، کیوں کہ یہ مقاسمہ اور چھٹے حصے سے بہتر ہے، علاتی بھائیوں اور بہن کو حقیقی بہن کے ساتھ شمار کیا جائے گا، پھر حقیقی بہن کو نصف ملے گا اور باقی علاتی بھائیوں اور بہن کو دیا جائے گا، اگر ہم اس مسئلہ کو ۹۰ حصے مان لیں تو ماں کو ۱۵ حصے ملیں گے، دادا کو ۲۵ حصے ملیں گے جو ثلث باقی ہے، حقیقی بہن کو ۴۵ حصے ملیں گے جو میراث کا نصف ہے، ان سب کے بعد پانچ حصے بچتے ہیں، ہر علاتی بھائی کو دو دو حصے اور علاتی بہن کو ایک حصہ۔

مسئلہ اکدریہ

علماء نے کہا ہے: بہن کو چاہے حقیقی ہو یا علاتی ''مسائل معادّۃ'' جن کا تذکرہ ابھی گزرا ہے، کے علاوہ میں دادا کے ساتھ حصہ نہیں دیا جائے گا، سوائے مسئلہ اکدریہ میں۔

اس مسئلہ کی صورت یہ ہے:

شوہر، ماں، بہن (حقیقی یا علاتی)، دادا؛

اس مسئلہ میں شوہر کو نصف ملے گا جو اس کا حصہ ہے، ماں کو ایک تہائی ملے گا جو اس کا حصہ ہے، ان حصوں کو دینے کے بعد چھٹا حصہ بچتا ہے، اس حصے کو دادا کو دیا جانا چاہیے، کیوں کہ اس کا حصہ چھٹے حصے سے کم نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد بہن کو محروم ہو جانا چاہیے، کیوں کہ اس کے لیے کچھ باقی ہی نہیں بچا ہے، اس سلسلے میں اس کی شان حقیقی بھائی کی طرح ہے، اگر وہ حقیقی بہن کی جگہ ہوتا تو وہ بھی محروم ہو جاتا۔

لیکن شوافع علماء نے اس مسئلہ میں بہن کو نصف مقرر کیا ہے، کیوں کہ دادا کی وجہ سے اس کا عصبہ ہونا باطل ہو جاتا ہے اور کوئی اس کو محجوب بنانے والا بھی نہیں، البتہ انھوں نے اس کے بعد خیال کیا کہ اس کے حصے کو دادا کے حصے کے ساتھ ملایا جائے پھر دونوں کے درمیان دونوں کے حصے کو تقسیم کیا جائے، بہن کے لیے ایک تہائی اور دادا کے لیے دو تہائی، ان دونوں کے درمیان عصبہ بننے کے اصول کو اپناتے ہوئے علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ بہن کو دادا کے تین گنا زیادہ حصہ نہ ملے، یہ نا ممکن ہے، کیوں کہ میت کی طرف منسوب ہونے میں دونوں کا درجہ ایک ہی ہے، علماء نے یہ حکم دونوں کی رعایت رکھتے ہوئے کیا ہے۔

اس کے مطابق شوہر کو نصف دیا جائے گا اور ماں کو ایک تہائی اور دادا کو چھٹا حصہ اور بہن

کو نصف، ان حصوں کی وجہ سے مسئلہ میں عول ہوتا ہے اور اس کے حصوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

چناں چہ شوہر کو نصف یعنی تین حصے، ماں کو ایک تہائی یعنی دو حصے، دادا کو چھٹا حصہ یعنی ایک حصہ، بہن کو نصف یعنی تین حصے، اس طرح کل نو حصے ہوتے ہیں، پھر دادا اور بہن کے حصوں کو ملا کر دونوں میں مقاسمہ کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا، چناں چہ چار حصے ان دونوں کے درمیان مرد کے لیے عورت کے دوگنا حصے کے اصول کے مطابق تقسیم کیے جائیں گے، جب ہم مسئلہ ۲۷ سے بناتے ہیں تو شوہر کو عول کے ساتھ آدھا ملے گا جو نو حصے بنتے ہیں، ماں کو عول کے ساتھ ایک تہائی ملے گا جو چھ حصے بنتے ہیں، بارہ حصے باقی بچتے ہیں، چار بہن کو اور آٹھ دادا کو ملیں گے۔

خنثیٰ مشکل کی وراثت

خنثیٰ مشکل کی تعریف

خنثیٰ مشکل اس شخص کو کہتے ہیں جس میں مردانہ عضو تناسل بھی ہو اور زنانہ عضو مخصوص بھی، یا ایسا سراخ ہو جس سے پیشاب نکلتا ہو اور وہ مرد اور عورت میں سے کسی کے عضو مخصوص کے مشابہ نہ ہو۔

مخنث کی قسمیں

مخنث کی دو قسمیں ہیں: مخنث مشکل اور مخنث غیر مشکل۔

مخنث غیر مشکل وہ ہے جس میں مردانہ یا زنانہ دو میں سے ایک صفت راجح ہو، مثلاً کسی کی شادی ہو جائے اور اس کو اولاد ہو جائے تو وہ قطعی طور پر مرد ہے، یا اس کی شادی ہو جائے اور وہ حاملہ ہو جائے تو وہ یقینی طور پر عورت ہے۔

مخنث مشکل وہ ہے جس کی مردانگی یا زنانہ پن واضح نہ ہو، فقہاء نے مخنث میں ایسی علامتوں اور نشانات کا تذکرہ کیا ہے جن سے اس کی مردانگی یا زنانہ پن راجح ہوتا ہے، چاہے بلوغت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

مثلاً اگر مخنث کو منی آئے تو یہ بات واضح ہے کہ وہ مرد ہے، اگر حیض آئے تو وہ عورت ہے۔

اگر اس کا میلان عورتوں کی طرف ہو تو راجح یہ ہے کہ وہ مرد ہے، اگر اس کا میلان مردوں کی طرف ہو تو راجح یہ ہے کہ وہ عورت ہے۔

آج جب کہ فنِ طب نے بڑی ترقی کی ہے، کسی کے خنثیٰ مشکل ہونے کا احتمال بہت ہی کم ہے، آج طب کے ذریعے مخنث کے معاملے کا انکشاف کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

اگر ڈاکٹر مخنث کی تعیین کرنے سے عاجز آجائیں تو اس کو مخنث مشکل مانا جائے گا۔

وراثت میں خنثی مشکل کا حکم

اگر خنثی مشکل ہو تو نہ وہ باپ بنتا ہے اور نہ ماں، اور نہ دادا اور نہ دادی، اگر وہ ان میں سے کوئی ہوتا تو واضح ہو جاتا، جب کہ ہم نے اس کو خنثی مشکل مان لیا ہے۔

اسی طرح نہ وہ بیوی بنتا ہے اور نہ شوہر، کیوں کہ جب تک خنثی مشکل ہے اس کی شادی صحیح نہیں ہے۔

اسی وجہ سے خنثی مشکل کی چار جہتیں بنتی ہیں:

بیٹا، بھائی، چچا اور غلام کو آزاد کرنے والا۔

ا۔ خنثی مشکل کو مرد یا عورت ماننے کی صورت میں حصے میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو تو ترکہ کی تقسیم اسی کے مطابق کی جائے گی جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

اس کی صورت یہ ہے کہ وارثین میں سے مندرجہ ذیل افراد ہوں:

ماں، حقیقی بھائی، خنثی مشکل اخیافی بھائی؛

اس صورت میں ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی گویا اس میں خنثی ہے ہی نہیں، کیوں کہ مخنث کا مرد یا عورت ہونے میں حصہ نہیں بدلتا ہے، چناں چہ ہر حال میں اس کو چھٹا حصہ ہی ملتا ہے، کیوں کہ اخیافی بھائی ہو یا بہن؛ اس کو چھٹا حصہ ہی ملتا ہے۔

ایک سے زائد بھائی یا بہنیں نہ ہونے کی وجہ سے ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، باقی بچے ہوئے کو حقیقی بھائی عصبہ بن کر لے گا۔

ب: اگر خنثی مشکل کو مرد یا عورت ماننے کی صورت میں وہ وارث بنتا ہو اور دوسرا ماننے کی صورت میں وارث نہ ہوتا ہو تو اس کو ترکہ میں سے کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، بلکہ اس کے مرد یا عورت ہونے تک یا وارثین کے ساتھ صلح ہونے تک روک کر رکھا جائے گا۔

اسی طرح اگر وارثین اس کو مرد یا عورت ماننے کی صورت میں وارث ہوتے ہوں تو ان کو بھی ترکہ میں سے کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔

اگر میت کی بیوی، چچا اور خنثیٰ مشکل بھتیجا ہو، تو اس مسئلہ میں بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ خنثیٰ کے مرد یا عورت ہونے سے اس کے حصے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، دونوں صورتوں میں بیوی کو ایک چوتھائی ہی ملتا ہے، کیوں کہ میت کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

البتہ چچا کو اس وقت کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ بھتیجے کا مرد ہونے کا امکان ہے، اس صورت میں چچا محجوب ہو جاتا ہے۔

مخنث بھتیجے کو بھی کچھ نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ اس کے عورت ہونے کا احتمال ہے، اس صورت میں وہ وارث نہیں بنتی ہے، کیوں کہ چچا کی موجودگی میں بھتیجی محجوب ہو جاتی ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس مسئلہ میں چار میں سے تین حصوں کو روک کر رکھا جائے گا، اگر معلوم ہو جائے کہ مخنث مرد ہے تو یہ حصے اس کو دیے جائیں گے، اگر عورت ہو تو یہ حصے چچا کو دیے جائیں گے۔

۳۔ اگر مخنث کے مرد یا عورت ہونے سے اس کا حصہ بدلتا ہو، اسی طرح وارثوں کے حصے بھی بدلتے ہوں تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ مخنث اور اس کے ساتھ وارثین کو مخنث کے مرد اور عورت ہونے میں کم حصے اور نقصان کرنے والے حصے کے مطابق معاملہ کیا جائے گا، چناں چہ ہر ایک کو یقینی کم حصہ یقین پر عمل کرتے ہوئے دیا جائے گا اور باقی وراثت کو روک کر رکھا جائے گا، یہاں تک کہ مخنث مشکل کی حقیقت معلوم ہو جائے، جب معاملہ واضح ہو جائے تو باقی وراثت تقسیم کی جائے گی، یا وارثین آپس میں مصالحت کر لیں۔

اگر میت کا ایک بیٹا اور دوسرا مخنث مشکل ہو تو مخنث کو مرد ماننے کی صورت میں دونوں کے درمیان میراث برابر برابر تقسیم کی جائے گی، ہر ایک کو بیٹا ہونے کی وجہ سے آدھا آدھا ترکہ ملے گا، اگر اس کو عورت مان لیا جائے تو مخنث کو ایک تہائی ملے گا اور بیٹے کو دو تہائی، چناں چہ مخنث کو عورت مان کر صرف ایک تہائی دیا جائے گا اور بیٹے کو آدھا دیا جائے گا، پھر بچے ہوئے چھٹے حصے کو روک دیا جائے گا، جب خنثیٰ مشکل کی حقیقت واضح ہو جائے گی تو مرد ہونے کی صورت میں اس کو باقی چھٹا حصہ دیا جائے گا، اگر عورت واضح ہو جائے تو باقی حصہ بیٹے کو ملے گا، اگر ویسی ہی صورتِ حال باقی رہے تو دونوں آپس میں مصالحت کر لیں گے۔

مفقود الخبر

مفقود الخبر کی تعریف

مفقود الخبر وہ شخص ہے جو اپنے علاقے سے غائب ہو جائے اور اس پر طویل مدت گزر جائے اور اس کی کوئی بھی خبر نہ ہو اور اس کے حالات سے کوئی واقفیت نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟

مفقود الخبر کے احکام ومسائل

مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے مفقود الخبر کے مختلف احکام ہیں:

۱۔اس کی بیوی کے اعتبار سے

۲۔اس کی ملکیت کے مال کے اعتبار سے

۳۔دوسروں کا وارث ہونے کے اعتبار سے

پہلی صورت میں مفقود الخبر کی بیوی کے لیے اس وقت تک دوسری شادی کرنا جائز نہیں ہے جب تک اس کی موت کا یقین نہ ہو جائے، کیوں کہ اصل حکم اس کا زندہ رہنا ہے اور وہ دوسرے کی بیوی اس وقت تک نہیں بن سکتی ہے جب تک کہ اس کی موت کا یقین نہ ہو جائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''مفقود الخبر کی بیوی کو آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے، چناں چہ وہ صبر کرے اور اس وقت تک نکاح نہ کرے جب تک وہ نہ آئے''۔یعنی اس کی موت کی خبر نہ آئے۔

اس طرح کی بات نبی اکرم ﷺ سے نقل کرہی کی جاتی ہے۔

دوسری صورت یعنی اس کے غائب ہونے سے پہلے یا اس مدت کے دوران نئی

املاک اوراس کی ملکیت کے مال کی نسبت یہ حکم ہے کہ اس کے مال میں سے کچھ بھی اس وقت تک تقسیم نہیں کیا جائے گا جب تک اس کی موت پر بینہ قائم نہ ہو یا اتنی مدت گزرجائے کہ عام طور پر آدمی اس سے زیادہ زندہ نہیں رہتا ہے، اس کی کوئی مدت متعین نہیں ہے، اس صورت میں قاضی اجتہاد کرے گا اوراپنے اجتہاد کی بنیاد پراس کی موت کا فیصلہ کرے گا۔

البتہ اس سے پہلے اس کے کسی مال میں تصرف کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اصل زندہ رہنا ہے، چناں چہ اس کا مال وراثت میں اس کی موت کا یقین ہونے سے پہلے تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

اگر قاضی اس کی موت کا فیصلہ کرے تو اس کا مال اس کی موت پر بینہ (دلیل) پائے جانے کی صورت میں یا اس کی موت کا فیصلہ آنے کے بعد وارثین کو دیا جائے گا، اگراس سے پہلے اس کے کسی رشتے دار کا انتقال ہو جائے چاہے ایک سکینڈ پہلے ہی کیوں نہ ہو تو وہ وارث نہیں بنے گا، کیوں کہ اس وقت مفقود الخبر کے زندہ رہنے کا جواز اور احتمال موجود ہے۔

تیسری صورت کا تعلق دوسروں کا وارث بننے سے ہے جن کا مفقود الخبر کے غائب رہنے کی مدت کے دوران انتقال ہو گیا ہو۔

وراثت میں مفقود الخبر کے احکام ومسائل

مفقود الخبر کو اس وقت تک زندہ مانا جائے گا جب تک اس کی موت پر بینہ قائم نہ ہو یا قاضی اتنی مدت گزرنے کے بعد اس کی موت کا فیصلہ نہ دے جتنی مدت کے بعد اس کے مرنے کا غالب گمان ہو جائے، چناں چہ اسی بنیاد پر اس کے جس کسی مورّث (جس کا وارث بنا جائے) رشتے دار کا انتقال ہو جائے تو اس کا حصہ نکالا جائے گا، یہاں تک کہ اس کے مرنے کا یقین ہو جائے۔

مفقود الخبر کے وارث ہونے اور اس کے ساتھ میت کے دیگر وارثوں کے وارث ہونے کے اعتبار سے اس کے احکام بڑی حد تک خنثی مشکل کے احکام کے ساتھ ملتے جلتے ہیں:

ا۔ مفقود الخبر کو زندہ یا مردہ ماننے کی صورت میں وارثین وارث ہوتے ہوں اور اس کی زندگی یا موت سے ان کے حصوں پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو تو ان کو مکمل حصہ دیا جائے گا اور

مفقود کے حکم کو دیکھا نہیں جائے گا کہ اس کو زندہ مانا جائے یا مردہ۔

اگر میت کی بیوی، باپ، بیٹا اور مفقود بھائی ہو تو سبھی وارثین کو ان کا حصہ دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں بھائی باپ اور بیٹے کی وجہ سے محجوب ہو جاتا ہے اور اس کے زندہ یا مردہ ہونے سے ان کے حصوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

چناں چہ بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا، باپ کو چھٹا اور بیٹا عصبہ بن کر بچا ہوا مال لے گا۔

اگر میت کی بیوی، بیٹا اور دوسرا مفقود بیٹا ہو تو بیوی اپنا حصہ لے گی جو میراث کا آٹھواں حصہ ہے، کیوں کہ مفقود کے زندہ یا مردہ ہونے سے اس کے حصے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے کیوں کہ میت کا دوسرا بیٹا موجود ہے، جہاں تک موجود بیٹے کا سوال ہے تو بیوی کو حصہ دینے کے بعد بچے ہوئے مال میں سے اس کو آدھا دیا جائے گا اور آدھا مفقود الخبر کا مان کر روکا جائے گا۔

۲۔ اگر وارثین میں ایسے بھی موجود ہوں جن کو مفقود کے زندہ یا مردہ ماننے کی صورت میں ان کو وراثت نہ ملتی ہو تو ایسے وارث کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ اس کے زندہ رہنے کا احتمال ہے۔

مثلاً کسی میت کا چچا اور مفقود الخبر بیٹا ہو تو چچا اس صورت میں وارث نہیں ہوگا، کیوں کہ مفقود کو زندہ مان لیا جائے گا، جب کہ بیٹے کی موجودگی میں چچا محجوب ہو جاتا ہے، میت کا مال روکا جائے گا، جب حقیقت معلوم ہو جائے گی تو تقسیم کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر میت کی دو بیٹیاں، ایک پوتی اور مفقود پوتا ہو تو پوتی کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ مفقود کے مرنے کا احتمال ہے، اس صورت میں دو بیٹیوں کی وجہ سے پوتی محجوب ہو جاتی ہے، چناں چہ بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا اور ایک تہائی روک کر رکھا جائے گا یہاں تک کہ مفقود کے زندہ یا مردہ ہونے کا علم ہو جائے۔

۳۔ اگر مفقود کے زندہ رہنے یا انتقال کر جانے سے کسی وارث کا حصہ بدل جاتا ہو تو احتیاط کی بنیاد پر جو کم حصہ بنتا ہے وہ دیا جائے گا، اس کی شکل یہ ہے کہ میت کی ماں، ایک موجود بھائی اور دوسرا مفقود بھائی ہو تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، کیوں کہ

مفقود بھائی کے زندہ رہنے کا امکان ہے۔

اگر ہم ترکہ کو چھ حصے فرض کر لیں تو ماں کو ایک حصہ دیا جائے گا، کیوں کہ یہ اس کے حق میں کم سے کم حصہ ہے، موجود بھائی کو دو حصے ملیں گے جو اس کے حق میں کم سے کم حصہ ہے، اور تین حصوں کو روکا جائے گا، اگر معلوم ہو جائے کہ مفقود کا انتقال ہو گیا ہے تو ماں کو ان تین میں سے ایک حصہ دیا جائے گا اور موجود بھائی کو دو حصے دیے جائیں گے، اگر معلوم ہو جائے کہ مفقود زندہ ہے تو ماں کو ان تین حصوں میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا اور موجود بھائی نصف حصہ لے گا اور باقی ڈھائی حصے مفقود بھائی کے ہوں گے۔

اگر میت کے وارثین میں حمل بھی ہو تو میراث میں اس کا بھی حساب لگایا جائے گا، چناں چہ ترکہ میں اس کے حصے کو روک دیا جائے گا، یہاں تک کہ وضعِ حمل ہونے کے بعد اس کا زندہ یا مردہ ہونا واضح ہو جائے اور اس صورت میں دوسرے وارثین کے ساتھ نقصان دہ پہلو کے مطابق معاملہ کیا جائے گا یعنی حمل کی حیثیت زیادہ میراث لینے والے کی مان کر وارث کو کم سے کم حصہ جو بنتا ہے دیا جائے گا، کیوں کہ حمل موجود بھی رہ سکتا ہے اور وہ ضائع بھی ہو سکتا ہے، وہ زندہ بچے کی شکل میں بھی باہر آ سکتا ہے اور مردہ بچے کی شکل میں بھی، وہ مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی، حمل ایک بھی ہو سکتا ہے اور جڑواں بھی، چناں چہ ہر وارث کو اس کا یقینی حصہ دیا جائے گا اور باقی میراث کو حمل کے باہر آنے تک روک دیا جائے گا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ میت کی حاملہ بیوی ہو تو اس کو حاملہ نہ ماننے اور بچے کے مردہ پیدا ہونے کو ماننے کی صورت میں ایک چوتھائی حصہ ملے گا، اگر بچے کو زندہ مان لیا جائے چاہے بچے کو مرد مان لیا جائے یا عورت، ایک یا زیادہ تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا، اسی وجہ سے بیوی کو آٹھواں حصہ ہی دیا جائے گا، کیوں کہ اس کے حق میں یہی یقینی حصہ ہے اور باقی میراث کو حمل کے باہر آنے تک روک دیا جائے گا۔

اگر بچہ مرد پیدا ہو جائے تو باقی میراث اس کو ملے گی، کیوں کہ وہ عصبہ بنتا ہے، اگر عورت پیدا ہو جائے تو وہ نصف لے گی اور بیت المال منظم نہ ہو تو ردّ کی بنیاد پر اسی کو دیا

جائے گا، اگر بیت المال منظم ہو تو باقی میراث کا وارث بیت المال ہوگا، اگر حمل سے جڑواں بچے پیدا ہو جائیں، ایک مرد اور ایک عورت تو باقی میں سے مرد کو عورت کے دوگنا دے کر دونوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

ان تمام حالتوں میں بیوی کا حصہ تبدیل نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا حصہ آٹھواں ہی باقی رہتا ہے جب حمل زندہ باہر نکل آئے، اگر حمل کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ مردہ ہے یا مکمل طور پر باہر آنے سے پہلے مر جائے یا اس حال میں باہر آئے کہ اس میں منتقل زندگی نہ ہو تو یہ حمل کسی بھی چیز کا وارث نہیں ہوگا، کیوں کہ حمل کے وارث ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ زندہ باہر نکل آئے اور اس میں مستقل زندگی پائی جاتی ہو، اس صورت میں بیوی کو اس کا مکمل حصہ ایک چوتھائی دیا جائے گا، کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع یعنی بچہ یا بچی نہیں ہے اور باقی ذوی الارحام میں تقسیم کیا جائے گا، اگر بیت المال منظم نہ ہو، اگر منظم ہو تو باقی مال کا وارث بیت المال ہوگا۔

اگر میت کی حاملہ بیوی، باپ اور ماں ہو تو بیوی اور والدین کے حق میں سب سے نقصان دہ یہ ہے کہ حمل میں ایک سے زائد بچیاں مانی جائیں، تا کہ اس مسئلہ میں عول ہو جائے اور اس عول کی وجہ سے ان کا حصہ کم ہو جائے، چناں چہ بیوی کو عول کی بنیاد پر آٹھواں حصہ دیا جائے گا جو ۲۷ حصوں میں سے تین ہیں، باپ کو چھٹا حصہ عول کے ساتھ دیا جائے گا جو ۲۷ میں سے چار ہیں اور ماں کو بھی باپ کی طرح ہی دیا جائے گا۔

۱۶ حصے حمل کے باہر آنے تک روکے جائیں گے۔

حادثے میں مرنے والوں کی میراث

جب دو یا زائد ایسے افراد کسی اچانک حادثے مثلاً عمارے کے انہدام میں یا غرق ہو کر یا جل کر یا جنگ وغیرہ میں مر جائیں جو ایک دوسرے کے وارث بنتے ہوں اور معلوم نہ ہو کہ ان میں سے کون پہلے مرا ہے تو ان کی آپس میں وراثت تقسیم نہیں ہوگی، بلکہ میراث میں ان کے ساتھ اجنبی کی طرح معاملہ کیا جائے گا، گویا ان کے درمیان کوئی رشتے داری ہی

نہیں ہے اوران کے درمیان وراثت کا کوئی تعلق نہیں ہے، ان میں سے ہر ایک کے وارث اس کے دوسرے وارثین بنیں گے، کیوں کہ وراثت کی شرط یہ ہے کہ وارث بنانے والے (میت) کی موت کے بعد وارث کی زندگی کا یقین ہو، اور یہ شرط ان جیسے واقعات میں انتقال کرنے والوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

اگر دو حقیقی بھائی ڈوب کر یا جل کر مر جائیں اور معلوم نہ ہو کہ کس کا پہلے انتقال ہوا ہے اور ایک بھائی کی بیوی، بیٹی اور چچا ہو، دوسرے بھائی کی دو بیٹیاں اور چچا ہو، تو یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے، بلکہ پہلے بھائی کی میراث اس کے وارثین میں تقسیم کی جائے گی، چناں چہ بیوی کو آٹھواں حصہ، بیٹی کو نصف اور باقی بچا ہوا چچا کو ملے گا۔

دوسرے بھائی کی میراث بھی اس کے وارثوں میں تقسیم کی جائے گی، چناں چہ اس کی بیٹیوں کو دو تہائی اور باقی چچا کو ملے گا۔

یہ حکم اس وقت ہے جب وہ سب ایک ساتھ انتقال کر جائیں اور معلوم نہ رہے کہ کون پہلے مرا ہے یا معلوم ہو کہ سب کا انتقال ایک ساتھ ہوا ہے یا دونوں میں سے کسی ایک کے پہلے مرنے کا علم ہو لیکن کون پہلے مرا ہے یقینی نہ ہو۔

اگر ان میں سے کسی کے پہلے انتقال کا علم ہو جائے، لیکن پھر اس کو بھلایا جائے تو مال روکا جائے گا اور میراث اس وقت تک تقسیم نہیں کی جائے گی جب تک کون پہلے مرا ہے یاد نہ آجائے، کیوں کہ یاد آنے کا امکان ہے، یا وارث آپس میں مصالحت کر لیں۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زنا کی اولاد کا نسب اس کی ماں سے یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے، البتہ اس کے زانی باپ سے ثابت نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس شخص سے اس کا نسب غیر یقینی ہے، اور دینِ حنیف نے زنا کو مرد اور عورت کے تعلقات اور نسب کے ثابت ہونے کے لیے شرعی طریقہ نہیں مانا ہے، چناں چہ زنا کی اولاد اور اس کے زانی والد اور اس کے رشتے داروں کے درمیان وراثت آپس میں تقسیم نہیں ہوگی۔

جہاں تک اس کی ماں کا تعلق ہے تو اس کے اور زنا کی اولاد کے درمیان آپس میں

وراثت تقسیم ہوگی، اسی طرح ماں کے رشتے داروں اور اس بچے کے درمیان بھی وراثت بانٹی جائے گی۔

اگر زنا کی اولاد کا انتقال ہو جائے تو اس کی ماں اور ماں کے رشتے دار اس کے وارث بنیں گے، اور وہ بھی اپنی ماں اور اس کے رشتے داروں کا وارث بنے گا، کیوں کہ اس کی ماں کے ساتھ اس کی رشتے داری یقینی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

لعان کرنے والوں کی اولاد

بچے کی بنسبت لعان یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے بچے کے نسب کی اپنے سے نفی کردے، اس میں قسمیں کھائی جاتی ہیں جس کی تفصیلات لعان کے باب میں گزر چکی ہیں۔

لعان یہ ہے کہ شوہر چار مرتبہ یہ کہے: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس بات میں سچوں میں سے ہوں جو الزام میں نے بیوی پر زنا کا لگایا ہے اور یہ بچہ جس کو اس نے جنم دیا ہے وہ زنا کا ہے، یہ میرا نہیں ہے۔

وہ پانچویں مرتبہ یہ بات کہے: اگر زنا کے الزام لگانے اور خود سے بچے کی نفی کرنے میں میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اس لعان کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے: "**والذین یرمون المحصنات** ......" (نور۔۶۔۷)

جب لعان کا عمل مکمل ہو جاتا ہے اور بچے کی نفی ہو جاتی ہے تو اس بچے کا نسب اس شوہر سے منقطع ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں آپس میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہے اور اس بارے میں اس کا حکم اولادِ زنا کی طرح ہی ہے۔

البتہ اس کی ماں سے اس کا نسب یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور اس کے رشتے داروں کا وارث اور ماں اور اس کے رشتے دار اس بچے کے وارث بنتے ہیں۔

میراث میں علمِ حساب

ہم نے میراث کے باب کے شروع میں بتا دیا ہے کہ علمِ فرائض کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ میراثوں کی فقہ اور وہ علمِ حساب جو ترکہ میں سے ہر حق دار کے لیے متعین اور مخصوص حصے کو جاننے تک پہنچائے، اب تک ہم نے وراثت کے تعلق سے جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ اس کی فقہ ہے کہ حصے دار کون ہیں؟ عصبہ کون بنتے ہیں، حجب کیا ہے؟ وغیرہ علم فرائض کی اور بحثیں جن کا تعلق میراث کے فقہ سے ہے۔

اب ہم یہاں سے علمِ فرائض کی تعریف کے دوسرے حصے کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، وہ دوسرا حصہ علمِ حساب کا ہے، جس کے ذریعے ہم ہر حق دار کے حصے سے واقف ہوتے ہیں۔

حساب کی تعریف

لغت میں حساب کہتے ہیں شمار کرنے کو، اس کا مصدر "فُعلان" کے وزن پر "حُسبان" بھی آتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ" (رحمان ۵) یعنی دقیق حساب۔

علم حساب کے اصطلاحی معنی: ان اصولوں کی معرفت جن کے ذریعے عددی مجہولات کو نکالنے تک پہنچا جاتا ہے۔

علم فرائض میں حساب سے مراد مسائل کی اصل، تصحیح اور وارثوں کے درمیان وراثت کی تقسیم کو جاننا ہے۔

ہر مسئلہ کا اصل: وہ کم سے کم عدد ہے جس سے اس مسئلہ کا حصہ یا حصے صحیح بنتے ہیں۔

مسئلہ کی تصحیح: ہر وہ کم سے کم عدد جس سے وارثوں میں سے ہر ایک کا حصہ کسی کسر کے بغیر صحیح نکلتا ہے۔

مسائل کے اصل:

گذشتہ تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ اللہ تعالی کی کتاب میں مقررہ حصے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔نصف (۱/۲)

۲۔چوتھائی (۱/۴)

۳۔آٹھواں (۱/۸)

۴۔دوتہائی (۲/۳)

۵۔ایک تہائی (۱/۳)

۶۔چھٹا (۱/۶)

ان میں سے ہر حصے کا مخرج اس کا مسمی ہے۔

چناں چہ ایک تہائی کا مخرج ہے:۳

چھٹے حصے کا مخرج ہے:۶

چوتھائی کا مخرج ہے:۴

آٹھویں حصے کا مخرج ہے:۸

سوائے نصف کے، اس کا مخرج ہے:۲

اس پیش لفظ کے بعد ہم مسائل کے اصول کے بارے میں گفتگو شروع کرر ہے ہیں تا کہ میراث میں سے ہر وارث کے حصے کو کسر کے بغیر جان لیں۔

ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ ہر مسئلہ کا اصل وہ کم سے کم عدد ہے جس سے مسئلہ کا حصہ یا حصے کی تصحیح ہوتی ہے۔

یہ اس وقت ہے جب مسئلہ میں ایک حصے دار یا کئی حصے دار ہوں۔

اگر سبھی مرد ہوں اور وہ سب کے سب عصبہ بنتے ہوں تو میراث ان کے درمیان برابر تقسیم کی جائے گی اور ان کی جتنی تعداد ہے وہی مسئلہ کا اصل بن جائے گا، اگر مرد اور عورتیں

ہوں مثلاً دو بیٹے اور دو بیٹیاں تو ہر مرد کو دو شمار کیا جائے گا اور یہ ماننے کے بعد جتنی تعداد ہوگی وہی ان کے مسئلہ کی اصل بن جائے گا، اور اسی اصول کے مطابق ان کے درمیان مال تقسیم کیا جائے گا کہ مرد کو عورت کے دوگنا حصہ، اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان ہے:
"يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (نساء ۱۷۶) اللہ تم کو تمھاری اولاد کے سلسلے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لیے عورتوں کے حصے کے دوگنا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حصوں میں مسائل کے متفق علیہ اصول سات ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں: دو، تین، چار، چھ، آٹھ، بارہ، چوبیس۔

جس مسئلہ میں صرف چھٹا حصہ اور عصبہ ہو تو اس کی اصل چھ بنتی ہے، مثلاً:

۶

بیٹا	ماں
ع	۱/۶
۵	۱

ماں کا حصہ چھٹا ہے کیوں کہ وارث کا فرع (بیٹا بیٹی، پوتا پوتی) پایا جاتا ہے، اس وجہ سے وہ چھ میں سے ایک حصہ لے گی۔

اور بیٹا عصبہ بنتا ہے جو باقی حصے لے گا جو چھ میں سے پانچ ہیں۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ علماے علمِ میراث عصبہ کا اختصار (ع) لکھتے ہیں۔

دوسری مثال:

۶

باپ	بیٹا	ماں
۱/۶	ع	۱/۶
۱	۴	۱

اس مسئلہ کی تشریح گذشتہ مسئلہ کی طرح ہی ہے۔

اگر مسئلہ میں چھٹے حصہ (۱/۶) کے ساتھ نصف (۱/۲) یا ایک تہائی (۱/۳) یا دو تہائی (۲/۳) ہو اس کی اصل بھی چھ ہی ہوتی ہے، اس کی شکل مندرجہ ذیل ہے:

۶

ماں	بیٹی	چچا
۱/۶	۱/۲	ع
۱	۳	۲

ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، جو چھ میں سے ایک ہے، اور بیٹی کو نصف ملے گا جو چھ میں سے تین ہے اور عصبہ ہونے کی وجہ سے چچا باقی بچے ہوئے دو حصے لے گا۔

دوسری مثال:

۶

ماں	دو اخیافی بھائی	چچا
۱/۶	۱/۳	ع
۱	۲	۳

۶

ماں	دو بیٹیاں	چچا
۱/۶	۲/۳	ع
۱	۴	۱

جب مسئلہ میں نصف اور ایک تہائی ہو تو بھی اس کی اصل چھ سے ہوگی، اس کی مثال:

۶

شوہر	ماں	چچا
۱/۲	۱/۶	ع
۳	۱	۲

ان تمام مسائل کی اصل چھ بنتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس مسئلہ میں بھی چھٹا حصہ، یا چھٹا اور نصف، یا چھٹا اور ایک تہائی، یا چھٹا اور دو تہائی، یا چھٹا، نصف اور ایک تہائی ہو تو اس کی اصل چھ بنتی ہے۔

۔جس مسئلہ میں ایک چوتھائی (۱/۴) اور چھٹا حصہ (۱/۶) ہو تو اس کی اصل بارہ ہوتی ہے، اس کی شکل یہ ہے:

۱۲

شوہر	ماں	بیٹا
۱/۴	۱/۶	ع
۳	۲	۷

شوہر کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع ہے، اور ایک چوتھائی بارہ حصوں میں سے تین بنتا ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، جو جملہ حصوں میں سے دو ہے، اور باقی بچے ہوئے حصے بیٹے کو عصبہ ہونے کی وجہ سے ملے گا جو ۷ حصے ہیں۔

۔اگر ایک چوتھائی کے ساتھ ایک تہائی یا دو تہائی ہو تو اس کی اصل بھی ۱۲ بنتی ہے۔

چوتھائی کے ساتھ ایک تہائی کی مثال:

۱۲

شوہر	ماں	چچا
۱/۴	۱/۳	ع
۳	۴	۵

چوتھائی کے ساتھ دو تہائی کی مثال:

۱۲

شوہر	دو بیٹیاں	چچا
۱/۴	۲/۳	ع
۳	۸	۱

اس مسئلہ میں شوہر کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ میت کی دو بیٹیاں ہیں، اور بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا اور بچہ ہوا عصبہ ہونے کی وجہ سے چچا کو ملے گا۔

۔جس مسئلہ میں آٹھواں (۱/۸) اور چھٹا (۱/۶) ہو تو اس کی اصل چوبیس بنے گی، اس کی مثال یہ ہے:

۲۴

بیوی	ماں	بیٹا
۱/۸	۱/۶	ع
۳	۴	۱۷

۔جس مسئلہ میں نصف اور عصبہ ہو تو تو اس کی اصل دو بنے گی، مثلاً:

۲

شوہر	چچا
۱/۲	ع
۱	۱

اسی طرح جس مسئلہ میں نصف اور نصف ہو تو بھی اس کی اصل دو ہی بنے گی، مثلاً:

۲

حقیقی بہن	شوہر
۱/۲	۱/۲
۱	۱

۔جس مسئلہ میں ایک تہائی اور عصبہ ہو تو اس کی اصل تین بنے گی، مثلاً:

۳

چچا	ماں
ع	۱/۳
۲	۱

یا جس میں دو تہائی اور عصبہ ہو تو بھی اس کی اصل تین بنے گی، مثلاً:

۳

چچا	دو بہنیں
ع	۲/۳
۱	۲

۔جس مسئلہ میں ایک تہائی اور دو تہائی ہو تو بھی اس کی اصل تین بنے گی، مثلاً:

۳

دو علاتی بہنیں	دو اخیافی بہنیں
۲/۳	۱/۳
۲	۱

۔جس مسئلہ میں چوتھائی اور عصبہ ہو تو اس کی اصل چار بنے گی، مثلاً:

۴

شوہر	بیٹا
۱/۴	ع
۱	۳

جس میں چوتھائی اور نصف ہو تو بھی اس کی اصل چار بنے گی، مثلاً:

۴

شوہر	بیٹی	چچا
۱/۴	۱/۲	ع
۱	۲	۱

۔جس مسئلہ میں آٹھواں حصہ اور عصبہ ہو تو اس کی اصل آٹھ بنے گی، مثلاً:

۸

بیوی	بیٹا
۱/۸	ع
۱	۷

۔جس میں آٹھواں حصہ اور نصف اور باقی ہو تو بھی اس کی اصل آٹھ بنے گی۔ مثلاً:

۸

بیوی	بیٹی	چچا
۱/۸	۱/۲	ع
۱	۴	۳

مسائل کے اصول کی قسمیں:

مسائل کے سات اصولوں کی دو قسمیں ہیں:

ا۔جس میں عول ہوتا ہے، وہ مندرجہ ذیل اصول ہیں:

چھ(۶)، بارہ (۱۲) اور چوبیس (۲۴)

۲۔جس میں عول نہیں ہوتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

دو(۲)، تین (۳)، چار (۴) اور آٹھ(۸)

پہلی قسم میں عول ہونے اور دوسری قسم میں عول نہ ہونے کی دلیل مسائل کی کھوج اور تحقیق ہے، میراث کے مسائل کی کھوج کرنے کے بعد علماء نے اس کا فیصلہ کیا ہے۔

عول کی تعریف

لغت میں عول کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، اسی طرح یہ لفظ میلان اور ظلم وزیادتی اور حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: "ذٰلِکَ أَدْنىٰ أَلَّا تَعُوْلُوْا" (نساء:۳) یعنی یہ ظلم وزیادتی نہ کرنے کے زیادہ قریب ہے۔

عول کی اصطلاحی معنی اصل مسئلہ سے مجموعی حصوں کا بڑھ جانا ہے، جس سے میراث میں وارثوں کے حصوں میں کمی لازم آتی ہے۔

عول کے مشروع ہونے کی دلیل

مسائل میں عول نبی کریم ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوا ہے اور نہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں۔

عول کے بارے میں جس شخص نے سب سے پہلے فیصلہ کیا اور جن کے زمانے میں یہ مسئلہ پیش آیا وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔

ان کے زمانے میں ایک مسئلہ پیش آیا جس میں حصے زیادہ تھے اور اصل مسئلہ کم تھا، اس وجہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عول کا مشورہ دیا تو حضرت عمر نے اس کی موافقت کی اور فرمایا: "اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ تم میں سے کس کو اللہ نے مقدم کیا ہے اور کس کو موخر، میں اس

سے زیادہ بہتر چیز نہیں سمجھتا کہ میں مال کو تم میں حصوں کے بقدر تقسیم کروں"۔

چناں چہ حضرت عمر نے عول کی بنیاد پر ہر حق والے کا حق دیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مسئلہ میں ان کی موافقت کی، اور اسی کو جمہور علماء نے اختیار کیا ہے، ان میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، عول کی بہت سی مثالیں اگلے صفحات میں بیان کی جا رہی ہیں۔

وہ اصول جن میں عول ہوتا ہے اور کہاں تک عول ہوتا ہے؟

ہم نے بتا دیا ہے کہ چھ، بارہ اور چوبیس میں عول ہوتا ہے۔

چھ (۶) کا عول

چھ کا عول سات، آٹھ، نو اور دس تک ہوتا ہے۔

سات تک عول ہونے کی مثال:

۶ عول الی ۷

شوہر	دو حقیقی بہنیں
۱/۲	۲/۳
۳	۴

اس مسئلہ میں شوہر کو نصف (۳) ملے گا اور دو حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۴)، اصل مسئلہ چھ ہے اور اس میں حصے بڑھ کر سات ہو گئے ہیں۔

آٹھ تک عول ہونے کی مثال:

۶ عول الی ۸

شوہر	دو حقیقی بہنیں	ماں
۱/۲	۲/۳	۱/۶
۳	۴	۱

شوہر کے لیے نصف یعنی تین حصے ہیں اور حقیقی بہنوں کے لیے دو تہائی یعنی چار حصے ہیں

اور ماں کو چھٹا حصہ یعنی ایک ہے تو اصل مسئلہ چھ ہے اور اس میں حصے بڑھ کر آٹھ ہو گئے ہیں۔

نو تک عول ہونے کی مثال:

۶ عول الی ۹

شوہر	دو علاتی بہنیں	دو اخیافی بہنیں
۱/۲	۲/۳	۱/۳
۳	۴	۲

شوہر کے لیے نصف یعنی تین حصے، علاتی بہنوں کو دو تہائی یعنی چار حصے اور اخیافی بہنوں کو ایک تہائی یعنی دو حصے، اصل مسئلہ چھ ہے اور اس میں حصے بڑھ کر نو ہو گئے ہیں۔

دس تک عول ہونے کی مثال:

۶ عول الی ۱۰

شوہر	دو حقیقی بہنیں	دو اخیافی بہنیں	ماں
۱/۲	۲/۳	۱/۳	۱/۶
۳	۴	۲	۱

شوہر کو نصف (۳)، حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۴)، اخیافی بہنوں کو ایک تہائی (۲) اور ماں کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا، چناں چہ مسئلہ کی اصل چھ ہے اور حصے بڑھ کر دس ہو گئے ہیں۔

بارہ (۱۲) کا عول

بارہ کا عول تیرہ (۱۳)، پندرہ (۱۵) اور سترہ (۱۷) ہوتا ہے۔

۱۳ تک عول ہونے کی مثال:

۱۲ عول الی ۱۳

بیوی	دو حقیقی بہنیں	اخیافی بہن
۱/۴	۲/۳	۱/۶

۳	۸	۲

بیوی کو چوتھا حصہ (۳)، حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۸) اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ (۲) ملے گا، اصل مسئلہ ۱۲ ہے اور اس میں اضافہ ہوکر حصے ۱۳ بن گئے ہیں۔

۱۵ تک عول ہونے کی مثال:

۱۲ عول الی ۱۵

بیوی	دو حقیقی بہنیں	دو اخیافی بہنیں
۱/۴	۲/۳	۱/۳
۳	۸	۴

۱۷ تک عول ہونے کی مثال:

۱۲ عول الی ۱۷

بیوی	دو حقیقی بہنیں	دو اخیافی بھائی	ماں
۱/۴	۲/۳	۱/۳	۱/۶
۳	۸	۴	۲

بیوی کو چوتھا حصہ (۳)، حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۸)، اور اخیافی بھائیوں کو ایک تہائی (۴) اور ماں کو چھٹا حصہ (۲) ملے گا، اصل مسئلہ ۱۲ بنتا ہے اور حصے بڑھ کر ۱۷ بن جاتے ہیں۔

چوبیس (۲۴) کا عول

اس میں عول صرف ۲۷ تک ہوتا ہے، اس کی مثال:

۲۴ عول الی ۲۷

بیوی	دو بیٹیاں	باپ	ماں
۱/۸	۲/۳	۱/۶	۱/۶
۳	۱۶	۴	۴

بیوی کو آٹھواں حصہ (۳)، بیٹیوں کو دو تہائی (۱۶)، باپ کو چھٹا (۴) اور ماں کو چھٹا حصہ (۴) ملے گا، اصل مسئلہ ۲۴ ہے اور حصے بڑھ کر ستائیس ہو گئے ہیں۔

مسئلہ کی اصل معلوم کرنے کا طریقہ

مسائل کی اصل معلوم کرنے کا علمی طریقہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ مسئلہ میں سبھی مخارج ایک ہی قسم کے ہوں، مثلاً میت کا باپ، ماں اور بیٹا ہو تو باپ کو چھٹا حصہ اور ماں کو بھی چھٹا حصہ ملتا ہے۔

اس صورت میں کسی ایک کو لیا جائے گا اور اس کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے۔

۶

باپ	ماں	بیٹا
۱/۶	۱/۶	ع
۱	۱	۴

۲۔ مسئلہ میں مخارج ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہو، یعنی بعض حصے بڑے ہوں اور بڑا حصہ چھوٹے سے تقسیم ہوتا ہو مثلاً ایک تہائی (۱/۳) نصف (۱/۲) چھٹا حصہ (۱/۶)، اس صورت میں دو اور تین چھ میں داخل ہو جاتے ہیں یعنی چھ ان دونوں سے تقسیم ہوتا ہے۔

اسی طرح نصف (۱/۲) اور آٹھواں حصہ (۱/۸) ہے، اس صورت میں دو آٹھ میں داخل ہو جاتا ہے یعنی آٹھ دو سے تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس کو اصطلاح میں "تداخل" کہا جاتا ہے، تداخل کی صورت میں بڑے مخرج کو لیا جائے گا اور اسی کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا، مثلاً:

۶

دو علاتی بھائی	ماں	علاتی بہن
۱/۳	۱/۶	۱/۲
۲	۱	۳

دوسری مثال:

۸

بیوی	بیٹی	چچا
۱/۸	۱/۲	ع
۱	۴	۳

۳۔مسئلہ میں مخارج میں توافق ہو،توافق یہ ہے کہ سب مخارج ایک ہی عدد سے تقسیم ہوتے ہو،مثلاً چھٹا اور آٹھواں حصہ ہے،دونوں کے درمیان نصف کے ذریعے توافق ہے، کیوں کہ دونوں دو سے تقسیم ہوتے ہیں۔

توافق کی صورت میں دو میں سے ایک کا نصف کیا جائے گا اور دوسرے کے مکمل مخرج سے ضرب دیا جائے،اس سے جو حاصل نکلے گا اس کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا، مذکورہ بالا مثال میں آٹھ کے نصف کو مکمل چھ سے ضرب دیا جائے گا یا چھ کے نصف کو مکمل آٹھ سے ضرب دیا جائے گا،اس صورت میں حاصل ۲۴ نکلے گا، جو اس مسئلہ کی اصل ہوگا، اس کی مثال یہ ہے:

۲۴

ماں	بیوی	بیٹی	چچا
۱/۶	۱/۸	۱/۲	ع
۴	۳	۱۲	۵

اس میں مخرج دو چھ اور آٹھ میں داخل ہوجاتا ہے،اس لیے ہم دو کو چھوڑ دیں گے اور اس میں سے بڑے مخرج کو لیں گے۔

مخرج چھ اور آٹھ ایک دوسرے میں داخل نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ان دونوں میں توافق پایا جاتا ہے،یعنی دونوں دو سے تقسیم ہوتے ہیں،چناں چہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا نصف لیا جائے گا اور دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا،جو ما حاصل ہوگا وہ مسئلہ کی

اصل بنے گا، جیسا کہ سابقہ مسئلہ کی شکل میں واضح ہے۔

۴۔ مخارج میں تباین ہو، یعنی دونوں میں یکسانیت ومماثلت نہ ہو اور نہ دونوں ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہوں اور نہ دونوں میں توافق پایا جاتا ہو، مثلاً (۱/۴) اور (۱/۳)، ان دونوں مخارج میں تباین ہے، کیوں کہ یہ دونوں نہ مماثل ہیں اور نہ دونوں ایک دوسرے سے تقسیم ہوتے ہیں اور نہ دونوں کسی دوسری عدد سے تقسیم ہوتے ہیں۔

اس صورت میں ایک کے مکمل کو دوسرے کے مکمل سے ضرب دیا جائے گا، اور جو حاصل نکلے گا وہ مسئلہ کا اصل ہوگا۔

۱۲

بیوی	ماں	چچا
۱/۴	۱/۳	ع
۳	۴	۵

بیوی کے حصے ایک چوتھائی اور ماں کے حصہ ایک تہائی میں تباین ہے، اس لیے ایک کو دوسرے سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل نکلے گا وہ مسئلہ کی اصل بنے گا جیسے کہ اس مثال میں واضح ہے۔

مسائل کی تصحیح اور اس کا طریقہ

ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ مسئلہ کی تصحیح کا مطلب وہ کم سے کم عدد ہے جس سے وارثوں میں سے ہر ایک کا حصہ کسی کسر کے بغیر تقسیم ہوجائے:

اگر مسئلہ کی تصحیح اس کے اصل سے ہوتی ہو، یعنی وارثین میں سے ہر فریق کا حصہ ان کی تعداد کے مطابق تقسیم ہوتا ہو تو اس صورت میں مسئلہ کی اصل پر ہی اکتفا کیا جائے گا پھر اس میں تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر وارث کو اس کا حصہ مسئلہ کی اصل سے مکمل دیا جائے گا جب مسئلہ میں عول نہ ہو، اگر مسئلہ میں عول ہو تو ہر ایک حصہ کو عول کی بنیاد پر دیا جائے گا۔

مثلاً مسئلہ کی صورت مندرجہ ذیل ہو:

۱۲

۳بیویاں	ماں	۵چچا
۱/۴	۱/۳	ع
۳	۴	۵

اس مسئلہ کی اصل ۱۲ ہے، اس میں ایک چوتھائی کے مخرج یعنی چار کو ایک تہائی کے مخرج یعنی تین سے ضرب دیا جائے گا، کیوں کہ ان دونوں میں تباین پایا جاتا ہے، اس کا حاصل ۱۲ نکلتا ہے جو مسئلہ کی اصل بنے گا، یہ مسئلہ اپنی اصل سے صحیح ہوتا ہے، اس لیے وارثین میں سے ہر فریق کا حصہ ان کی تعداد کے مطابق کسر کے بغیر منقسم ہوجاتا ہے۔

بیویوں کو ایک چوتھائی تین حصے ملیں گے جو ان پر برابر برابر تقسیم ہوتا ہے، کیوں کہ ہر بیوی کو ایک ایک حصہ ملتا ہے۔

ماں کو ایک تہائی چار حصے ملیں گے۔

اور پانچ چچا کو عصبہ ہونے کی بنیاد پر باقی بچے ہوئے پانچ حصے ملیں گے جو ان پر تقسیم ہوتے ہیں، ہر چچا کو ایک ایک حصہ۔

اس طرح ہر مسئلہ اس کی اصل سے صحیح ہو رہا ہے، اس میں تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں تصحیح کرنے سے کسی فائدے کے بغیر مسئلہ کو طویل بنانا ہوگا، اسی طرح اگر مسئلہ میں عول ہو اور عول کے بعد وارثین میں حصے کسی کسر کے بغیر تقسیم ہوتے ہوں تو پھر اس میں تصحیح کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً:

۱۲عول الی ۱۷

۲دادیاں	۳بیویاں	۴اخیافی بہنیں	۸علاتی بہنیں
۱/۶	۱/۴	۱/۳	۲/۳
۲	۳	۴	۸

اس مسئلہ کی اصل ۱۲ ہے جس کو چار کے نصف یعنی دو کو سدس کے مخرج چھ سے ضرب دینے کے بعد حاصل کیا گیا ہے، کیوں کہ ان دونوں مخرج کے درمیان توافق پایا جاتا ہے جو نصف ہے، اور اس مسئلہ میں عول الی ۱۷ ہے۔

دو دادیوں کو عول کی بنیاد پر چھٹا حصہ ملے گا جو ۱۷ میں سے دو حصے ہیں، ہر دادی کو ایک حصہ۔

بیویوں کو عول کی بنیاد پر چوتھا حصہ ملے گا جو ۱۷ میں تین حصے ہیں، ہر بیوی کو ایک حصہ۔

اخیافی بہنوں کو عول کی بنیاد پر ایک تہائی حصہ ملے گا جو ۱۷ میں سے چار حصے ہیں، ہر ایک اخیافی بہن کو ایک حصہ۔

علاتی بہنوں کو عول کی بنیاد پر دو تہائی ملے گا جو ۱۷ میں سے ۸ حصے ہیں، ہر ایک علاتی بہن کو ایک ایک حصہ، علم میراث میں اس مسئلہ کو "أم الأرامل" کہا جاتا ہے۔

اگر ہر فریق کے حصے اصل مسئلہ یا اس کے عول سے ان کی تعداد کے مطابق صحیح طور پر کسر کے بغیر منقسم نہ ہوتے ہوں تو اس مسئلہ کی تصحیح ضروری ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ کی اصل کو اتنی کم سے کم عدد تک بڑھایا جائے جس سے وارثوں میں سے ہر فریق کا حصہ کسی کسر کے بغیر تقسیم ہو جائے۔

مسئلہ کی تصحیح مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق ہوتی ہے:

ا۔ مسئلہ میں کسر وارثین میں سے صرف ایک فریق میں ہوتا ہو، مثلاً:

اصل مسئلہ   عدد رؤوس   تصحیح

۶×   ۳=   ۱۸

ماں	باپ	تین (۳) بیٹے
۱/۶	۱/۶	ع
۱	۱	۴
۳	۳	۱۲

مسئلہ کی اصل چھ ہے، کیوں کہ مخارج یکساں اور مماثل ہیں، باپ کو چھٹا حصہ چھ میں سے ایک اور ماں کو بھی چھٹا حصہ چھ میں سے ایک، اور باقی بچے ہوئے چار حصے بیٹوں کو، یہ حصے تین بیٹوں میں کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے مسئلہ کی تصحیح کرنا ضروری ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس فریق کے حصوں اور ان کی تعداد کو دیکھیں گے، یا تو حصوں اور ان کی تعداد کے درمیان تباین ہوگا یا توافق ہوگا، یہاں تداخل اور مماثلت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیوں کہ ان صورتوں میں حصے برابر تقسیم ہو جاتے ہیں۔

اگر عدد رؤس (یعنی وارثوں کے ایک فریق کی تعداد) اور حصوں میں تباین ہو تو ہم اصل مسئلہ کو عدد رؤس سے ضرب دیں گے، اس کا جو بھی حاصل آئے گا وہ مسئلہ کی تصحیح ہوگا، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں ہے، ہم نے اصل مسئلہ چھ کو بیٹوں کے عدد رؤس تین سے ضرب دیا ہے (۶×۳=۱۸) جو مسئلہ کی تصحیح ہے۔

عدد رؤس کو جزء السہم (حصے کا جزء) کہا جاتا ہے۔

پھر ہم عدد رؤس کو وارثوں میں سے ہر فریق کے حصے سے ضرب دیں گے، اور اسی سے اس فریق کا حصہ اس کے عدد رؤس میں تقسیم کیا جائے گا۔

مذکورہ مسئلہ میں بیٹوں کے حصے چار ہیں جو ان پر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ہم اس کو عدد رؤس (جزء السہم) تین سے ضرب دیں گے، جس کا حاصل ۱۲ ہوتا ہے جو ان پر برابر برابر تقسیم ہو جاتا ہے، اس صورت میں ہر بیٹے کو ۴ حصے ملتے ہیں۔

اگر عدد رؤس اور حصوں میں توافق ہو تو ہم عدد رؤس کے وفق (وہ عدد جس سے دونوں عدد تقسیم ہوتی ہے اس کو وفق کہا جاتا ہے مثلاً ۶ اور ۱۵ دونوں تین سے تقسیم ہوتے ہیں تو ۳ کو وفق کہا جاتا ہے) کو لیں گے اور اس سے اصل مسئلہ کو ضرب دیں گے، جو حاصل ہوگا وہ مسئلہ کی تصحیح ہوگا۔

پھر ہم اس وفق کو وارثوں میں سے ہر ایک فریق کے حصے سے ضرب دیں گے تو وارثوں کے عدد رؤس پر برابر تقسیم ہو جائے گا۔

اصل مسئلہ　　عدد رؤوس　　تصحیح

×۶　　=۲　　۱۲

شوہر	دادی	۴ چچا
۱/۲	۱/۶	ع
۳	۱	۲
۶	۲	۴

اس مثال میں اصل مسئلہ چھ ہے کیوں کہ نصف اور سدس کے مخرج میں تداخل ہے، اس وجہ سے بڑے مخرج کو لیا جائے گا جو ۶ ہے اور اس کو اصل مسئلہ بنایا جائے گا۔

چھ میں سے شوہر کے تین حصے ہیں جو نصف ہے، دادی کا حصہ چھٹا ہے جو چھ میں سے ایک ہے، اور باقی بچے ہوئے دو حصے عصبہ کی بنیاد پر چچا کے ہیں، جو چار چچا پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اسی وجہ سے مسئلہ کی تصحیح ضروری ہے، چچا کے عدد رؤوس کے وفق ۲ کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا کیوں کہ عدد رؤوس اور حصوں میں توافق پایا جاتا ہے، پھر ہر عدد رؤوس یعنی وارثوں میں سے ہر فریق کے حصے کو وفق سے ضرب دیا جائے گا تو عدد رؤوس پر حصے تقسیم ہو جائیں گے۔

۲۔ مسئلہ میں ایک سے زیادہ فریق میں کسر پایا جاتا ہو یعنی دو، تین یا چار فریقوں کے عدد رؤوس اور حصے برابر تقسیم نہ ہوتے ہوں، یہ بات جاننا ضروری ہے کہ چار سے زیادہ فریق میں میراث کے مسائل میں کسر نہیں ہوتا ہے۔

اس صورت میں مسئلہ کی تصحیح کے لیے ہر فریق کے عدد رؤوس اور حصوں کو دیکھنا ضروری ہے، پھر تباین کی صورت میں ہر فریق کے عدد رؤوس یا توافق کی صورت میں اس کے وفق کو یاد رکھا جائے گا۔

پھر اس کے بعد ان محفوظ کردہ اعداد کے درمیان تماثل، تداخل، توافق اور تباین کو

دیکھیں گے، اگر تماثل پایا جائے تو ان میں سے کسی ایک کو لیں گے اور اس سے اصل مسئلہ کو ضرب دیں گے، اگر تداخل ہو تو ان میں سے بڑی تعداد کو لیں گے اور اس سے اصل مسئلہ کو ضرب دیں گے۔

اگر توافق ہو تو وفق کو لیں گے اور اس سے دوسری مکمل عدد سے ضرب دیں گے اور حاصل ضرب کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے۔

اگر تباین ہو تو عدد رؤوس کو ایک دوسرے سے ضرب دیں گے پھر حاصل کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے، اس طرح مسئلہ کی تصحیح ہوگی۔

ان صورتوں کو ہم مثالوں سے واضح کریں گے تا کہ مکمل وضاحت ہو جائے:

پہلی مثال: عدد رؤوس میں تماثل پایا جائے:

اصل مسئلہ ×۶ جزءالسہم ۵= تصحیح ۳۰

ماں	۱۵ اخیافی بھائی	۵ چچا
۱/۶	۱/۳	ع
۱	۲	۳
۵	۱۰	۱۵

اس مسئلہ میں دو فریق میں کسر پایا جاتا ہے؛ اخیافی بھائی اور چچا۔

مسئلہ کی اصل ۶ ہے، کیوں کہ دونوں مخارج میں تداخل ہے۔

ماں کا حصہ چھٹا (۱) ہے اور اخیافی بھائیوں کا حصہ ایک تہائی (۲) ہے جو ان پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اور چچا کو عصبہ کی بنیاد پر باقی بچے ہوئے ۳ حصے ملیں گے، یہ بھی ان پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد اخیافی بھائیوں کے حصوں اور ان کے عدد رؤوس کو دیکھا جائے گا، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں تباین پایا جاتا ہے تو ہم عدد رؤوس کو ہی لیں گے جو ۵ ہے اور اس کو یاد رکھیں گے۔

پھر چچا کے عدد رؤوس اور حصوں کو دیکھیں گے، ان کے درمیان بھی تباین ہے، اس لیے عدد رؤوس کو یاد رکھیں گے۔

پھر محفوظ کردہ اعداد کو دیکھیں گے، واضح ہے کہ ان دونوں کے درمیان تماثل ہے، کیوں کہ اخیافی بھائی بھی پانچ ہیں اور چچا بھی پانچ ہیں۔

ان میں سے کسی ایک کو لیں گے اور اس سے اصل مسئلہ (۶) کو ضرب دیں گے تو اس کا حاصل ۳۰ نکلے گا جو اس مسئلہ کی تصحیح ہے۔

پھر ہم اس عدد رؤوس کو جس کو جزء السہم بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بتادیا ہے وارثوں میں سے ہر فریق کے حصے سے ضرب دیں گے، اس طرح ہر فریق کے حصے ان کے عدد رؤوس پر برابر تقسیم ہوجائیں گے، جیسا کہ مذکورہ مثال میں واضح ہے۔

دوسری مثال: عدد رؤوس میں تداخل ہو:

اصل مسئلہ ×۶ — جزء السہم ۴= — تصحیح ۲۴

ماں	۴ اخیافی بھائی	۴ چچا
۱/۶	۱/۳	ع
۱	۲	۳
۴	۸	۱۲

مسئلہ کی اصل ۶ ہے کیوں کہ دونوں کے مخارج (۱/۶) اور (۱/۳) میں تداخل ہے۔

اس میں ماں کا حصہ ۱/۶ ہے جو چھ میں سے ایک بنتا ہے، اخیافی بھائیوں کا حصہ (۱/۳) ہے جو چھ میں سے دو بنتا ہے، یہ دو حصے چار بھائیوں پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، البتہ عدد رؤوس اور حصوں میں توافق ہے، اس وجہ سے ہم اس کے وفق ۲ کو لیں گے اور اس کو یاد رکھیں گے، باقی بچے ہوئے تین حصے عصبہ ہونے کی وجہ سے چچا کے ہیں، جو چار چچا پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان تباین ہے، اس لیے عدد

رؤوس کولیں گے اور یاد رکھیں گے۔

پھر چچا کے عدد رؤوس (۴) اور اخیافی بھائیوں کے وفق (۲) کو دیکھیں تو ہمیں تداخل نظر آئے گا، کیوں کہ ۲ کی تعداد ۴ میں داخل ہوجاتی ہے۔

اس وجہ سے بڑی عدد کولیں گے جو ۴ ہے اور اس سے مسئلہ کی اصل (۶) کو ضرب دیں گے، جس کا حاصل ۲۴ ہوتا ہے جو مسئلہ کی تصحیح ہوگا۔

پھر ہم جزء السہم (۴) کو ہر فریق کے حصوں سے ضرب دیں گے، جس کے نتیجے میں ہر فریق کے عدد رؤوس میں کسر کے بغیر تقسیم ہوجائے گا۔ جیسا کہ مثال سے واضح ہوتا ہے۔

تیسری مثال: عدد رؤوس میں توافق

اصل مسئلہ ×۶ — جزء السہم =۳۰ — تصحیح ۱۸۰

ماں	۱۵ اخیافی بھائی	۱۰ چچا
۱/۶	۱/۳	ع
۱	۲	۳
۳۰	۶۰	۹۰

اس مسئلہ کی اصل ۶ ہے، ماں کو چھٹا حصہ چھ میں سے ایک، اور بھائیوں کو ایک تہائی چھ میں سے دو حصے جو بھائیوں کے عدد رؤوس پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اور حصوں اور عدد رؤوس کے درمیان تباین ہے، اس لیے مکمل عدد رؤوس کو یاد رکھیں گے جو ۱۵ ہے، عصبہ کی بنیاد پر چچا کو باقی بچے ہوئے تین حصے ملیں گے جو دس چچا پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اور یہاں بھی حصوں اور عدد رؤوس کے درمیان تباین ہے، اس لیے عدد رؤوس (۱۰) کو یاد رکھیں گے۔

پھر اخیافی بھائیوں کے عدد رؤوس (۱۵) اور چچا کے عدد رؤوس (۱۰) کو دیکھا جائے تو پانچ سے توافق ہورہا ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک کے عدد رؤوس کا وفق لیں گے اور اس سے دوسرے کے مکمل عدد رؤوس سے ضرب دیں گے، اور حاصل ضرب کو اصل مسئلہ

سے ضرب دیں گے، جو حاصل ہوگا وہ مسئلہ کی تصحیح ہوگا۔

یعنی ہم مسئلہ کی اصل ۶ کو حاصل ضرب (۲×۱۵=۳۰) سے ضرب دیں گے جس کا حاصل (۱۸۰) ہوتا ہے جو مسئلہ کی تصحیح ہے، پھر ہم جزء السہم ۳۰ کو ہر وارث کے حصے سے ضرب دیں گے، جو ہر فریق کا حاصل ہوگا اور ان کے عدد رؤوس میں برابر تقسیم ہو جائے گا، جیسا کہ مذکورہ مثال میں واضح ہے۔

چوتھی مثال: عدد رؤوس میں تباین ہو:

تصحیح	جزء السہم	اصل مسئلہ
۳۶	=۶	×۶

۲چچا	۳اخیافی بھائی	ماں
ع	۱/۳	۱/۶
۳	۲	۱
۱۸	۱۲	۶

مسئلہ کی اصل ۶ ہے۔

ماں کا حصہ چھٹا ہے جو چھ میں سے ایک بنتا ہے، اخیافی بھائیوں کے دو حصے ہیں جو تین اخیافی بھائیوں پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے ہم عدد رؤوس ۳ کو یاد رکھیں گے، دو چچا کے لیے تین حصے ہیں جو ان پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے عدد رؤوس ۲ کو یاد رکھیں گے، پھر دونوں عدد رؤوس (۲) اور (۳) کو دیکھیں گے، ان میں تباین ہے، اس لیے دونوں کی کامل تعداد کو ایک دوسرے سے ضرب دیں گے (۲×۳=۶)، جس کا ماحصل ۶ بنتا ہے جو جزء السہم ہے، اس کو ہم اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے جو ۶ ہے (۶×۶=۳۶) یہ مسئلہ کی تصحیح ہے۔ پھر جزء السہم (۶) کو وارثوں میں سے ہر فریق کے حصے سے ضرب دیں گے، حاصلِ ضرب ہر فریق کا حصہ ہوگا جو ان کے عددِ رؤوس پر برابر تقسیم ہو جائے گا، جیسا کہ مثال سے واضح ہے۔

رد

ردکی تعریف

رد کے لغوی معنی لوٹنے،صرف کرنے اور قبول نہ کرنے کے آتے ہیں۔

اصطلاح میں رد کہتے ہیں مسئلہ کے حصوں میں کمی اور وارثین کے حصوں میں زیادتی کو،اس طرح یہ عول کی ضد ہے۔

جب بھی وارث اپنے حصوں کو لے لیں اور کوئی حصہ باقی بچے جس کا کوئی مستحق نہ ہوتو اس حصے کو وارثوں میں ان کے حق کے بقدر تقسیم کیا جائے گا،سوائے شوہر اور بیوی کے، ان پر ردّ نہیں ہوتا ہے۔

ردّ کا شرعی حکم

ہم نے یہ بات پہلے بتادی ہے کہ اگر بیت المال منظم ہو یعنی وہ حقوق کو حق داروں تک پہنچاتا ہو اور وراثت اس کے وارثوں میں تقسیم کرتا ہوتو اس صورت میں وارثوں پر بقیہ حصہ رد نہیں کیا جائے گا، بلکہ بقیہ کا وارث بیت المال ہوگا،اور اس کو ردّ اور ذوی الارحام (وارثین کے علاوہ دوسرے رشتے دار) پر مقدم رکھا جائے گا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:''جوکوئی بوجھ چھوڑے تو وہ میرے پاس آئے گا اور جوکوئی وراثت چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے،جس کا کوئی وارث نہیں تو میں اس کی طرف سے دیت دوں گا اور اس کا وارث بنوں گا''۔(ابوداود نے صحیح سند سے یہ روایت حضرت مقدام بن معد یکرب رضی اللہ عنہ سے کی ہے:الخراج والامارۃ ۲۹۵۶)

یہ بات معلوم ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے لیے کسی مال کے وارث نہیں بنتے ہیں، بلکہ وہ اس کو مسلمانوں کے مفادات اور مصالح میں خرچ کرتے ہیں۔

اسی کی بنیاد پر علماء نے بیت المال کے وارث ہونے کا فتویٰ دیا ہے اور اس کا مرتبہ وارثوں

کے بعد رکھا ہے، اگر کسی میت کا وارث نہ ہو اور کوئی حصے دار نہ ہو، یا حصے دار اپنے حصوں سے پوری میراث کے مستحق نہ ہوتے ہوں تو مکمل وراثت یا بچی ہوئی میراث بیت المال کا ہوگا۔

اگر بیت المال منظم نہ ہو تو اس کو میراث میں کوئی حق نہیں ہے۔

اس صورت میں بقیہ حصوں کو وارثوں پر ان کے حق کے مطابق رد کیا جائے گا، اگر کوئی بھی وارث نہ ہو تو اس کو ذوی الارحام میں تقسیم کیا جائے گا۔

یہ بات خیال میں رکھنی چاہیے کہ متاخر علماء نے بیت المال کے منظم نہ ہونے کا فتوی دیا ہے اور کہا ہے کہ عیسی علیہ السلام کے نزول تک اس کے منظم ہونے کا امکان نہیں ہے۔

ردّ کے مشروع ہونے کی دلیل

ذوی الارحام کی ایک دوسرے سے ولایت پر دلالت کرنے والی آیتوں میں عمومی اولویت سے ردّ کی مشروعیت پر دلیل دی جاتی ہے، اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ”وَأُوْلُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ“ (انفال ۷۵) اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اسی وجہ سے علماء نے میاں بیوی پر رد نہیں کیا ہے، کیوں کہ وہ دونوں آپس میں ذوی الارحام نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق سبب کی بنیاد ہے، جو موت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

ذوی الارحام کی وراثت کی دلیل حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جب انھوں نے اپنے دو تہائی مال کی وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو نبی ﷺ نے اس کو قبول نہیں کیا اور اس کو ایک تہائی کی طرف رد کر دیا اور آپ نے ان سے فرمایا: ”تم اپنے وارثین کو مالدار چھوڑو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تم ان کو فقیر چھوڑو کہ وہ لوگوں سے مانگتے پھریں“۔ (بخاری: الجنائز ۱۲۳۳، مسلم: الوصیۃ ۱۶۲۸) حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو بتایا کہ ان کی وارث صرف ایک بیٹی ہے، بیٹی کا حصہ معلوم ہی ہے کہ نصف ہے۔

اس روایت سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ بیٹی کو حصے سے زیادہ کا حق ہے جب اس کے ساتھ کوئی اور وارث نہ ہو، اور یہ صرف ردّ کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا مکمل

حصہ لینے کے بعد بچا ہوا لے۔

رڈ کی شرطیں

رڈ کی مندرجہ ذیل تین شرطیں ہیں:

۱۔میاں بیوی کے علاوہ میت کے وارثین میں سے کوئی حصہ لینے والا موجود ہو۔

۲۔حصے والوں کو دینے کے بعد میراث میں کچھ بچ جائے۔

۳۔وارثوں میں کوئی عصبہ بننے والا نہ ہو، کیوں کہ عصبہ وارث تنہا ہونے کی صورت میں پورے مال کا وارث بنتا ہے یا حصے داروں کو ان کا حصہ دینے کے بعد بچے ہوئے مال کا مستحق بنتا ہے، اس لیے عصبہ وارث کی موجودگی میں رڈ کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔

رڈ کا اصول

مسئلہ میں یا تو میاں بیوی میں سے کوئی ہوگا یا کوئی بھی نہیں ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ رڈ کے موضوع کی دو قسمیں ہیں:

۱۔پہلی حالت یہ کہ رڈ کے مستحق ہونے والوں کے ساتھ میاں بیوی میں سے کوئی نہ ہو:

اس صورت میں مندرجہ ذیل شکلیں سامنے آئیں گی:

أ: رڈ کا مستحق ہونے والا صرف ایک ہی شخص ہو، مثلاً میت کی صرف ایک بیٹی ہو تو اس کو پورا مال حصے اور رڈ کی بنیاد پر ملے گا۔

ب: اگر رڈ کے مستحق ایک سے زیادہ ہوں اور وہ ایک ہی صنف کے ہوں مثلاً کسی میت کی پانچ بیٹیاں ہوں تو مسئلہ ان کے عددِ رؤوس سے بنے گا اور ان میں مال برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

ج: اگر رڈ کے مستحق وارثین ایک سے زیادہ صنف کے ہوں تو ان کے جملہ حصوں کی تعداد مسئلہ کی اصل ہوگا: مثلاً

کسی شخص کا انتقال ہوجائے اور اس کی ماں، ایک حقیقی بہن اور ایک علاتی بہن ہو۔

۶ رڈالی ۵

ماں	حقیقی بہن	علاتی بہن
۱/۶	۱/۲	۱/۶
۱	۳	۱
۱	۳	۱

اس مسئلہ کی اصل ۶ ہے کیوں کہ مخارج میں تداخل پایا جاتا ہے، لیکن وارثین کے مجموعی حصے ۵ ہیں، اس لیے اس مسئلہ میں رڈالی ۵ کیا جائے گا اور ہر وارث اپنا حصہ ۵ میں سے حصہ اور رڈ کی بنیاد پر لے گا، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں دکھایا گیا ہے۔

دوسری حالت: یہ ہے کہ رد کے مستحق بننے والوں کے ساتھ میاں یا بیوی میں سے کوئی ایک ہو، اس صورت میں مندرجہ ذیل شکلیں سامنے آئیں گی:

سب سے پہلے ہم شوہر یا بیوی کو اس کا حصہ دیں گے، مسئلہ کی اصل شوہر یا بیوی کے مخرج کو بنائیں گے، جو ۲، ۴ یا ۸ ہے۔

پھر باقی بچا ہوا رد کے مستحق ہونے والوں میں مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق تقسیم کریں گے:

۱۔ اگر رد کا مستحق صرف ایک ہی شخص ہو تو بیوی یا شوہر کو دینے کے بعد وہ پورے مال کا مستحق بنے گا، مثلاً کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کی بیوی اور ایک بیٹی ہو۔

۸

بیوی	بیٹی
۱/۸	۱/۲
۱	۷

مسئلہ کی اصل ۸ ہوگی، بیوی کے لیے آٹھواں حصہ جو آٹھ میں سے ایک ہے اور باقی بچے ہوئے سات حصے بیٹی کو، چار حصے وراثت میں حصے کی بنیاد پر اور تین رڈ کی بنیاد پر۔

۲۔ اگر رد کے مستحق دو یا اس سے زیادہ افراد ہوں لیکن یہ ایک ہی فریق ہوں تو مسئلہ کی اصل شوہر یا بیوی کے مخرج کو بنایا جائے گا، اگر شوہر یا بیوی کو دینے کے بعد حصے عدد رؤوس پر کسر کے بغیر تقسیم ہوتے ہوں تو اس کو یوں ہی تقسیم کیا جائے گا، مثلاً کسی میت کی بیوی اور تین بیٹیاں ہوں۔

۴

شوہر	۳ بیٹیاں
۱/۴	۲/۳
۱	۳

مسئلہ کی اصل ۴ ہے جو شوہر کے حصے کا مخرج ہے، اس صورت میں شوہر کو ایک حصہ دیا جائے گا اور باقی تین حصے بیٹیوں کو ملیں گے، ہر بیٹی کو ایک حصہ وراثت کے حصے اور رد کی بنیاد پر ملے گا۔

اگر شوہر یا بیوی کو حصہ دینے کے بعد رد کے مستحق افراد میں باقی حصے برابر تقسیم نہ ہوتے ہوں تو اس مسئلہ میں سابقہ اصولوں کے مطابق تصحیح کرنا ضروری ہے۔

چناں چہ اصل مسئلہ کو عدد رؤوس سے ضرب دیا جائے گا جب عدد رؤوس اور حصوں میں تباین ہو۔ اگر عدد رؤوس اور حصوں میں توافق ہو تو اصل مسئلہ کو وفق سے ضرب دیا جائے گا۔

اصل مسئلہ ۸   جزء السہم ۳   تصحیح ۲۴

بیوی	۳ بیٹیاں
۱/۸	۲/۳
۱	۷
۳	۲۱

اس مسئلہ کی اصل ۸ ہے جو بیوی کے حصے کا مخرج ہے، بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا جو آٹھ میں سے ایک ہے، اور باقی بیٹیوں کو حصے اور رد کی بنیاد پر ملے گا، جو سات حصے ہیں،

وہ تین بیٹیوں پر برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں۔

اس لیے اصل مسئلہ کو بیٹیوں کے عددِ رؤوس سے ضرب دیا جائے گا، کیوں کہ ان دونوں میں تباین پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ کی تصحیح ۲۴ سے ہوگی، پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب زیادہ جائے گا جو ۳ ہے، اس کے نتیجے میں حصے عدد رؤوس پر برابر تقسیم ہو جائیں گے جیسا کہ اوپر کی شکل میں واضح ہے۔

توافق کی مثال:

اصل مسئلہ ۴ جزء السہم ۲ تصحیح ۸

شوہر	۶ بیٹیاں
۱/۴	۳/۴
۱	۳
۲	۶

اس مسئلہ کی اصل ۴ ہے جو شوہر کے حصے کا مخرج ہے، شوہر کو ایک چوتھائی یعنی چار میں سے ایک حصہ ملے گا اور باقی حصے میراث کے حصے اور ردّ کی بنیاد پر بیٹیوں کو ملیں گے جو ان پر کسر کے بغیر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، لیکن حصوں اور عدد رؤوس کے درمیان توافق ہے، اس لیے اس کا وفق نکالا جائے گا جو ۲ ہے، اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا تو تصحیح ۸ سے ہوگی، پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب دیا جائے گا، اس صورت میں حاصلِ ضرب عدد رؤوس پر برابر تقسیم ہو جائے گا، جیسا کہ مذکورہ شکل میں واضح ہے۔

۳۔ اگر رد کے مستحق ایک سے زیادہ فریق ہوں اور شوہر یا بیوی کو دینے کے بعد رد کے مستحقین میں کسر کے بغیر تقسیم ہو جاتا ہو تو ٹھیک ہے اور مسئلہ کی اصل شوہر یا بیوی کا مخرج ہوگا، مثلاً کسی میت کی بیوی، ماں اور دو اخیافی بھائی ہوں۔

۴

بیوی	ماں	۲/اخیافی بھائی
۱/۴	۱/۶	۱/۳
۱	۱	۲

مسئلہ کی اصل چار بنتی ہے جو بیوی کا مخرج ہے جو ردکی مستحق نہیں بنتی ہے اوراس کا حصہ چار میں سے ایک ہے۔

اس کے بعد تین حصے بچتے ہیں، ایک حصہ ماں اور دواخیافی بھائیوں کو دو حصے، ہر بھائی کوایک ایک۔

شوہر یا بیوی کو دینے کے بعد ردّ کے مستحقین پر باقی حصے برابر تقسیم نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں ردّ کے مستحقین کا الگ ہی مسئلہ بنائیں گے، پھران کے مسئلہ اور پہلے مسئلہ سے ان کے حصوں کو دیکھیں گے، اگر ان دونوں میں تباین ہوتو ردّ کے مسئلہ کو پہلے والے مسئلہ سے ضرب دیں گے، جو حاصل ہوگا وہ دونوں مسئلہ کا جامع اصل ہوگا، پھر شوہر یا بیوی کے حصوں کو جزءالسہم سے ضرب دیں گے جو ردّ کا مسئلہ ہے، اور ردّ کے مستحقین کے حصوں کو جزءالسہم سے ضرب دیں گے جو پہلے والے مسئلہ میں ردّ کے مستحقین کا حصہ ہے۔

مثلاً کسی میت کی بیوی، حقیقی بہن اور علاتی بہن ہوتو مسئلہ کی شکل مندرجہ ذیل ہوگی:

		جزءالسہم ۴	جزءالسہم ۳	جامع
		مسئلہ زوجیہ ۴	مسئلہ رد ۴	۱۶
۱/۴	بیوی	۱	۰	۴
۱/۲	حقیقی بہن	۳	۳	۹
۱/۶	علاتی بہن		۱	۳

یہ بات واضح ہے کہ ہم نے اس مسئلہ میں مسئلہ زوجیہ یعنی پہلے والے مسئلہ کو ردّ کے مسئلہ سے ضرب دیا تو اس کا مجموعہ ۱۶ ہوگیا۔

پھر ہم نے بیوی کے حصے کو جزءالسہم سے ضرب دیا جو مسئلہ رد ہے۔

پھر ہم ردّ کے مستحقین کے حصے کو جزءالسہم (۴) سے ضرب دیا جو مسئلہ زوجیت سے ان کا حصہ ہے۔

یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ردّ کے مستحقین کے مسئلہ اور مسئلہ زوجیت میں سے ان کے حصوں کے درمیان تباین پایا جاتا ہے۔

اگر ان کے مسئلہ اور مسئلہ زوجیت میں سے ان کے حصے کے درمیان مماثلت ہو تو مسئلہ زوجیت ہی دونوں مسئلوں کا جامع ہوگا، کیوں کہ مسئلہ زوجیت سے ردّ کے مستحقین کا حصہ ان پر برابر تقسیم ہو جاتا ہے، مثلاً کسی میت کی بیوی، ماں اور دو اخیافی بہنیں ہوں:

		مسئلہ زوجیہ	مسئلہ رد	جامع
		۴	۳	۴
۱/۴	بیوی	۱	۰	۱
۱/۶	ماں	۳	۱	۱
۱/۳	۲اخیافی بہن		۲	۲

کبھی رد کے مسائل میں تصحیح کی ضرورت پڑتی ہے، اس وقت تصحیح کی جائے گی پھر اس کے بعد سابقہ تفصیلات کے مطابق حصے تقسیم کیے جائیں گے، مثلاً:

		مسئلہ زوجیہ	مسئلہ رد	جامع	تصحیح
		۴	۳	۴	۱۲
۱/۴	بیوی	۱	۰	۱	۳
۱/۶	ماں	۳	۱	۱	۳
۱/۳	۳اخیافی بہن		۲	۲	۶

اس مسئلہ میں یہ بات واضح ہے کہ مسئلہ زوجیہ سے ردّ کے مستحقین کے حصے ان پر تقسیم

ہوتے ہیں، اسی وجہ سے مسئلہ زوجیہ کو ہی جامع بنائیں گے۔

لیکن اخیافی بہنوں کا جامع اصل سے ان کے عدد رؤوس پر تقسیم نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ان کی تعداد تین ہے اور حصے دو ہیں، اسی وجہ سے جامع اصل کی تصحیح کریں گے، اس طرح کہ جامع اصل کو اخیافی بہنوں کے عدد رؤوس سے ضرب دیں گے، کیوں کہ ان کے حصے ۲ ہیں جو ان کے عدد رؤوس کے ساتھ تباین ہے، اس لیے ان کے حصوں کو تصحیح کے بعد ان میں تقسیم کیا جائے، اس صورت میں ہر اخیافی بہن کو دو حصے ملیں گے۔

مناسخہ

مناسخہ کی تعریف

لفظ مناسخہ مصدر ہے،اس کو نسخ سے اخذ کیا گیا ہے، نسخ کے کئی معانی ہیں: زائل کرنا، تبدیل کرنا اور منتقل کرنا وغیرہ۔

شریعت میں نسخ کہتے ہیں کسی شرعی حکم کو کسی دوسرے حکم کے اس کی جگہ ثابت ہونے کی وجہ سے منسوخ کرنے کو، مثلاً نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کے حکم سے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم منسوخ ہوگیا۔

علمِ میراث کی اصطلاح میں مناسخہ یہ ہے کہ میت کے وارثین میں سے کسی ایک شخص یا چند افراد کا انتقال وراثت تقسیم کرنے سے پہلے ہوجائے،اس کو مناسخہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا والا مسئلہ دوسرے سے منسوخ ہوجاتا ہے یا اس میں مال ایک وارث سے دوسرے وارث کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

اس سے اصلاحی معنی کی لغوی معنی سے مناسبت معلوم ہوجاتی ہے۔

مناسخہ کے مسائل میں وراثت کی تقسیم

جب کسی شخص کا انتقال ہوجائے پھر اس کے وارثین میں سے کسی کا انتقال وراثت کے تقسیم ہونے سے پہلے ہوجائے تو مندرجہ ذیل اقدامات کرنا ضروری ہے:

۱۔پہلی میت کا مستقل مسئلہ بنایا جائے،جس میں اس کے وارثوں کو شمار کیا جائے اور ان میں سے ہر ایک کا حصہ وراثت کے اصولوں کے مطابق تحریر کیا جائے۔

۲۔اگر پہلے مسئلہ میں تصحیح کی ضرورت ہوتو اس کی مذکورہ اصولوں کے مطابق تصحیح کی جائے۔

۳۔دوسری میت کا مستقل مسئلہ بنایا جائے، جس میں اس کے وارثین کو شمار کیا جائے، چاہے ان میں پہلی میت کے وارثین موجود ہوں یا دوسرے ہوں، دوسری میت کی میراث میں ان میں سے ہر ایک کا حصہ شمار کیا جائے۔

۴۔اگر دوسرے میت کے مسئلہ میں تصحیح کی ضرورت ہو تو تصحیح کی جائے۔

۵۔پہلی میت سے دوسری میت کو ملی ہوئی وراثت کے حصوں اور اس کے اصل یا تصحیح شدہ مسئلہ کو دیکھا جائے۔

☆اگر دوسری میت کے حصے اور اسی کے مسئلہ کی اصل یا تصحیح میں تماثل ہو تو پہلے مسئلہ کی اصل ہی دونوں مسائل کا جامع ہوگا۔

☆اگر دوسری میت کے حصے اور اسی کے مسئلہ کی اصل یا تصحیح میں توافق ہو تو اس کے مسئلہ کے وفق کو لیا جائے گا اور اس سے پہلے مسئلہ کے اصل یا تصحیح کو ضرب دیا جائے گا، جو حاصلِ ضرب ہوگا وہ دونوں مسائل کا جامع ہوگا۔

☆اگر دوسری میت کے حصے اور اس کے مسئلہ کی اصل یا تصحیح میں تباین ہو تو ہم پہلے مسئلہ کی اصل یا تصحیح کو دوسرے مسئلہ کی اصل یا تصحیح سے ضرب دیں گے، جو حاصلِ ضرب ہوگا وہ دونوں مسائل کا جامع ہوگا۔

۶۔دو مسئلوں میں وارثوں کو دیکھا جائے گا:

☆اگر کوئی صرف پہلے مسئلہ میں ہی وارث ہوتا ہے تو وہ توافق کی صورت میں اپنا حصہ دوسرے مسئلہ کے وفق کے مطابق لے گا، اگر تباین ہے تو مکمل لے گا۔

☆اگر کوئی صرف دوسرے مسئلہ میں وارث ہوتا ہو تو وہ اپنا حصہ توافق کی صورت میں دوسری میت کے حصوں کے وفق کے مطابق لے گا، اگر تباین ہو تو مکمل لے گا۔

☆اگر ان میں سے کوئی دونوں مسئلوں میں وارث بنتا ہو تو توافق کی صورت میں پہلے مسئلہ میں دوسرے کے وفق کے مطابق لے گا، اگر تباین ہو تو مکمل لے گا، اور دوسرے مسئلہ سے اپنا حصہ توافق کی صورت میں دوسری میت کے وفق سے لے گا، اگر تباین ہے تو مکمل لے

گا، پھر اس کے دونوں حصوں کو جمع کیا جائے گا اور دونوں حصوں کو جامع اصل سے لے گا۔

ان اصولوں کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش ہیں:

پہلی مثال: جب دوسری میت کے حصے اور اسی کے مسئلہ میں تماثل ہو:

میت کا شوہر، ماں، چچا ہو، پھر ان میں سے شوہر کا انتقال وراثت کی تقسیم سے پہلے ہو جائے اور اس کے تین بیٹے ہوں۔

		پہلے مسئلہ کی اصل	دوسرے مسئلہ کی اصل	جامع
		۶	۳	۶
۱/۲	شوہر	۳	میت ثانی	
۱/۳	ماں	۲	اجنبیہ	۲
ع	چچا	۱	اجنبی	۱
			۳ بیٹے	۳

اس مسئلہ میں یہ بات واضح ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی میراث میں سے آدھے کا وارث ہوگا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع نہیں ہے، اور ماں کو ایک تہائی ملے گا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع بھی نہیں ہے اور ایک سے زائد بھائی بہن بھی نہیں ہیں، چچا عصبہ کی بنیاد پر باقی حصوں کا وارث بنے گا۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ مسئلہ کی اصل ۶ بنے گی کیوں کہ وارثین کا مخرج (۲) اور (۳) ہیں، دونوں میں تباین ہے، اس لیے ایک کو دوسرے سے ضرب دیا جائے گا، جس کے نتیجے میں مسئلہ کی اصل ۶ ہو جائے گی۔

اس صورت میں شوہر کو تین حصے ملیں گے اور ماں کو دو اور چچا کو بچا ہوا ایک۔

دوسرے مسئلے میں میت شوہر ہے، جس کے تین بیٹے ہیں جو عصبہ کی بنیاد پر اس کے وارث بنتے ہیں، ان کے مسئلہ کی اصل ۳ بنتی ہے کیوں کہ ان کے عدد رؤوس کی تعداد یہی ہے۔

اگر ہم دوسری میت یعنی شوہر کے مسئلہ اور اس کو پہلی میت سے ملے ہوئے حصوں کو دیکھیں گے تو ان میں تماثل پایا جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر دونوں مسائل کا جامع پہلے مسئلہ کا اصل ہوگا اور ہر وارث کو اسی سے حصہ دیا جائے گا جیسا کہ مذکورہ مسئلہ کی شکل سے واضح ہے۔

اور ایک مثال:

میت کا شوہر اور دو علاتی بہنیں ہوں پھر مذکورہ دو بہنوں میں سے ایک کا انتقال ہو جائے اور مذکورہ بہن کے ساتھ اس کی ایک بیٹی ہو۔

		پہلے مسئلہ کی اصل			دوسرے مسئلہ کی اصل	جامع
		۶عول الی ۷			۲	۷
۱/۲	شوہر	۳				۳
۲/۳	علاتی بہن	۲	ع	علاتی بہن	۱	۳
	علاتی بہن	۲	میت			
			۱/۲	بیٹی	۱	۱

یہ مسئلہ بھی سابقہ مسئلہ کی طرح ہی ہے، دوسری میت یعنی بہن کے پہلی میت سے حصے اس کے اپنے مسئلہ کی اصل کے مماثل ہیں، چناں چہ پہلے مسئلہ کی اصل ہی دونوں مسئلوں کا جامع ہوگا۔

البتہ اس مسئلہ میں عول ہے، اور ایک بہن پہلی بہن کی بھی وارث ہوتی ہے اور دوسری بہن کی بھی۔

دوسری مثال: جب دوسری میت کے حصے اور اسی کے مسئلہ میں توافق ہو:

کسی میت کا شوہر، ماں، چچا ہو پھر شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کے وارثین میں ماں، دو اخیافی بھائی اور ایک علاتی بھائی ہو تو اس مسئلہ کا حل مندرجہ ذیل شکل میں ہوگا:

		پہلے مسئلہ کی اصل			دوسرے مسئلہ کی اصل	جامع
		۶			۶	۱۲
۱/۲	شوہر	۳		میت		
۱/۳	ماں	۲		اجنبیہ		۴
ع	چچا	۱		اجنبی		۲
			۱/۶	ماں	۱	۱
			۱/۳	۲اخیافی بھائی	۲	۲
			ع	اعلاتی بھائی	۳	۳

ہم نے پہلے مسئلہ کے حصوں کو اس کے وارثین میں تقسیم کردیا اور دوسرے مسئلہ کے حصوں کو بھی اس کے وارثین میں تقسیم کردیا، پھر ہم نے دوسرے میت (شوہر) کو پہلی میت سے حاصل شدہ حصوں اور اس کے مسئلہ کو دیکھا تو دونوں کا ایک تہائی میں توافق پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم نے دوسرے مسئلہ کا ایک تہائی یعنی ۲ کو لیا جو اس کا وفق ہوتا ہے اور اس کو پہلے مسئلہ کی مکمل اصل (۶) سے ضرب دیا تو جامع ۱۲ ہوگیا، پھر جو پہلے مسئلہ سے وارث بنتے ہیں ان کے حصوں کو دوسرے کے وفق سے ضرب دیا تو ماں کا حصہ (۲×۲=۴) ہوگیا اور چچا کا حصہ (۱×۲=۲) ہوگیا، اور اس کو ہم نے جامع کے تحت رکھ دیا۔

دوسرے مسئلہ سے جو وارث بنتے ہیں ہم نے اس کے حصے کو میت کے حصوں کے وفق سے ضرب دیا جو (۱) ہے تو دوسرے مسئلہ میں ماں کا حصہ (۱×۱=۱) ہوگیا اور اخیافی بھائیوں کا حصہ (۳×۱=۳) ہوگیا، ان کو بھی ہم نے جامع کے تحت رکھا، اگر ہم جامع میں وارثین کے حصوں کو جمع کریں گے تو وہ جامع کی مجموعی تعداد کے برابر ہوجائیں گے، یہ ہمارے عمل کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

ایک اور مثال:

		(٣)	(٣)			(١)	
		پہلے مسئلہ کی اصل	تصحیح			دوسرے مسئلہ کی اصل	جامع
		٦	١٨			٢٤	٥٤
١/٦	باپ	١	٣	١/٦	دادا	٤	١٣
١/٦	ماں	١	٣	١/٦	دادی	٤	١٣
ع	بیٹی	٤	٤	م	حقیقی بہن	٠	١٢
	بیٹا		٨		میت		
				١/٨	بیوی	٣	٣
				ع	بیٹا	١٣	١٣

اس مسئلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ باپ پہلے مسئلہ سے چھٹے حصے کا وارث بنتا ہے اور ماں بھی چھٹے حصے کی وارث ہوتی ہے، اور باقی حصوں کے وارث بیٹا اور بیٹی عصبہ بن کر ہوتے ہیں، باپ اور ماں کے حصوں کے مخارج (٦) میں تماثل پائے جانے کی وجہ سے مسئلہ کی اصل ٦ بنے گی، باپ کو ان میں سے ایک حصہ اور ماں کو ایک حصہ ملے گا، اور باقی بچے ہوئے چار حصے بیٹے اور بیٹی کو ملیں گے جو ان کے درمیان مرد کو عورتوں کے دوگنا کے اصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، حصوں کے چار ہونے کی وجہ سے ان میں کسر کے بغیر برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے مسئلہ کی تصحیح ضروری ہے۔

عدد رؤوس اور حصوں میں تباین پایا جاتا ہے، اس لیے مسئلہ کی اصل ٦ کو عدد رؤوس ٣ سے ضرب دیا جائے گا تو مسئلہ کی تصحیح ١٨ سے ہوگی۔

دوسرے مسئلہ میں باپ دادا بن جاتا ہے اور ماں دادی اور بیٹی حقیقی بہن، پھر دادا کو چھٹا حصہ ملتا ہے اور دادی کو بھی چھٹا حصہ، اور بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے حقیقی بہن محجوب ہوجاتی ہے، اور بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے، اور باقی وراثت عصبہ ہونے کی وجہ سے بیٹے کو ملتی ہے۔

دوسرے مسئلہ کی اصل ۲۴ ہوتی ہے، کیوں کہ بیوی کے حصے کے مخرج اور باپ یا ماں کے حصے کے مخرج کے درمیان نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے دو میں سے ایک کے وفق کو دوسرے کی کامل عدد سے ضرب دیا جائے گا: (۴×۶=۲۴) جو حاصل ہوگا وہ مسئلہ کی اصل بنے گا۔

دادا کو ۴ حصے، دادی کو بھی ۴ حصے، بیوی کو ۳ حصے اور باقی بچے ہوئے ۱۳ حصے بیٹے کو۔

پھر ان سب کے بعد دونوں مسئلوں کے جامع کا کردار آتا ہے، یہاں پہلے میت سے حاصل شدہ دوسری میت کے حصوں اور اس کے مسئلہ کی اصل کو دیکھنا ضروری ہے، جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں آٹھویں حصے میں توافق نظر آتا ہے۔

اگر ہم دوسرے مسئلہ کے آٹھویں حصہ کو لیں گے جو ۳ ہے اور اس کو پہلے مسئلہ کی تصحیح ۱۸ سے ضرب دیں گے تو حاصل (۵۴) ہوگا جو دونوں مسئلہ کا جامع ہے: (۱۸×۳=۵۴)

پھر ہم دوسرے مسئلے کے وفق کو لیں گے اور اس کو پہلے کا جزء السہم بنائیں گے تاکہ اس سے پہلے مسئلہ کے ہر وارث کے حصے کو ضرب دیں، اور دوسری میت کے حصوں کا وفق لیں گے اور اس کو دوسرے مسئلہ کا جزء السہم بنائیں گے تاکہ اس سے دوسرے مسئلہ کے ہر وارث کے حصے کو ضرب دیں، جو دونوں مسئلوں میں وارث بنتے ہیں، ہم دونوں مسائل میں ملنے والے حصوں کو جمع کریں گے اور اس کو جامع کے تحت رکھیں گے۔

اس طرح ہم اس مسئلہ کے حل تک پہنچ جائیں گے اور ہر وارث کو اس کا حصہ ملے گا جیسا کہ مسئلہ کی شکل میں واضح ہے۔

تیسری مثال: جب دوسری میت کے حصے اور اسی کے مسئلہ میں تباین ہو:

		(۱۰)	(۵)			(۳)	
		پہلے مسئلہ کی اصل			دوسرے مسئلہ کی اصل	تصحیح	جامع
		۶			۲	۱۰	۶۰
۱/۲	شوہر	۳		متوفی			
۱/۳	ماں	۲					۲۰
ع	چچا	۱					۱۰
			۱/۲	بیٹی	۱	۵	۱۵
			ع	۵ حقیقی بھائی	۱	۵	۱۵

اس مسئلہ میں ہمارے سامنے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ پہلی میت کی وراثت میں سے دوسری میت کے حصوں (۳) اور اس کے مسئلہ کے تصحیح کے بعد حصوں (۱۰) کے درمیان تباین پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے ہم پہلے مسئلہ کی اصل کو دوسرے مسئلہ کی تصحیح سے ضرب دیں گے تو جامع (۶×۱۰=۶۰) ہوجاتا ہے۔

دوسرے مسئلہ میں یہ بات دکھائی دے رہی ہے کہ ہم اس میں تصحیح کی ہے، کیوں کہ پانچ بھائیوں کے حصے ان پر برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، ان کے حصوں اور عدد رؤوس میں تباین پایا جاتا ہے، اس لیے ہم نے مسئلہ کی اصل (۲) کو عدد رؤوس (۵) سے ضرب دیا تو تصحیح (۱۰) ہوگئی، پھر پہلے مسئلہ میں جس کو حصہ مل رہا تھا، اس کو اس کا حصہ دوسرے مسئلہ کی تصحیح سے ضرب دے کر دیا جائے گا، اس صورت میں ماں کو (۲×۱۰=۲۰) ملے گا، چچا کو (۱×۱۰=۱۰) ملے گا اور ہم ان حصوں کو جامع کے تحت رکھیں گے، اور جس کو دوسرے مسئلہ میں حصہ ہے وہ اس کو پہلی میت سے دوسری میت کو حاصل شدہ حصوں سے ضرب دے کر دیا جائے گا، اس صورت میں بیٹی کا حصہ (۵×۳=۱۵) ہوگا اور حقیقی بھائیوں کا حصہ

(۵×۳=۱۵) ہوگا، اس کو بھی ہم جامع کے تحت رکھیں گے۔

جب جامع میں تمام حصوں کی طرف رجوع کیا جائے گا اوران کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کیا جائے گا تو تعداد جامع کی تعداد کے برابر ہوگی، یہی اس مسئلہ میں تقسیم کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

ایک اور مثال:

کسی شخص کا انتقال ہوجائے اوراس کی بیوی، تین بیٹے اور ایک بیٹی ہو، اور وراثت کی تقسیم سے پہلے بیٹی کا انتقال ہوجائے اوراس کے وارثین مذکورہ بالا ہی ہوں۔

	(۱)			(۳)	(۱۸)		
جامع	تصحیح	دوسرے مسئلہ کی اصل			پہلے مسئلہ کی اصل		
۱۴۴	۱۸	۶			۸		
۲۱	۳	۱	ماں	۱/۶	۱	بیوی	۱/۸
۴۱	۵		حقیقی بھائی	ع	۲	بیٹا	ع
۴۱	۵	۵	حقیقی بھائی	ع	۲	بیٹا	ع
۴۱	۵		حقیقی بھائی	ع	۲	بیٹا	ع
			متوفیہ	ع	۱	بیٹی	ع

اس مسئلہ کے حل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پہلے مسئلہ کی اصل آٹھ ہے جو وارثوں میں برابر کسر کے بغیر تقسیم ہوجاتا ہے، اور دوسرے مسئلہ کی تصحیح ۱۸ ہے، پہلے مسئلہ سے دوسری میت کا حصہ صرف ایک ہے، اس میں اوراس کے مسئلہ میں تباین ہے، اس لیے ہم دوسرے مسئلہ کی تصحیح کو پہلے مسئلہ کی اصل سے ضرب دیں گے تو حاصل (۱۴۴) آئے گا جو دونوں مسئلوں کا جامع ہے۔

بیوی کو پہلے مسئلہ سے آٹھ میں سے ایک حصہ ملے گا جس کو ہم ۱۸ سے ضرب دیں تو ۱۸ ہی ہوگا، اور دوسرے مسئلہ میں اس کو ماں ہونے کے اعتبار سے ۳ ملے گا جس کو ایک سے ضرب دیا جائے جو پہلے مسئلے سے دوسری میت کا حصہ ہے، اس طرح تین حصے بنیں گے، اس طرح جملہ حصے ۲۱ ہو جائیں گے۔

ہر بیٹے کو پہلے مسئلہ سے ۲ حصے ملتے ہیں جس کو ۱۸ سے ضرب دیا جائے گا تو پہلے مسئلہ سے حاصل ۳۶ ہو جائے گا، اور ان میں سے ہر ایک کو بھائی ہونے کی وجہ سے دوسرے مسئلہ میں ۵ حصے ملیں گے جس کو ایک سے ضرب دیا جائے گا تو پانچ ہی رہیں گے، پھر دونوں مسئلوں سے ملے ہوئے حصوں کو جمع کیا جائے گا تو نتیجہ مندرجہ ذیل شکل میں نکلے گا:

ماں: (۱۸+۳=۲۱)

بیٹا: (۳۶+۵=۴۱)

بیٹا: (۳۶+۵=۴۱)

بیٹا: (۳۶+۵=۴۱)

اس کی وضاحت مذکورہ مسئلہ کی شکل میں ہو رہی ہے۔

مناسخہ کی جتنی بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ اس صورت میں ہے جب وراثت کی تقسیم سے پہلے صرف ایک وارث کا انتقال ہوگیا ہو، اگر تقسیم سے پہلے کسی اور کا انتقال ہوگیا ہو تو جامع کو پہلا مسئلہ بنائیں گے اور تیسری میت کا نیا مسئلہ بنائیں گے، اور تیسرے مسئلہ اور جامع میں ان ہی قواعد کو روبعمل لائیں گے جن کا تذکرہ پہلی اور دوسری میت کے سلسلے میں کیا گیا ہے، پھر ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں اس بات سے واقف ہونا ضروری ہے کہ اگر دوسری میت کے بھی وارث وہی ہوں جو پہلی میت کے ہیں اور دوسری میت سے ان کی وراثت ویسی ہی ہو جیسے پہلی میت سے ملتی ہو تو دوسری میت کا شمار ہی نہیں کیا جائے گا اور یہ مانا جائے گا کہ وہ پہلی میت کے وارثوں میں سے ہی نہیں ہے، اور میراث کو باقی ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا، کیوں کہ ایک ہی

ذریعے سے یہ مال ان تک پہنچ جائے گا۔

اس کی مثال:

اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی چار حقیقی بھائی ہوں، پھر وراثت کی تقسیم سے پہلے ایک بھائی کا انتقال ہو جائے پھر تیسرے کا انتقال ہو جائے تو پہلی میت کے بعد مرنے والوں کو کالعدم شمار کریں گے، اور وراثت باقی میں تقسیم کی جائے گی۔

ذوی الارحام کی وراثت

ذوی الارحام کی تعریف

ارحام رحم کی جمع ہے جس کے لغوی معنی رشتے داری کے ہیں اور ذوالارحام رشتے داروں کو کہتے ہیں۔

علمِ میراث کی اصطلاح میں ذوی الارحام ہر وہ رشتے دار ہے جو حصے یا عصبہ کی بنیاد پر وارث نہیں ہوتا ہے یعنی وہ ان رشتے داروں کے علاوہ ہیں جن کے وارث ہونے پر اجماع ہے، جس کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں۔

ذوی الارحام کے وارث بننے کی شرطیں

ذوی الارحام کے وارث بننے کے لیے مندرجہ ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ شوہر اور بیوی کے علاوہ میت کا کوئی وارث نہ ہو۔

اگر اس کا کوئی حصے دار بننے والا یا عصبہ بننے والا وارث ہو تو اس کو ذوی الارحام پر حصے، عصبہ اور رد میں مقدم کیا جائے گا۔

اگر شوہر اور بیوی میں سے کوئی ہو تو ذوی الارحام کے وارث بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جب اس کے علاوہ کوئی دوسرا وارث نہ ہو، کیوں کہ شوہر اور بیوی پر ردّ نہیں ہوتا ہے، جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

۲۔ بیت المال منظم نہ ہو، اگر بیت المال منظم ہو تو وراثت میں اس کو ذوی الارحام پر مقدم کیا جائے گا، جیسا کہ ردّ کی بحث کے مقدمے میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اگر بیت المال منظّم ہو تو ذوی الارحام کے وارث نہ بننے کی دلیل

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذوی الارحام کے وارث نہ بننے کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی وراثت میں ان کا متعین حصہ وارد نہیں ہوا ہے، اگر ان کو میراث میں حق ہوتا تو اللہ تبارک وتعالی اور رسول اللہ ﷺ اس کو ضرور واضح کرتے جیسا کہ حصے داروں اور عصبہ بننے والوں کے سلسلے میں آیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ عز وجل نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، پس وارث کے لیے وصیت نہیں ہے'' (ترمذی: الوصایا ۲۱۲۲، نسائی: الوصایا ۶/ ۲۴۷)

حضرت عمرو بن خارجہ سے یہ روایت ہے۔ اگر ان کو میراث میں کوئی حصہ ہوتا تو اللہ عز وجل ضرور ان کو دیتا۔

لیکن متاخر شافعیہ رحمۃ اللہ علیہم نے ذوی الارحام کے وارث ہونے کا فتوی دیا ہے، یہ فتوی چوتھی صدی ہجری سے ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال منظّم نہیں رہا ہے، اور حق داروں کو ان کا حق نہیں پہنچا رہا ہے، اسی وجہ سے میت کا مال اس کے ذوی الارحام اور غیر وارث رشتے داروں کو پہنچے، یہ اس سے بہتر ہے کہ دور کے غیر مستحق لوگوں کو پہنچے۔

ذوی الارحام کی قسمیں

ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ جس کو میت کی طرف اس حیثیت سے منسوب کیا جاتا ہے کہ میت اس کی اصل ہے، یعنی وہ میت کے فروع، وہ مندرجہ ذیل افراد ہیں:

۔ نواسے اور نواسیاں نیچے تک

۔ بیٹے کے نواسے اور نواسیاں نیچے تک

۲۔ جن کی طرف میت کو اس حیثیت سے منسوب کیا جاتا ہو کہ وہ میت کے اصل ہیں، یعنی میت کے اصول، وہ مندرجہ ذیل افراد ہیں:

۔ ذوی الارحام دادا دادیاں اور نانا نانیاں، میت کے ان اصول کے علاوہ جن کا

تذکرہ وارثین کی فہرست میں کیا گیا ہے۔

ذوی الارحام جدّ (دادا یا نانا) وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان کوئی عورت ہو، مثلاً نانا اور اس کا باپ، اوپر تک۔

ذوی الارحام نانی یا دادی: وہ عورت جس کے اور میت کے درمیان کوئی ذوی الارحام جدّ ہو، مثلاً نانا کی ماں، نانا کی نانی، اوپر تک۔

۳۔ وہ رشتے دار جو میت کے والدین کی طرف منسوب ہوتے ہیں یعنی میت کے والدین کے فروع، وہ مندرجہ ذیل افراد ہیں:

۔ بھانجے اور بھانجیاں، چاہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی

۔ بھتیجیاں، چاہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی

۔ اخیافی بھائی کے بیٹے اور بیٹیاں

۔ اور ہر وہ شخص جو مذکورہ بالا افراد کے واسطے سے میت تک پہنچتا ہو

۴۔ وہ رشتے دار جو میت کے اجداد اور جدات کی طرف منسوب ہوتے ہیں یعنی میت کے اجداد اور جدات کے فروع، یہ افراد مندرجہ ذیل ہیں:

۔ اخیافی چچا، مطلقاً پھوپھیاں اور مطلقاً چچا زاد بہنیں

۔ مطلقاً ماموں اور خالہ، چاہے دور کے ہوں، ان کی اولاد نیچے تک۔

ذوی الارحام کو وراثت دینے کا طریقہ

ہم نے یہ بات بتادی ہے کہ ذوی الارحام اسی وقت وارث بنتے ہیں جب شوہر اور بیوی کو چھوڑ کر حصے یا عصبہ کی بنیاد پر وارث ہونے والا کوئی نہ ہو، اگر وارثین میں سے کوئی بھی نہ ہو تو پوری میراث ذوی الارحام کو ملے گی۔

اگر شوہر اور بیوی میں سے کوئی ہو تو اس کو حصہ دینے کے بعد بچا ہوا ذوی الارحام کو ملے گا۔

۔ اگر ذوی الارحام میں سے کوئی ایک ہو تو پورا مال اس کو ملے گا، مثلاً میت کی صرف

ایک نواسی ہوتو پورا مال اس کو دیا جائے گا۔
۔اگر کئی ذوی الارحام ہوں تو ان کو وراثت مندرجہ ذیل طریقے کے مطابق دی جائے گی:

۱۔ذوی الارحام میں سے ہر ایک کو اس کے درجے پر رکھا جائے گا جس کے ذریعے وہ میت تک پہنچتا ہو، اس سے خالہ، ماموں، اخیافی چچا اور پھوپھی مستثنیٰ ہیں۔
اس لیے ہر فرع کو اس کی اصل کے مقام پر رکھا جائے گا اور اس کی اصل کو اس کی اصل کی جگہ پر، یہاں تک کہ وہ میت تک پہنچ جائے، جو جس وارث کے مقام پر پہنچے گا وہ اس کا حصہ لے گا، اور اس شخص کے انتقال کو فرض کرلیا جائے گا مثلاً نواسی کو اس کی ماں یعنی میت کی بیٹی کے مقام پر رکھا جائے گا، بھتیجی کو اس کے باپ یعنی بھائی کے درجے پر رکھا جائے گا، اسی طرح دوسرے وارثین میں کیا جائے گا۔
ہم نے کہا ہے کہ یہ ماموں، خالہ، پھوپھی اور اخیافی چچا کے علاوہ میں ہے۔
چناں چہ ماموں اور خالہ کو ماں کے درجے میں رکھا جائے گا، چناں جو ماں کو ملتا ہے؛ تنہا ہونے کی صورت میں مکمل میراث، یا دوسرے وارثین کے ساتھ ایک تہائی یا چھٹا حصہ، وہ ان کو ملے گا۔
اخیافی چچا اور پھوپھی کو باپ کے درجے میں رکھا جائے گا اور وہ اسی طرح وارث ہوں گے جس طرح باپ وارث ہوتا ہے۔
۲۔ذوی الارحام میں سے ہر ایک کو سابقہ طریقے کے مطابق اس کا درجہ دینے کے بعد جو وارث تک پہلے پہنچتا ہے اس کو مقدم کیا جائے گا، چاہے اس کا رشتہ دوسروں کے مقابلے میں وارث سے دور کا ہو یا قریب کا۔
اگر نواسی کی بیٹی اور پوتے کی نواسی ہو تو پورا مال پوتے کی نواسی کو ملے گا، اگر چہ اس کا رشتہ نواسی کی بیٹی کے مقابلے میں دور کا ہے، کیوں کہ پوتے کی نواسی میت تک پہلے پہنچتی ہے، کیوں کہ اس کو وارث تک پہنچانے میں کوئی بھی غیر وارث نہیں ہے، جو پوتے کی بیٹی ہے۔

۲۔اگر ذوی الارحام میں سے موجود لوگ میت تک پہنچنے میں برابر ہوں تو یہ فرض کرلیا جائے گا کہ میت نے ان وارثین کو چھوڑا ہے جن کی طرف یہ ذوی الارحام منسوب ہوتے ہیں، اوران کے درمیان پورا مال یا میاں اور بیوی کو دینے کے بعد بچا ہوا مال تقسیم کیا جائے گا، گویا کہ وہ موجود ہیں، یعنی وارثین میں جس طرح مال تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح ذوی الارحام میں بھی مال تقسیم کیا جائے گا، ان میں سے جو محجوب ہوگا اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا، ان میں سے جس کو جو ملے گا وہ اس کے درجے پر رکھے جانے والے کو دیا جائے گا، گویا اس کا انتقال ہوا ہے اور اس نے ان وارثین کو چھوڑا ہے، اس کی شکل یہ ہے:

۶عول الی ۷

نانا	۲اخیافی بھانجیاں	حقیقی بھانجی	علاتی بھانجی
۱/۶	۱/۳	۱/۲	۱/۶
۱	۲	۳	۱

نانا کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ اس کو ماں کے درجے پر رکھا گیا ہے۔

(۲)اخیافی بھانجیوں کو ایک تہائی ملے گا، کیوں کہ ان کو دو اخیافی بہنوں کے درجے پر رکھا گیا ہے جن سے وہ میت تک پہنچتی ہے۔

حقیقی بھانجی کو نصف ملے گا، کیوں کہ وہ حقیقی بہن کے قائم مقام ہے۔

علاتی بھانجی کو چھٹا حصہ ملے گا، کیوں کہ حقیقی بہن کے ساتھ علاتی بہن کے درجے پر ہے۔

یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہاں عول شوہر یا بیوی کے حصے کو نہیں ہوتا ہے، اگر ان میں سے کوئی ذوی الارحام کے ساتھ ہو اور مسئلہ میں عول پایا جائے، بلکہ پہلے شوہر یا بیوی کا حصہ دیا جائے گا پھر بچا ہوا ذوی الارحام میں تقسیم کیا جائے گا۔

اگر کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کا شوہر اور دو بھانجیاں ہو:

۲×۲÷۴

دو بھانجیاں	شوہر
ع	۱/۲
۱	۱
۲	۲

شوہر کو نصف ملے گا جو دو میں سے ایک ہے اور باقی بچا ہوا بھانجیوں کو ملے گا، ہر ایک کو اس کا آدھا، چوں کہ ایک ان پر تقسیم نہیں ہوتا ہے تو اس مسئلہ کی تصحیح کرنا ضروری ہے، اس صورت میں عددِ رؤس کو لیا جائے گا کیوں کہ یہاں تباین پایا جاتا ہے اور اس کو مسئلہ کے اصل سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہوگا وہ تصحیح ہوگی۔

چناں چہ شوہر کے حصے کو دو سے ضرب دے کر اس کا حصہ دیا جائے گا (۱×۲=۲)، اور بھانجیوں کے حصے کو بھی دو سے ضرب دے کر دیا جائے گا (۱×۲=۲)۔ ہر بھانجی کو چار میں سے ایک حصہ ملے گا۔

اگر دو بھانجیوں کے بجائے دو بہنیں مسئلہ میں ہوتی تو ان کو دو تہائی ملتا اور مسئلہ میں عول ہو جاتا جس کی وجہ سے شوہر کو کامل نصف نہیں ملتا بلکہ سات میں سے تین حصے ملتے، اس کے برخلاف ذوی الارحام کے ساتھ اس کو مکمل نصف ملتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں اس پر عول نہیں ہوتا ہے۔

سابقہ اصول سے مندرجہ ذیل افراد مستثنیٰ ہیں:

۱۔ اخیافی بھائی کی اولاد (اخیافی بھتیجے اور بھتیجیاں) ان کے درمیان میراث برابر برابر تقسیم کی جائے، مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی، جس طرح ان کو وارث بنانے والے میں وراثت بغیر تفریق کے تقسیم کی جاتی ہے۔

حالاں کہ اخیافی بھائی اور اخیافی بہن میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کی اولاد ہو تو اس کی میراث اولاد کے درمیان اس اصول کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے کہ مرد کو عورت

کے دوگنا حصہ ملتا ہے۔

۲۔ ماموں اور خالہ، ان کے درمیان میراث اس اصول کے مطابق تقسیم کی جائے گی کہ مرد کو عورت کا دوگنا حصہ دیا جاتا ہے۔

حالاں کہ ان کو میت سے منسوب کرنے والی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے اور یہ لوگ ان کے وارث بنتے ہیں تو وہ اخیافی بھائی بنتے ہیں اور میراث ان کے درمیان برابر تقسیم کی جاتی ہے۔

جائیداد کی تقسیم کا طریقہ

علمِ میراث کا مقصد وارثین کے درمیان وراثت اور جائیداد کو تقسیم کرنا ہے، اور جو بھی تفصیلات گزر چکی ہیں وہ وراثت کی تقسیم کا وسیلہ اور ذریعہ ہے، وراثت کی تقسیم کے کئی طریقے ہیں، ان میں سے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جائیداد کو مسئلہ کی اصل پر تقسیم کیا جائے پھر نتیجے کو ہر وارث کے حصے سے ضرب دیا جائے، مثلاً: کسی انتقال ہو جائے اور اس کی بیوی، دو بیٹیاں، ماں اور حقیقی بھائی ہو تو مسئلہ کا حل اس طرح کیا جائے گا:

۲۴

بیوی	دو بیٹیاں	ماں	حقیقی بھائی
۱/۸	۲/۳	۱/۶	ع
۳	۱۶	۴	۱

یہ بات واضح ہے کہ مسئلہ ۲۴ سے بنے گا کیوں کہ آٹھویں اور چھٹے حصوں کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے۔

بیوی کو آٹھواں حصہ (۳)، دو بیٹیوں کو دو تہائی (۱۶)، ہر بیٹی کو (۸)، ماں کو چھٹا حصہ (۴) اور باقی بچا ہوا (۱) عصبہ ہونے کی بنیاد پر حقیقی بھائی کو ملے گا۔

اگر جائیداد کی قیمت (۴۸۰۰) ہو تو مسئلہ کی اصل پر اس کو تقسیم کیا جائے گا، پھر حاصل کو ہر وارث کے حصے سے ضرب دیا جائے گا:

۴۸۰۰÷۲۴=۲۰۰ روپے ہر حصے کی قیمت ہوگی۔

اس صورت میں بیوی کو ملے گا: ۲۰۰×۳=۶۰۰ روپے

بیٹیوں کو ملے گا: ۲۰۰×۱۶=۳۲۰۰ روپے

ماں کو ملے گا:۲۰۰×۴=۸۰۰ روپے

بھائی کو ملے گا:۲۰۰×۱=۲۰۰ روپے

ان سب رقوم کو جمع کیا جائے تو نتیجہ نکلے گا:۴۸۰۰ روپے جو جائیداد کی قیمت ہے۔

جائیداد تقسیم کرنے کا دوسرا طریقہ بھی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

ہر وارث کے حصے کو جائیداد سے ضرب دیا جائے پھر حاصل کو مسئلہ کی اصل سے تقسیم کیا جائے: مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے مندرجہ ذیل وارثین ہوں:

۱۲

ماں	بیوی	چچا
۱/۳	۱/۴	ع
۴	۳	۵

یہاں مسئلہ ۱۲ سے ہوگا کیوں کہ ماں اور بیوی کے مخرج میں تباین پایا جاتا ہے، ماں کو ۴ حصے ملیں گے جو ایک تہائی ہے اور بیوی کو تین حصے ملیں گے جو ایک چوتھائی ہے اور باقی بچا ہوا عصبہ کی بنیاد پر چچا کو ملے گا جو پانچ حصے بنتے ہیں۔

ہم فرض کرلیں کہ جائیداد ایک سو دینار ہے:

تو اس صورت میں ماں کا حصہ ہوگا:۱۰۰×۴=۴۰۰÷۱۲=۱/۳،۳۳

بیوی کا حصہ ہوگا:۱۰۰×۳=۳۰۰÷۱۲=۲۵

چچا کا حصہ ہوگا:۱۰۰×۵=۵۰۰÷۱۲=۲/۳،۱۴

دوسری مثال: کسی عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کا شوہر، حقیقی بہن اور بیٹی ہو:

۴

شوہر	حقیقی بہن	بیٹی
۱/۴	ع	۱/۲
۱	۱	۲

شوہر کو ایک چوتھائی (۱)، بیٹی کو نصف (۲) اور حقیقی بہن کو عصبہ کی بنیاد پر (۱) ملے گا، کیوں کہ وہ بیٹی کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہے جس کو عصبہ مع الغیر کہتے ہیں۔

مسئلہ کی اصل ۴ بنتی ہے کیوں کہ بیٹی اور شوہر کے مخارج میں تداخل پایا جاتا ہے، اگر ہم فرض کرلیں کہ جائیداد ۴۴ روپے ہیں تو اس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقے پر ہوگی:

اس صورت میں شوہر کا حصہ ہوگا: ۴۴×۱=۴۴÷۴=۱۱ روپے

حقیقی بہن کا حصہ ہوگا: ۴۴×۱=۴۴÷۴=۱۱ روپے

بیٹی کا حصہ ہوگا: ۴۴×۲=۸۸÷۴=۲۲ روپے

میراث کے مشہور مسائل

میراث میں بہت سے مسائل مشہور ہیں جن کے متعین نام اور القاب ہیں جن سے وہ مسائل علمائے فرائض کے نزدیک مشہور ہیں۔

ان کو القاب اور ناموں سے منسوب کرنے کی وجہ یا تو اختلاف ہے یا اس کی نسبت اس شخصیت کی طرف کی گئی ہے جن سے اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے یا انھوں نے اس کو حل کیا ہے۔

علمِ میراث کے اصولوں اور قواعد اور اس کے احکام کے تذکرے کے دوران ان میں سے بعض مسائل کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

ہم اس فصل میں ان میں سے مشہور مسائل کا تذکرہ کر رہے ہیں تا کہ اس کتاب کو پڑھنے والا ان مسائل سے واقف ہو اور جس کو طویل کتابوں کے مطالعہ کا موقع نہیں ملتا ہے وہ ان مسائل سے مطلع ہو۔

۱۔ مسئلہ مشترکہ

اس کو مسئلہ مشترکہ اور مسئلہ حماریہ بھی کہا جاتا ہے۔

بھائیوں کی بحث میں اس مسئلہ کا تذکرہ ہو چکا ہے:

۶ تصحیح ۱۸

حقیقی بھائی	دو اخیافی بھائی	ماں	شوہر
-----	۱/۳	۱/۶	۱/۲
-----	۲	۱	۳
۲	۴	۳	۹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں پہلے یہ فیصلہ کیا کہ حقیقی بھائیوں کے عصبہ ہونے کی بنیاد پر ان کو محجوب کر دیا کیوں کہ حصے دینے کے بعد ان کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

پھر دوبارہ آپ نے حقیقی بھائیوں اور اخیافی بھائیوں کو شریک کرنے کا فیصلہ کیا، چناں چہ آپ نے باپ کو کالعدم کر دیا اور سبھوں کو اخیافی بھائی بنا دیا۔

۲۔عمریتان

اس کو یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں مسائل کا فیصلہ کیا ہے، جیسا کہ ان مسائل کا تذکرہ بھی گزر چکا ہے، یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضرت عمر نے ان دو مسئلوں میں ماں کو شوہر اور بیوی کو حصہ دینے کے بعد بچے ہوئے میں ایک تہائی دیا جس کو ثلث باقی کہا جاتا ہے۔

۶

شوہر	ماں	باپ
۱/۲	۱/۳ باقی	ع
۳	۱	۲

دوسرا مسئلہ

۱۲

بیوی	ماں	باپ
۱/۴	۱/۳ باقی	ع
۳	۳	۶

۳۔ مباہلہ

۶ عول الی ۸

شوہر	ماں	حقیقی بہن
۱/۲	۱/۳	۱/۲
۳	۲	۳

شوہر کو نصف (۳)، ماں کو ایک تہائی (۲) اور حقیقی بہن کو نصف (۳)، مسئلہ کی اصل ۶ ہے اور اس میں ۸ تک عول ہے، یہ اسلام کا پہلا مسئلہ ہے جس میں عول ہوا ہے۔

یہ مسئلہ بھی پہلے گزر چکا ہے، لیکن اس کے نام کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔

یہ مسئلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں پیش آیا تو انھوں نے صحابہ سے اس بارے میں مشورہ کیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے حصوں کے بقدر ان کے درمیان میراث تقسیم کرنے کا مشورہ دیا اور صحابہ نے اس کو قبول کیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان وارثین سے کہا: ''میں اللہ کی کتاب میں تمہارے لیے حصہ نہیں پاتا ہوں اور میں نہیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالی نے کس کو مقدم کیا ہے کہ میں اس کو مقدم کروں، اور یہ نہیں جانتا کہ کس کو موخر کیا ہے کہ میں اس کو موخر کروں، البتہ میری ایک رائے ہے، اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری طرف سے، میری رائے یہ ہے کہ میں تمام افراد میں کمی کروں''۔ پھر آپ نے عول کی بنیاد پر تقسیم کیا اور کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر کے اس فیصلے پر اپنی مخالفت ظاہر کی، اور کہا: اگر ان کو مقدم رکھا جائے جن کو اللہ نے مقدم کیا ہے اور ان کو موخر کیا جائے جن کو اللہ نے موخر کیا ہے تو کسی مسئلہ میں بھی عول نہیں ہوگا۔ ان سے دریافت کیا گیا: اللہ نے کس کو مقدم کیا ہے اور کس کو موخر؟ انھوں نے جواب دیا: شوہر، بیوی، ماں اور دادی کو اللہ نے مقدم کیا ہے، اور جن کو موخر کیا ہے وہ بیٹیاں، پوتیاں، حقیقی بہنیں اور علاتی بہنیں ہیں، چناں

چہ ان کو کبھی حصے دار بنایا ہے اور کبھی ان کو عصبہ بنایا ہے، ان چار وارثین میں کمی ہوگی۔

جب لوگوں نے ان سے اس رائے کے بارے میں مناقشہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ان کے ساتھ جو چاہے مباہلہ کرے، جس نے عالج (کثرت سے ریت والا علاقہ) کی ریت کو گنا ہے یعنی اللہ نے مال میں نصف، نصف اور ایک تہائی کو نہیں بنایا ہے۔ ان سے کہا گیا: تم نے اس کا ذکر عمر کے زمانے میں کیوں نہیں کیا؟ انھوں نے کہا: وہ بڑے ہیبت والے تھے، اس لیے میں گھبرا گیا۔

مباہلہ کا تذکرہ اللہ عزوجل کے اس فرمان میں ہے: "فَمَنْ حَاجَّکَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَ نَا وَأَبْنَاءَ كُمْ وَنِسَاءَ نَا وَنِسَاءَ كُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ" (آل عمران ۶۱) پس جو کوئی اس معاملے میں تمھارے ساتھ حجت کرے اس کے بعد جب کہ آپ کے پاس وحی آچکی ہے تو آپ کہہ دیجیے: آؤ، ہم اپنے اور تمھارے بچوں، اپنی اور تمھاری عورتوں کو بلائیں پھر ہم گڑگڑا کر اللہ کی لعنت جھوٹوں پر بھیجیں۔

اسی وجہ اس مسئلہ کو مباہلہ کہا جاتا ہے۔

۴۔ مسئلہ منبریہ

یہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۲۴ عول الی ۲۷

دو بیٹیاں	ماں	باپ	بیوی
۲/۳	۱/۶	۱/۶	۱/۸
۱۶	۴	۴	۳

مسئلہ ۲۴ سے بنتا ہے کیوں کہ ثمن (آٹھواں) اور چھٹے کے درمیان توافق پایا جاتا ہے، اور عول الی ۲۷ ہو جاتا ہے۔ بیوی کو آٹھواں حصہ (۳)، باپ کو چھٹا (۴)، ماں کو چھٹا (۴) اور بیٹیوں کو دو تہائی (۱۶) حصے۔

اس مسئلہ کو منبریہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور آپ نے اپنے خطبہ کی ابتدا: "**الحمد لله الذی یجزی کل نفس بما تسعی**" کہا ہی تھا کہ آپ سے اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے اس کا جواب فوراً دیا، اس میں عورت کا آٹھواں حصہ نواں بن جاتا ہے، یہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔

۵۔ مسئلہ خرقاء

یہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۳ تصحیح ۹ جزء السہم ۳

ماں	دادا	حقیقی بہن
۱/۳	ع	ع
۱	۲	
۳	۴	۲

ماں کو ایک تہائی، باقی دادا اور بہن میں مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

مسئلہ کی اصل ۳ ہے اور نو سے اس کی تصحیح ہوتی ہے، ماں کو ۳، دادا کو ۴ اور بہن کو ۲ حصے۔

اس مسئلہ کو خرقاء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کے اقوال نے اس کو پھاڑ دیا ہے یا اس مسئلہ نے صحابہ کے اتفاق کو پھاڑ دیا ہے، اس مسئلہ میں سات اقوال ہیں، جس کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے وہ شافعیہ کا مسلک ہے۔

۶۔ اکدریہ

اس مسئلہ کا تذکرہ گزر چکا ہے، یہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۶عول الی ۹ تصحیح ۲۷ جزءالسہم ۳

شوہر	ماں	دادا	حقیقی یا علاتی بہن
1/۲	1/۳	1/۶	1/۲
۳	۲	۱	۳
۹	۶	۸	۴

شوہر کو عول کے ساتھ نصف، ماں کو عول کے ساتھ ایک تہائی، دادا کو عول کے ساتھ چھٹا اور بہن کو عول کے ساتھ نصف، مسئلہ ۶ سے ہوگا اور عول الی ۹ ہوگا، پھر اس کے بعد دادا بہن کی طرف رجوع ہوگا اور دونوں کے حصے ملا کر ان کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے اور اس میں دادا کو بہن کے دوگنا ملے گا مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق، دادا کا حصہ نو میں سے ایک اور بہن کا حصہ نو میں سے ۳ ہے، دونوں ملا کر ۴ ہوجاتے ہیں، اس وجہ سے مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق تقسیم کرنے سے یہ دادا اور بہن پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے عددِ رؤوس کو لیں گے کیوں کہ حصوں میں تباین پایا جاتا ہے، اور اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے، اس کے نتیجے میں مسئلہ کی تصحیح ۲۷ بنتی ہے، شوہر کو ۹، ماں کو چھ، دادا کو آٹھ اور بہن کو ۴ حصے ملیں گے۔

اس مسئلہ کو اکدریہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ نے زید بن ثابت کے مسلک کو تین پہلوؤں سے مکدر کردیا ہے؛ جد کا حصہ عول ہوتا ہے، بہن کو حصہ ملتا ہے اور حصوں کو جمع کر کے اس کو عصبہ کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے۔

بہن کو حصے دار بنایا ہے اور اس کو عصبہ نہیں بنایا ہے، کیوں کہ اس صورت میں اس کو کچھ بھی نہیں بچتا ہے، اور نہ تقسیم کیا ہے، کیوں کہ دادا کا حصہ چھٹے حصے سے کم ہوتا ہے۔

۷۔ مسئلہ یتیمتان

یہ مندرجہ ذیل دو مسئلے ہیں:

۲

شوہر	حقیقی بہن
1/۲	1/۲
۱	۱

۲

شوہر	علاتی بہن
1/۲	1/۲
۱	۱

ان دو مسائل میں شوہر کو آدھا ملتا ہے اور بہن کو آدھا، علمِ میراث کے تمام مسائل میں ان دو کے علاوہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں مال دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، اسی وجہ سے ان مسئلوں کو یتیم کہا جاتا ہے۔

۸۔ام الفروخ

وہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۶ عول الی ۱۰

شوہر	ماں	دو اخیافی بہنیں	دو حقیقی بہنیں
1/۲	1/۶	1/۳	۲/۳
۳	۱	۲	۴

شوہر کو نصف، ماں کو چھٹا، اخیافی بہنوں کو ایک تہائی اور حقیقی بہنوں کو دو تہائی۔

مسئلہ کی اصل ۶ ہے اور اس میں عول الی ۱۰ ہے۔

اس مسئلہ کو ام الفروخ (چوزوں کی ماں) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں سب

سے زیادہ عول ہوتا ہے، اس وجہ سے چار زائد کو چوزوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اس کو شریحیہ بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ قاضی شریح نے سب سے پہلے اس مسئلہ کا فیصلہ کیا۔

۹۔ام الارامل

یہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۲عول الی ۱۷

۸ حقیقی بہنیں	۴ اخیافی بہنیں	دادی اور نانی	۳ بیویاں
۲/۳	۱/۳	۱/۶	۱/۴
۸	۴	۲	۳

بیویوں کو ایک چوتھائی (۳)، ہر بیوی کو ایک حصہ، دادی اور نانی کو چھٹا (۲)، دادی کو ایک اور نانی کو ایک، اخیافی بہنوں کو ایک تہائی (۴)، ہر بہن کو ایک، حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۸)، ہر بہن کو ایک، مسئلہ کی اصل ۱۲ ہے اور اس میں عول الی ۱۷ ہوتا ہے، اس کو ام الارامل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں سبھی وارث عورتیں ہیں، اور اس مسئلہ میں پہیلی بھی ہے، پہیلی اس طرح پیش کی جاتی ہے: ایک شخص کا انتقال ہو گیا اور اس نے سترہ دینار چھوڑے اور سترہ عورتیں، ہر عورت کو ایک دینار ملا۔

۱۰۔مروانیہ

وہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۶عول الی ۹

دو اخیافی بہنیں	دو علاتی بہنیں	دو حقیقی بہنیں	شوہر
۱/۳	م	۲/۳	۱/۲
۲	ـ	۴	۳

شوہر کو عول کے ساتھ نصف (۳)، دو حقیقی بہنوں کو عول کے ساتھ دو تہائی (۴)، علاقی بہنیں حقیقی بہنوں کی وجہ سے محجوب اور دو اخیافی بہنوں کو عول کے ساتھ ایک تہائی (۲)

مسئلہ کی اصل ٦ ہے اور اس میں عول الی ۹ ہے۔

اس کو مروانیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مروان بن حکم کے زمانے میں پیش آیا۔

اس مسئلے کے علماء میں مشہور ہونے کی وجہ سے اس کو غرّاء بھی کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ خرقیہ

وہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

٦ تصحیح ٧٢ جزء السہم ١٢

تین دادیاں	دادا	حقیقی بہن	علاقی بہن	اخیافی بہن
۱/٦	ع	ع	ع	م
۱		۵		
۱۲	۳۰	۳۰		

یہ مسئلہ امام شافعی کے مسلک کے مطابق مسائل معادّہ میں سے ہے، کیوں کہ حقیقی بہن دادا کے خلاف علاقی بہن کو بھی شمار کرتی ہے پھر اپنا حصہ لیتی ہے۔

اس مسئلہ کی اصل ٦ ہے، دادیوں کے لیے چھٹا حصہ (۱)، دادا اور بہنوں کے لیے باقی بچے ہوئے (۵) حصے، اور دادا کی وجہ سے اخیافی بہن محجوب ہو جاتی ہے۔

دادیوں کا حصہ ان پر تقسیم نہیں ہوتا ہے اور ان کے حصوں اور عدد رؤوس میں تباین پایا جاتا ہے، اس لیے عدد رؤوس کو یاد رکھا جائے گا۔

دادا اور بہنوں کے ۵ حصے ہیں اور ان کے عدد رؤوس ۴ ہے، کیوں کہ دادا کو دو بہنوں کی طرح تصور کیا جائے گا، یہاں پر بھی حصوں اور عدد رؤوس میں تباین ہے، اس لیے عدد رؤوس کو یاد رکھا جائے گا، پھر دادیوں کے عدد رؤوس (۳) اور چچا اور دو بہنوں کے عدد رؤوس (۴) کو دیکھا جائے گا تو ان میں تباین نظر آئے گا، اس لیے ایک کو دوسرے سے

ضرب دیا جائے گا (۳×۴=۱۲)، اور حاصل کو مسئلہ کی اصل سے ضرب دیا جائے گا (۶×۱۲=۷۲)، دادیوں کو (۱×۱۲=۱۲)، ہر دادی کو ۴ حصے، دادا اور دو بہنوں کو (۵×۱۲=۶۰)، دادا کو آدھا (۳۰) ملے گا اور حقیقی بہن کو بھی (۳۰)، وہ اس کا اور علاتی بہن کا حصہ ہے۔

اس مسئلہ کو حمزیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حمزہ زیات سے اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے اس کا یہ حل پیش کیا۔

۱۲۔ دیناریہ

وہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۲۴ تصحیح ۶۰۰ جزء السہم ۲۵

بیوی	دادی	۲ بیٹیاں	۱۲ علاتی بھائی		علاتی بہن
۱/۸	۱/۶	۲/۳	ع		
۳	۴	۱۶	۱		
۷۵	۱۰۰	۴۰۰		۲۴	۱

اس مسئلہ میں ترکہ ۶۰۰ دینار ہے، مسئلہ کی اصل ۲۴ بنتی ہے، اور ۶۰۰ سے تصحیح ہوتی ہے، کیوں کہ بھائیوں اور بہن کے حصے اور عدد رؤس کے درمیان تباین ہے، اس لیے عدد رؤس کو مسئلہ کی اصل سے ضرب دیں گے تو مسئلہ کی تصحیح ۶۰۰ ہوتی ہے (۲۴×۲۵=۶۰۰)، بیوی کو آٹھواں حصہ (۷۵) دینار، دادی کو چھٹا حصہ (۱۰۰) دینار، دو بیٹیوں کو دو تہائی (۴۰۰) دینار، بہن بھائیوں کو باقی بچے ہوئے (۲۵) دینار ملیں گے۔ ہر بھائی کو دو دینار اور بہن کو ایک دینار۔

اسی وجہ سے اس کو دیناریہ کہا جاتا ہے، اس کی پہیلی بجھائی جاتی ہے: ایک شخص نے چھ سو دینار وراثت میں چھوڑے، جس کے مرد اور عورت (۱۷) وارثین ہیں جن میں سے ایک کو صرف ایک دینار ملتا ہے۔

۱۳۔امتحان

اس مسئلہ میں پہیلی بجھائی جاتی ہے اور امتحان لیا جاتا ہے: ایک شخص کا انتقال ہو گیا اور اس نے کئی قسم کے وارثین چھوڑے جن میں سے ہر ایک صنف کی تعداد دس سے کم ہے، لیکن مسئلہ کی تصحیح تیس ہزار سے زیادہ سے ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

۲۴ تصحیح ۳۰۲۴۰ جزء السہم ۱۲۶۰

۴ بیویاں	۵ دادیاں	۷ بیٹیاں	۹ حقیقی بہنیں
۱/۸	۱/۶	۲/۳	ع
۳	۴	۱۶	۱
۳۷۸۰	۵۰۴۰	۲۰۱۶۰	۱۲۶۰

اس مسئلہ کی اصل ۲۴ ہے، بیویوں کو آٹھواں حصہ (۳)، دادیوں کو چھٹا حصہ (۴)، بیٹیوں کو دو تہائی (۱۶)، اور بہنوں کو عصبہ ہونے کی بنیاد پر باقی بچا ہوا ایک حصہ، بہنیں بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ مع الغیر ہوتی ہیں۔

وارثین میں سے ہر فریق کا حصہ ان کے عدد روٗس پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اور ہر فریق اور ان کے حصوں کے درمیان تباین ہے، اس لیے ایک کے عدد روٗس کو دوسرے کے عدد روٗس سے ضرب دیں گے، ضرب کا حاصل (۱۲۶۰) نکلتا ہے، جو جزء السہم ہے، اس کو مسئلہ کی اصل (۲۴) سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہوگا وہ تصحیح ہوگا: (۲۴×۱۲۶۰= ۳۰۲۴۰) پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب دیں گے:

بیویاں: (۳×۱۲۶۰=۳۷۸۰)

دادیاں: (۴×۱۲۶۰=۵۰۴۰)

بیٹیاں: (۱۶×۱۲۶۰=۲۰۱۶۰)

بہنیں: (۱×۱۲۶۰=۱۲۶۰) جملہ: ۳۰۲۴۰

میراث کے مختلف ابواب کے مسائل کا حل

حساب کی بحث سے پہلے ہم نے فرائض کے اکثر احکام کو مسائل کے حساب کی شکلوں کو بیان کیے بغیر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، علم فرائض کے علماء عام طور پر ہر باب میں ان کی شکلیں بیان کرنے کے عادی ہیں تاکہ اس کے احکام ذہن میں پیوست ہوجائیں اور میراث کی وارثوں میں تقسیم کے طریقوں کی وضاحت ہوجائے۔

ہم نے ان مسائل کے تذکرے کو حساب کی بحثوں کے بعد تک موخر اس لیے کیا کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ عام طور پر اس فن کو پڑھنے والوں کے لیے حساب کے اصولوں اور مسائل کے حل تک پہنچنے سے پہلے ہمارا کام مجہول قواعد اور اصولوں پر مبنی بن جائے گا۔

اب جب کہ ہم نے حساب کے مسائل کو پڑھ لیا ہے، ان مسائل کا تذکرہ معقول اور قابلِ قبول کام ہے، بلکہ یہ لازم اور ضروری ہے۔

ہم اس باب میں بعض مسائل اور ان کے حل کو پیش کررہے ہیں جن کا تعلق میراث کے مختلف ابواب سے ہے، تاکہ بات زیادہ واضح ہوجائے اور اس علم، اس کے احکام ومسائل کے قواعد ان لوگوں کے ذہنوں میں پیوست ہوجائیں جو اس سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور اس کو پڑھنے کی خواہش اور رغبت رکھتے ہیں۔ ہم اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس سے ہم کو اور ان طالبین کو فائدہ پہنچائے اور صحیح راستے کی ہدایت عطا فرمائے۔ **وھو حسبنا ونعم الوکیل۔**

حصے داروں اور عصبہ بننے والوں کے مسائل

۶

شوہر	ماں	حقیقی بھائی
۱/۲	۱/۳	ع
۳	۲	۱

تشریح

اس مسئلہ میں شوہر کو نصف ملے گا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع نہیں ہے، اسی طرح ماں کو ایک تہائی ملے گا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع اور ایک سے زیادہ بھائی بہن نہیں ہیں، حقیقی بھائی کو عصبہ کی بنیاد پر بچا ہوا حصہ ملے گا، کیوں کہ اس مسئلہ میں وہی میت کا سب سے قریبی وارث ہے، اور اس مسئلہ میں اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

مسئلہ کی اصل ۶ سے بنتی ہے، جو نصف کے مخرج اور ثلث (ایک تہائی) کے مخرج کو ضرب دینے کے بعد نکلا ہوا حاصل ہے، کیوں کہ دونوں مخارج میں تباین پایا جاتا ہے، اس وجہ سے میراث کے مجموعی حصے ۶ بن جاتے ہیں جس کو مسئلہ میں بیان کردہ طریقے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۲۴

بیٹی	ماں	بیوی	حقیقی بھائی
۱/۲	۱/۶	۱/۸	ع
۱۲	۴	۳	۵

تشریح

اس مسئلہ میں بیٹی کا حصہ نصف ہے، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں کا حصہ چھٹا ہے، کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، جو بیٹی ہے، بیوی کا حصہ آٹھواں ہے، کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور حقیقی بھائی باقی حصوں کا عصبہ کی بنیاد پر مستحق بنے گا۔

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے، کیوں کہ ثمن اور سدس کے مخارج میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے کسی ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے اور حاصل مسئلہ کی اصل بنے گا۔

جہاں تک نصف کے مخرج کا تعلق ہے تو وہ ثمن اور سدس کے مخرج میں داخل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

وراثت کے مجموعی حصے ۲۴ بنتے ہیں جیسا کہ واضح ہے اور اس کو مسئلہ میں بیان کردہ طریقے پر تقسیم کیا جائے گا۔

۱۲

پوتی	شوہر	ماں	علاتی بھائی
۱/۲	۱/۴	۱/۶	ع
۶	۳	۲	۱

تشریح:

پوتی کے لیے نصف ملے گا کیوں کہ میت کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور اس کو عصبہ بنانے والا بھی کوئی نہیں ہے، بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے جو پوتی ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور عصبہ کی بنیاد پر باقی بچا ہوا علاتی بھائی کو ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۲ ہے، کیوں کہ ربع (ایک چوتھائی) اور سدس (چھٹا) میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل نکلے گا وہ مسئلہ کی اصل بنے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ کے حصے ۱۲ بنیں گے اور اس کو شکل میں بیان کردہ طریقے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۱۲

حقیقی بہن	بیوی	اخیافی بھائی	حقیقی بھتیجا
۱/۲	۱/۴	۱/۶	ع
۶	۳	۲	۱

تشریح:

اس مسئلہ میں حقیقی بہن کو نصف ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب بنانے والا کوئی نہیں ہے اور نہ اس کو عصبہ بنانے والا کوئی ہے، بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع نہیں ہے۔

حقیقی بھتیجہ عصبہ بنے گا اور باقی حصوں کا مستحق بنے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۲ سے ہے کیوں کہ ربع اور سدس کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کو نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل نکلے گا وہ مسئلہ کی اصل بنے گا، اس اعتبار سے حصوں کی مجموعی تعداد ۱۲ بنتی ہے، جس کو شکل میں بیان کردہ طریقے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۶

حقیقی چچا	اخیافی بہن	ماں	علاتی بہن
ع	۱/۶	۱/۶	۱/۲
۱	۱	۱	۳

تشریح:

علاتی بہن کو تنہا ہونے اور اس کو محجوب کرنے یا عصبہ بنانے والا کوئی نہ رہنے کی وجہ سے نصف ملے گا، اور ماں کو چھٹا حصہ کیوں کہ ایک سے زیادہ بھائی بہن پائے جاتے ہیں، اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے، چچا کو عصبہ کی بنیاد پر باقی بچا ہوا حصہ ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ۶ بنتی ہے، ماں اور اخیافی بہن میں سے کسی ایک کا مخرج، کیوں کہ دونوں مخارج میں تماثل ہے، اور نصف کا مخرج ان میں داخل ہو جاتا ہے، جو اس میں بہن کا حصہ ہے۔

اس مسئلہ میں حصوں کی مجموعی تعداد چھ ہوتی ہے جن کو شکل میں بیان کردہ طریقے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۱۲

شوہر	بیٹا	باپ
۱/۴	ع	۱/۶
۳	۷	۲

تشریح:

اس مسئلہ میں شوہر کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا مذکر وارث فرع موجود ہے، اور باقی حصوں کا مستحق بیٹا عصبہ کی بنیاد پر بنے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۲ سے بنتی ہے، کیوں کہ ربع اور سدس کے مخارج میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہوگا اس کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا۔

اس مسئلہ میں کل حصے ۱۲ بنتے ہیں اور اس کو اوپر بیان کردہ شکل کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، جو بالکل واضح ہے۔

☆☆☆☆

۱۲

بیوی	ماں	اخیافی بہن	حقیقی بھائی
۱/۴	۱/۶	۱/۶	ع
۶	۳	۲	۱

تشریح:

اس مسئلہ میں بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، ماں کو

چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ ایک سے زیادہ بھائی بہن موجود ہیں، اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے، حقیقی بھائی عصبہ کی بنیاد پر باقی حصوں کا مستحق بنے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۲ سے بنتی ہے کیوں کہ سدس اور ربع کے مخرج میں توافق پایا جاتا ہے۔

مجموعی حصے ۱۲ بن جاتے ہیں جن کو شکل میں بیان کردہ طریقہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۱۲

شوہر	بیٹی	ماں	علاتی بھائی
۱/۴	۱/۲	۱/۶	ع
۳	۶	۲	۱

تشریح:

شوہر کو چوتھا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع پائی جاتی ہے جو بیٹی ہے، اور بیٹی کو نصف ملے گا، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کی وارث فرع موجود ہے، اور علاتی بھائی عصبہ کی بنیاد پر باقی حصوں کا مستحق بنے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۲ سے بنے گی کیوں کہ ربع اور سدس کے مخرج میں توافق ہے، اس لیے کسی ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا۔

مجموعی حصے ۱۲ ہیں جن کو مندرجہ بالا شکل میں بیان کردہ طریقے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۴

شوہر	پوتی	حقیقی بھتیجا
۱/۴	۱/۲	ع
۱	۲	۱

تشریح:

شوہر کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ میت کی وارث فرع موجود ہے، جو پوتی ہے، اور پوتی کو نصف ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا یا محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور حقیقی بھتیجے کو عصبہ کی بنیاد پر باقی حصہ ملے گا۔

مسئلہ کی اصل چار سے بنے گی کیوں کہ ربع اور نصف کے مخرج میں تداخل ہے، اس لیے بڑے مخرج کو لیا جائے گا اور اس کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ کے ۴ حصے بنتے ہیں جس کی تقسیم واضح ہے۔

☆☆☆☆

۱۲

شوہر	پوتا	ماں	باپ
۱/۴	ع	۱/۶	۱/۶
۳	۵	۲	۲

تشریح:

بیوی کے لیے چوتھا حصہ، کیوں کہ میت کا وارث فرع پوتا موجود ہے، اور ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، باپ کو اسی وجہ سے چھٹا حصہ ملے گا، البتہ پوتا عصبہ کی بنیاد پر باقی حصوں کا حق دار بنے گا۔

مسئلہ کی اصل بارہ سے ہے، کیوں کہ سدس اور ربع کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا۔

اس میں حصوں کی مجموعی تعداد ۱۲ ہے جن کو مذکورہ شکل کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۲۴

بیوی	بیٹا	باپ	ماں
۱/۸	ع	۱/۶	۱/۶
۳	۱۳	۴	۴

تشریح:

بیوی کے لیے آٹھواں حصہ، کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، باپ کو چھٹا حصہ کیوں کہ میت کا مذکر وارث فرع موجود ہے، اور ماں کو بھی اسی سبب کی بنیاد پر چھٹا حصہ، اور بچا ہوا مال عصبہ کی بنیاد پر بیٹے کو ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے، کیوں کہ ثمن اور سدس کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کے وفق یعنی نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا۔ جو مسئلہ کے حصوں کے برابر ہوتا ہے اور وارثوں میں اس کی تقسیم واضح ہے۔

☆☆☆☆

۲۴

بیوی	بیٹی	ماں	باپ
۱/۸	۱/۲	۱/۶	۱/۶+ ع
۳	۱۲	۴	۴+۱=۵

تشریح:

اس مسئلہ میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا (۳) کیوں کہ اس میں میت کا وارث فرع موجود ہے، بیٹی کو نصف (۱۲) ملے گا، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں کو چھٹا حصہ (۴) ملے گا اور باپ کو حصے کی بنیاد پر چھٹا حصہ (۴) ملے گا اور بیٹی کے ساتھ اس کے پائے جانے کی وجہ سے وہ عصبہ بنے گا اور اس کو عصبہ کی بنیاد پر باقی بچا ہوا حصہ ملے گا: (۴+۱=۵)

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے کیوں کہ ثمن اور سدس کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے۔

☆☆☆☆

۲۴

۳ بیویاں	پوتا	باپ	ماں
۱/۸	ع	۱/۶	۱/۶
۳	۱۳	۴	۴

تشریح:

تین بیویوں کو آٹھواں حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، باپ کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا مذکر وارث فرع موجود ہے، ماں کو اسی سبب کی وجہ سے چھٹا حصہ ملے گا اور باقی بچا ہوا بیٹے کو عصبہ کی بنیاد پر ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے، جو ثمن کے مخرج کے نصف یعنی ۴ کو سدس کے مکمل مخرج یعنی ۶ سے ضرب دینے کا حاصل ہے، یہی میراث کے حصے ہیں جس کی تقسیم شکل میں بالکل واضح ہے۔

☆☆☆☆

۶

۲ بیٹیاں	باپ	ماں
۲/۳	۱/۶	۱/۶
۴	۱	۱

تشریح:

دو بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا کیوں کہ وہ ایک سے زائد ہیں اور ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں اور باپ دونوں کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا، کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے۔

مسئلہ کہ حصے ۶ ہوتے ہیں، کیوں کہ دو تہائی اور چھٹے حصے کے مخارج میں تداخل ہے، اس لیے ان میں سے بڑے مخرج کو لیا جائے گا جو ۶ ہے، وارثین کے درمیان اس کی تقسیم کا طریقہ بالکل واضح ہے۔

☆☆☆☆

۲۴

۲ پوتیاں	ماں	بیوی	علاتی بھائی
۲/۳	۱/۶	۱/۸	ع
۱۶	۴	۳	۱

تشریح:

دو پوتیوں کو دو تہائی ملے گا، کیوں کہ وہ ایک سے زائد ہیں اور ان کو محجوب کرنے والا یا ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع ہے، اور علاتی بھائی کو عصبہ کی بنیاد پر باقی بچے ہوئے حصے ملیں گے، کیوں کہ اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے، کیوں کہ دو تہائی کا مخرج ۳ چھ میں داخل ہو جاتا ہے جو چھٹے حصے کا مخرج ہے، چھ اور آٹھ میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے ایک کے نصف کو دوسرے کے کل سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہو گا وہ مسئلہ کی اصل بنے گا، یہی تعداد حصوں کی مجموعی تعداد ہے، جن کو وارثین میں تقسیم کا طریقہ واضح ہے اور مذکورہ شکل میں اس کو واضح بھی کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆

۶

۲ حقیقی بہنیں	ماں	اخیافی بہن
۲/۳	۱/۶	۱/۶
۴	۱	۱

تشریح:

دو حقیقی بہنوں کو دو تہائی ملے گا کیوں کہ وہ ایک سے زائد ہیں اور ان کو محجوب کرنے یا عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ ایک سے زائد بھائی بہن ہیں، اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

مسئلہ کی اصل ۶ ہے، کیوں کہ دو تہائی کا مخرج سدس کے مخرج ۶ میں داخل ہو جاتا ہے، اور ماں اور اخیافی بہن کے حصوں کا مخرج ایک ہی ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک مخرج کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا، جو ۶ ہے، یہی ترکہ کے مجموعی حصے ہیں۔

دو بہنوں کو دو تہائی (۴) حصے، ماں کو چھٹا حصہ (۱) حصہ اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا۔

☆☆☆☆

۶

۲ علاتی بہنیں	دادی	اخیافی بھائی
۲/۳	۱/۶	۱/۶
۴	۱	۱

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ سے بنے گی، کیوں کہ دادی اور اخیافی بھائی کے حصوں میں تماثل ہے، اور دو تہائی کا مخرج ان میں داخل ہو جاتا ہے۔

دو علاتی بہنوں کو دو تہائی (۴)، دادی کو چھٹا حصہ (۱) اور اخیافی بھائی کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا۔

☆☆☆☆

۱۲

ماں	بیوی	حقیقی بھائی
۱/۳	۱/۴	ع
۴	۳	۵

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۱۲ بنتی ہے، کیوں کہ ایک تہائی اور ایک چوتھائی کے مخرج میں تباین پایا

جاتا ہے، اس لیے دونوں کو ضرب دیا جائے گا، جس کا حاصل ۱۲ ہوتا ہے۔

ماں کو ایک تہائی (۴) ملے گا کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع اور متعدد بھائی بہن نہیں ہیں، بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع نہیں پایا جاتا ہے، اور باقی بچا ہوا عصبہ کی بنیاد پر حقیقی بھائی کو ملے گا۔

☆☆☆☆

۱۲

۲ اخیافی بہن	دو اخیافی بھائی	ماں	بیوی	حقیقی بھائی
۱/۳		۱/۶	۱/۴	ع
۴		۲	۳	۳

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۴ کے نصف کو مکمل ۶ سے ضرب دینے کا حاصل ۱۲ ہے، کیوں کہ سدس اور ربع کے مخارج میں توافق پایا جاتا ہے، جہاں تک ایک تہائی کے مخرج کا تعلق ہے تو وہ سدس میں داخل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو چھوڑ کر بڑے مخرج کو لیا جائے گا۔

اخیافی بھائی بہنوں کو ایک تہائی (۴) ملے گا، ان میں سے ہر ایک کو ایک حصہ، کیوں کہ وہ برابر برابر وارث بنتے ہیں۔

ماں کو چھٹا (۲) حصے ملیں گے، کیوں کہ متعدد بھائی بہن پائے جاتے ہیں، اور بیوی کو چوتھا حصہ (۳) ملے گا، کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع نہیں ہے، اور باقی بچا ہوا (۳) حقیقی بھائی کو عصبہ کی بنیاد پر ملے گا۔

☆☆☆☆

٦

دادا	دادی	بیٹی	پوتی
١/٦	١/٦	١/٢	١/٦
١	١	٣	١

تشریح:

اس مسئلہ کی اصل ٦ بنتی ہے، کیوں کہ سدس کے مخارج میں تماثل ہے اور نصف اس میں داخل ہوجاتا ہے،

دادا کو چھٹا حصہ (١)، کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، دادی کو بھی چھٹا (١) حصہ، بیٹی کو نصف (٣)، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، اور پوتی کو چھٹا حصہ (١) کیوں کہ وہ بیٹی کے ساتھ ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے۔

☆☆☆☆

٦

ماں	حقیقی بہن	علاتی بہن	اخیافی بہن
١/٦	١/٢	١/٦	١/٦
١	٣	١	١

تشریح:

مسئلہ کی اصل ٦ ہے، کیوں کہ ماں، علاتی بہن اور اخیافی بہن کے حصوں کے مخارج یکساں ہیں، اور حقیقی بہن کے حصے کا مخرج ان میں داخل ہوجاتا ہے۔

ماں کو چھٹا حصہ (١) ملے گا کیوں کہ متعدد بہنیں پائی جاتی ہیں، اور حقیقی بہن کو نصف (٣) ملے گا کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب کرنے اور عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، علاتی

بہن کو چھٹا حصہ(۱) دو تہائی کو مکمل کرنے کی بنیاد پر ملے گا، کیوں کہ اس کو محجوب کرنے اور عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے،اور اخیافی بہن کو چھٹا (۱) ملے گا، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

☆☆☆☆

۲۴

باپ	دادا	بیٹا	پوتا	دادی	بیوی
۱/۶	م	ع	م	م	۱/۸
۴	-	۱۷	-	-	۳

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے بنتی ہے، جو سدس کے مخرج کے نصف یعنی ۳ کو ثمن کے مکمل مخرج سے ضرب دینے کا حاصل ہے، کیوں کہ ان دونوں میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے۔

باپ کو وراثت کا چھٹا حصہ (۴) ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور بیوی کو آٹھواں حصہ (۳) ملے گا، اور باقی بچا ہوا بیٹے کو عصبہ بننے کی بنیاد پر ملے گا (۱۷)، دادا باپ کی وجہ سے محجوب ہوگا کیوں کہ باپ اس کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے اور باپ کے واسطے سے وہ میت تک پہنچتا ہے، جب یہ واسطہ پایا جائے تو وہ محجوب ہو جاتا ہے۔

پوتا بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے محجوب ہوگا، کیوں کہ بیٹا اس کے مقابلے میں زیادہ قریب ہے۔

دادی باپ کی وجہ سے محجوب ہو جائے گی کیوں کہ وہ باپ کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے، اور جو کوئی کسی واسطے سے میت تک پہنچتا ہے تو اس واسطے کی موجودگی میں وہ محجوب ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆

۶

دو پوتیاں	۲ بیٹیاں	ماں	باپ
م	۲/۳	۱/۶	۱/۶
۰	۴	۱	۱

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ سے بنتی ہے، کیوں کہ ماں اور باپ کے حصوں کا مخرج ایک ہی ہے، اور بیٹیوں کا مخرج دو تہائی اس میں داخل ہو جاتا ہے۔

باپ کو میراث میں چھٹا حصہ (۱) ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور ماں کو بھی اسی وجہ سے چھٹا حصہ (۱) ملے گا، اور بیٹیوں کو دو تہائی (۴) ملے گا، ہر بیٹی کو (۲) حصے، کیوں کہ ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے۔

پوتیاں محجوب ہو جاتی ہیں، کیوں کہ دو تہائی میں سے ان کے لیے کچھ بچا نہیں ہے، کیوں کہ دو تہائی بیٹیوں کا حصہ ہے، اگر اس میں سے کچھ بچتا ہے تو پوتے اور پوتیوں کو ملتا ہے۔

☆☆☆☆

۲

بیٹی	اخیافی بھائی	علاتی بھائی	حقیقی بھائی
۱/۲	م	م	ع
۱	۰	۰	۱

تشریح:

مسئلہ کی اصل دو ہے کیوں کہ بیٹی کے حصے کا مخرج یہی ہے۔

بیٹی کو وراثت میں نصف (۱) ملے گا کیوں کہ اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے اور وہ

تنہا ہے، حقیقی بھائی کو بچا ہوا نصف عصبہ ہونے کی بنیاد پر ملے گا، علاتی بھائی حقیقی بھائی کی وجہ سے محجوب ہو جائے گا کیوں کہ حقیقی اس سے زیادہ طاقت ور ہے کیوں کہ اس کا رشتہ میت سے ماں اور باپ دونوں جانب سے ہے، جب کہ علاتی بھائی کا رشتہ صرف باپ کی طرف سے ہے، اخیافی بھائی بیٹی کی وجہ سے محجوب ہوگا۔

☆☆☆☆

۲

بیٹی	حقیقی بہن	علاتی بھائی
۱/۲	ع	م
۱	۱	۰

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۲ ہے جو بیٹی کے حصے کا مخرج ہے۔

بیٹی کو نصف (۱) ملے گا، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا میت کا بیٹا نہیں ہے، حقیقی بہن عصبہ مع الغیر ہو کر باقی بچا ہوا حصہ لے گا، جو نصف (۱) ہے، اس میں مشہور قاعدہ پر عمل کیا گیا ہے: ''بہنیں بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں''۔

علاتی بھائی حقیقی بہن کی وجہ سے محجوب ہوگا، کیوں کہ وہ عصبہ مع الغیر بن گئی ہے، جس کی وجہ سے حقیقی بھائی کی قوت میں آگئی ہے، جس کی وجہ سے اس نے علاتی بھائی کو محجوب کر دیا ہے۔

☆☆☆☆

۶

حقیقی بھتیجا	اخیافی بھائی	چچا	حقیقی بہن
ع	۱/۶	م	۱/۲
۲	۱	۰	۳

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ ہے کیوں کہ نصف اور سدس کے مخارج میں تداخل ہے۔
اخیافی بھائی کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا، حقیقی بہن کو نصف (۳) ملے گا اور باقی بچا ہوا (۲) حقیقی بھتیجے کو ملے گا، کیوں کہ وہ میت سے زیادہ قریب ہے۔
چچا حقیقی بھتیجے کی وجہ سے محجوب ہوگا، کیوں کہ میراث میں بھائی کی جہت چچا کی جہت پر مقدم ہوتی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

☆☆☆☆

۶

دادی	۲ حقیقی بہن	۲ علاتی بہن	اخیافی بہن
۱/۶	۲/۳	م	۱/۶
۱	۴	۰	۱

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ سے بنتی ہے جو سدس کا مخرج ہے۔
دادی کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا، حقیقی بہنوں کو دو تہائی (۴) ملے گا اور اخیافی بہن کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا۔
علاتی بہن حقیقی بہنوں کی وجہ سے محجوب ہو جائے گی، کیوں کہ وہ بہنوں کا حصہ دو تہائی

پورا لے لیتی ہیں۔

☆☆☆☆

۶

بیٹی	پوتی	حقیقی بہن	علاتی بھائی	چچا
۱/۲	۱/۶	ع	م	م
۳	۱	۲	۰	۰

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ بنتی ہے کیوں کہ بیٹی اور پوتی کے مخارج میں تداخل ہے۔

بیٹی کو نصف (۳) ملے گا، پوتی کو چھٹا حصہ (۱) دو تہائی کو مکمل کرنے کے لیے، اور باقی بچا ہوا حقیقی بہن کو ملے گا کیوں کہ وہ عصبہ مع الغیر بنتی ہے مشہور قاعدے کے مطابق: ''بہنیں بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں''۔

علاتی بھائی اور چچا حقیقی بہن کی وجہ سے محجوب ہو جاتے ہیں، کیوں کہ وہ عصبہ مع الغیر ہونے کی وجہ سے حقیقی بھائی کی طاقت میں آ گئی ہے۔

☆☆☆☆

۶

ماں	باپ	حقیقی بھائی	۲ بیٹیاں	پوتی	پوتا
۱/۶	۱/۶	م	۲/۳	ع	ع
۱	۱	۰	۴	۰	۰

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۶ ہے کیوں کہ باپ اور ماں کے حصوں کے مخارج میں مماثلت پائی جاتی ہے اور دو تہائی کا مخرج اس میں داخل ہو جاتا ہے، جس کو اصطلاح میں تداخل کہا جاتا ہے۔

باپ کو چھٹا حصہ (۱)، کیوں کہ میت کا وارث فرع پایا جاتا ہے، ماں کو بھی اسی سبب کی وجہ سے چھٹا حصہ (۱)، حقیقی بھائی باپ اور پوتے کی وجہ سے محجوب ہو جاتا ہے۔

بیٹیوں کو دو تہائی (۴) کیوں کہ بہنیں ایک سے زیادہ ہیں اور ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، پوتی اور پوتا دونوں مل کر عصبہ بنتے ہیں، لیکن کچھ نہ بچنے کی وجہ سے ان کو کچھ بھی نہیں ملے گا، عصبہ کا یہی حکم ہے کہ بچا تو ملتا ہے، ورنہ محروم ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆

۲۴

دو بیٹیاں	۳ پوتیاں	پوتے کا بیٹا	بیوی	حقیقی بھائی
۲/۳	ع	ع	۱/۸	م
۱۶	۳	۲	۳	۰

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۲۴ ہے جو دو تہائی کے مخرج ۳ کو ثمن کے مخرج ۸ سے ضرب دینے کا حاصل ہے کیوں کہ ان دونوں میں تباین پایا جاتا ہے۔

بیٹیوں کو دو تہائی (۱۶) ملے گا کیوں کہ وہ ایک سے زائد ہیں اور ان کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، بیوی کو آٹھواں حصہ (۳) ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، پوتیاں پوتے کے بیٹے کے ساتھ عصبہ بنتی ہیں، اگر چہ وہ ان سے نیچے کا ہے، کیوں کہ ان کو اس کی ضرورت ہے، اگر وہ ان کو عصبہ نہیں بنائے گا تو وہ محجوب ہو جائیں گی کیوں کہ بیٹیوں کو مکمل دو تہائی حصہ مل چکا ہے۔ حقیقی بھائی پوتے کے بیٹے کی وجہ سے محجوب ہو جائے گا، کیوں کہ میراث میں اس کی جہت بھائی کی جہت پر مقدم ہے۔

۶

شوہر	ماں	باپ
۱/۲	۱/۳ ما بقی	ع
۳	۱	۲

تشریح:

یہ مسئلہ عمریتین میں سے ایک ہے۔

اس کی اصل ۶ بنتی ہے،شوہر کو نصف (۳) حصے، ماں کو بچے ہوئے میں سے ایک تہائی یعنی ایک حصہ اور باپ کو عصبہ کی بنیاد پر بچے ہوئے ۲ حصے ملیں گے۔

☆☆☆☆

۱۲

بیوی	ماں	باپ
۱/۴	۱/۳ ما بقی	ع
۳	۳	۶

تشریح:

مسئلہ کی اصل ۱۲ سے ہوگی، کیوں کہ ماں اور بیوی کے مخارج کے درمیان تباین پایا جاتا ہے،اس لیے ایک کو دوسرے سے ضرب دیا جائے گا۔

بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا جو کل ۱۲ حصوں میں سے ۳ بنتے ہیں، ماں کو بچے ہوئے میں سے ایک تہائی ملے گا جو بچے ہوئے ۹ حصوں میں سے ۳ بنتے ہیں،اور باقی حصے (۶) عصبہ کی بنیاد پر باپ کو ملیں گے، یہ دوسرا مسئلہ عمریتان ہے۔

۶ تصحیح ۱۸ جزء السہم ۳

شوہر	ماں	۲اخیافی بھائی	حقیقی بھائی
۱/۲	۱/۶	۱/۳	
۳	۱	۲	
۹	۳	۴	۲

تشریح:

اس مسئلہ کو مشرّکہ اور مشترکہ کہا جاتا ہے۔

اس کی اصل ۶ ہے کیوں کہ اس کے مخارج ماں کے حصے میں داخل ہو جاتے ہیں، اس لیے بڑے مخرج کو مسئلہ کی اصل بنایا جائے گا۔

شوہر کو نصف (۳) ملے گا، ماں کو چھٹا (۱) حصہ ملے گا۔

عصبہ کے قواعد کا تقاضا یہ ہے اخیافی بھائی کو ایک تہائی دیا جائے اور حقیقی بھائی کو عصبہ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہ ملے، کیوں کہ حصے داروں کو دینے کے بعد کچھ بھی بچتا نہیں ہے۔

لیکن سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ حقیقی بھائی کو اخیافی بھائیوں کے ساتھ ایک تہائی میں شریک کیا جائے اور ان کے درمیان ملا ہوا حصہ برابر تقسیم کیا جائے۔

ایک تہائی دو حصوں کے بقدر ہوتا ہے، اور عدد رؤوس تین ہیں، اس لیے اس میں تصحیح کی ضرورت پڑی، عدد رؤوس اور حصوں میں تباین ہونے کی وجہ سے ہم نے عدد رؤوس کو لیا اور اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا، جس کے نتیجے میں مسئلہ کی تصحیح ۱۸ ہو گئی: (۳×۶=۱۸)

پھر ہم نے ہر فریق کے حصے کو جزء السہم ۳ سے ضرب دیا تو شوہر کو ۹ حصے، ماں کو ۳ حصے، اخیافی بھائیوں کو ۴ حصے اور حقیقی بھائی کو ۲ حصے ملے۔

بھائی بہنوں کے ساتھ دادا کے مسائل

یہاں بھائی بہنوں سے مراد حقیقی اور علاتی بھائی بہن ہیں۔

اخیافی بھائیوں کو دادا مجوب کر دیتا ہے، اس صورت میں وہ دادا کے ساتھ وارث نہیں بنتے ہیں۔

ہم نے بھائی بہنوں کے ساتھ دادا کے احکام اور حالتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور ہم نے اس کی کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں، لیکن معروف حسابی شکل میں ان مسائل کو حل نہیں کیا گیا ہے۔

ہم یہاں پر ان مسائل کو ان کی اصطلاحی شکل میں حل کر کے پیش کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ تھوڑی سی تشریح بھی کر رہے ہیں، تا کہ اور زیادہ وضاحت ہو جائے۔

۱۔ دادا اور بہن بھائیوں کے ساتھ کوئی حصے دار نہ ہو:

۲

دادا	حقیقی بھائی
۱	۱

☆☆☆☆

۳

دادا	حقیقی بہن
۲	۱

۴

دو حقیقی بہنیں	دادا
۲	۲

☆☆☆☆

۵

۳ حقیقی بہنیں	دادا
۳	۲

☆☆☆☆

۵

حقیقی بہن	حقیقی بھائی	دادا
۱	۲	۲

ان پانچ مسائل میں دادا کے لیے بہن بھائیوں کے ساتھ مقاسمہ ہے، یعنی ان کے درمیان وراثت دادا کو بھائی کی طرح مان کر تقسیم کی جائے گی اور اس کو عورت کے دوگنا حصہ دیا جائے گا، کیوں کہ ان مسائل میں دادا کے لیے مقاسمہ بہتر ہے۔

ان تمام مسائل میں مسئلہ کی اصل عدد رؤوس سے ہوگی، ہر مرد کو عورتوں کے مقابلے میں دو شمار کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۳ تصحیح ۹ جزء السہم ۳

دادا	۳ بھائی
۱/۳	۳
۱	۲
۳	۶

☆☆☆☆

۳ تصحیح ۱۵ جزء السہم ۵

دادا	بھائی	۳ بہنیں
۱/۳	ع	ع
۱	۲	
۵	۴	۶

☆☆☆☆

۳ تصحیح ۱۵ جزء السہم ۵

دادا	۵ بہنیں
۱/۳	۲/۳
۱	۲
۵	۱۰

ان تین مسائل میں دادا کو وراثت میں ایک تہائی ملے گا، کیوں کہ مقاسمہ کے مقابلے میں یہ اس کے لیے مفید ہے اور بھائی باقی سب لیں گے۔

ان مسائل کی اصل دادا کے حصے ایک تہائی کا مخرج (۳) ہے۔

البتہ بھائیوں کا حصہ ان کے عدد رؤس پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے عدد رؤس کو لیا جائے کیوں کہ حصوں کے ساتھ تباین پایا جاتا ہے، اور اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہوگا وہ مسئلہ کی تصحیح بنے گا، پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب دیں گے تا کہ جو حاصل ہوتا ہے اس سے وراثت وارثین میں برابر تقسیم ہو جائے۔

☆☆☆☆

۳

دادا	۲ بھائی
۱/۳	ع
۱	۲

☆☆☆☆

۳ تصحیح ۶ جزء السہم ۲

دادا	۴ بھائی
۱/۳	ع
۱	۲
۲	۴

۳ تصحیح ۶ جزء السہم ۲

دادا	۲ بہنیں	بھائی
۱/۳	ع	ع
۱	۲	
۲	۲	۲

دادا کے لیے ان تین مسائل میں مقاسمہ اور ایک تہائی دونوں یکساں ہوتا ہے، اس لیے وہ ایک تہائی لے گا اور باقی بھائی بہنوں کو چھوڑ دے گا۔

ان مسائل کی اصل ۳ ہے، جو دادا کے حصے کا مخرج ہے، آخری دو مسائل میں حصے بھائیوں برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے ان میں تصحیح کی ضرورت ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ عدد رؤس اور حصوں میں نصف سے توافق ہے، اس لیے مسئلہ کی اصل کو عدد رؤس کے وفق سے ضرب دیں گے تاکہ ۶ سے مسئلہ کی تصحیح ہو جائے، پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب دیں گے تو جس حاصل ہوگا اس سے وراثت برابر تقسیم ہو جائے گی۔

☆☆☆☆

جب دادا اور بہن بھائیوں کے ساتھ کوئی حصے والا ہو:

۲ تصحیح ۴ جزء السہم ۲

شوہر	دادا	بھائی
۱/۲	ع	
۱	۱	
۲	۱	۱

☆☆☆☆

تصحیح ۱۶ ۴ جزء السہم ۴

بیوی	دادا	۲ بہنیں
۱/۴	ع	
۱	۳	
۴	۶	۶

ان دو مسئلوں میں دادا مقاسمہ کی بنیاد پر وراثت لے گا، کیوں کہ اس کے لیے یہی مفید اور بہتر ہے۔

پہلے مسئلہ کی اصل ۲ ہے جو شوہر کے حصے کا مخرج ہے۔

شوہر کو دو میں سے ایک حصہ ملے گا، اس کے بعد دادا اور بھائی کے لیے ایک حصہ بچے گا، جو ان دونوں پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے اصل مسئلہ کو عدد رؤوس ۲ سے ضرب دیں گے، جس سے مسئلہ کی تصحیح ۴ ہو جائے گی، پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم (۲) سے ضرب دیں گے، جو نتیجہ نکلے گا وہ وارثین پر تقسیم ہو جائے گا۔

دوسرے مسئلہ میں اصل ۴ ہے جو بیوی کے حصے کا مخرج ہے۔

بیوی کو ایک حصہ ملے گا اور باقی تین حصے دادا اور دو بہنوں کے لیے ہوں گے، جو ان دونوں پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے مسئلہ کی تصحیح ۱۶ سے کی جائے گی، مسئلہ کی اصل کو دادا اور بہنوں کے عدد رؤوس سے ضرب دیا جائے گا کیوں کہ عدد اور حصوں میں تباین ہے۔

پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم (۴) سے ضرب دیا جائے گا، حاصل وارثین پر تقسیم ہو جائے گا، جیسا کہ دونوں مسئلوں میں واضح ہے۔

☆☆☆☆

۱۸

ماں	دادا	۵ بھائی
۱/۶	۱/۳ ما بقی	ع
۳	۵	۱۰

اس مسئلہ کی اصل ۱۸ ہے، کیوں کہ سدس کے مخرج (۶) کو ثلث ما بقی کے مخرج (۳) سے ضرب دیا گیا ہے۔

ماں کو چھٹا حصہ (۳)، دادا کو ثلث ما بقی (۵) حصے دیے جائیں گے کیوں کہ اس کے لیے مقاسمہ اور چھٹے حصے کے مقابلے میں یہی زیادہ مفید ہے، باقی حصے بھائیوں کو عصبہ ہونے کی بنیاد پر ملے گا، جو دس حصے ہیں، ہر بھائی کو دو حصے۔

☆☆☆☆

۱۸

ماں	دادا	۲ بھائی
۱/۶	۱/۳ ما بقی	ع
۳	۵	۱۰

اس مسئلہ میں دادا کے لیے ثلث ما بقی اور مقاسمہ یکساں ہے، اس لیے اس کو ثلث ما بقی دیا جائے گا۔

مسئلہ کی اصل ۱۸ ہے کیوں کہ سدس کے مخرج (۶) کو ثلث ما بقی کے مخرج (۳) سے ضرب دیا گیا ہے۔

ماں کو چھٹا حصہ ملے گا جو تین حصے بنتے ہیں، دادا کو ثلث ما بقی ملے گا جو پانچ حصے بنتے ہیں اور بچے ہوئے دس حصے بھائیوں کو دیے جائیں گے۔

۶

بھائی	دادا	دادی	شوہر
ع	۱/۶	۱/۶	۱/۲
۱	۱	۱	۳

اس مسئلہ میں دادا کے لیے چھٹا حصہ اور مقاسمہ یکساں ہے، اس لیے اس کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔

مسئلہ کی اصل ۶ ہے جو سدس کا مخرج ہے۔

شوہر کو نصف (۳) ملے گا، دادی کو چھٹا (۱) ملے گا، دادا کو چھٹا (۱) حصہ ملے گا اور باقی بچا ہوا ایک حصہ عصبہ کی بنیاد پر بھائی کو ملے گا۔

☆☆☆☆

۶ تصحیح ۱۸ جزءالسہم ۳

۳ بھائی	دادا	شوہر
ع	۱/۶	۱/۲
۲	۱	۳
۶	۳	۹

اس مسئلہ میں دادا کے لیے چھٹا حصہ اور ثلث باقی یکساں ہے، اس لیے اس کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔

مسئلہ کی اصل چھ ہے جو دادا کے حصے کا مخرج ہے، تصحیح ۱۸ سے ہوتی ہے، کیوں کہ عدد رؤوس اور حصوں میں تباین پایا جاتا ہے، اس لیے عدد کو مسئلہ کی اصل سے ضرب دیا جائے گا، اس کے بعد وراثت کی تقسیم واضح ہے۔

٦

شوہر	دادا	۲بھائی
۱/۲	۱/٦	ع
۳	۱	۲

اس مسئلہ میں دادا کے لیے ثلث باقی، چھٹا حصہ اور مقاسمہ سب یکساں ہوتے ہیں، اس لیے اس کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔

مسئلہ کی اصل ٦ ہے جو دادا کے حصے کا مخرج ہے، اور شوہر کے حصے کا مخرج اس میں داخل ہوجاتا ہے، اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

شوہر کو نصف (۳ حصے) ملے گا، دادا کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا اور باقی دو حصے عصبہ کی بنیاد پر دو بھائیوں کے ملیں گے، ہر بھائی کو ایک حصہ۔

☆☆☆☆

٦

۲بیٹیاں	ماں	دادا	بھائی
۲/۳	۱/٦	۱/٦	ع
۴	۱	۱	۰

اس مسئلہ کی اصل ٦ ہے، جو ماں یا دادا کے حصے کا مخرج ہے، کیوں کہ ان دونوں میں تماثل پایا جاتا ہے اور بیٹیوں کے حصے کا مخرج اس میں داخل ہے۔

دو بیٹیوں کو دو تہائی (۴) ملے گا، ماں کو چھٹا حصہ (۱)، دادا کو چھٹا حصہ (۱) ملے گا۔

وراثت میں بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا ہے، اس لیے وہ محروم ہوجائے گا، اور نہ دادا کے حصے میں شریک ہوگا، کیوں کہ دادا کو بھائیوں کے ساتھ چھٹے حصے سے کم نہیں ملتا ہے، چاہے نام کا چھٹا حصہ ہی ملے۔

۱۲عول الی ۱۳

شوہر	۲بیٹیاں	دادا	بھائی
۱/۴	۲/۳	۱/۶	ع
۳	۸	۲	۰

مسئلہ کی اصل ۱۲ہے اور عول الی ۱۳ ہے۔

اس میں بھائی محروم ہو جاتا ہے، کیوں کہ حصے والوں کو دینے کے بعد اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا ہے اور دادا کو عول کے ساتھ چھٹا حصہ ملتا ہے۔

☆☆☆☆

۱۲عول الی ۱۵

۲بیٹیاں	شوہر	ماں	دادا	بھائی
۲/۳	۱/۴	۱/۶	۱/۶	ع
۸	۳	۲	۲	۰

اس مسئلہ کی اصل ۱۲ ہے اور اس میں حصے بڑھ کر ۱۵ ہو گئے ہیں، اور حصے والوں کو دینے کے بعد بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے، اور دادا کو عول کے ساتھ چھٹا حصہ ملا ہے جیسا کہ ہر وارث کو عول کے ساتھ حصہ دیا گیا ہے۔

☆☆☆☆

۶

شوہر	ماں	دادا	بھائی
۱/۲	۱/۳	۱/۶	ع
۳	۲	۱	۰

اس مسئلہ میں بھی بھائی محروم ہو جاتا ہے، کیوں کہ حصے والوں کو دینے کے بعد کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔

یہ مسئلہ پہلے سے اس حیثیت سے مختلف ہے کہ دادا بھائی کے ساتھ مل کر ماں کو ایک تہائی سے چھٹے حصے کی طرف حجبِ نقصان نہیں کرتا ہے، بلکہ ماں ان دونوں کی موجودگی کے باوجود مکمل ایک تہائی لیتی ہے، جیسا کہ مسئلہ کے حل میں واضح ہے۔

☆☆☆☆

۳

دادا	حقیقی بھائی	علاتی بھائی
۱/۳	ع	م
۱	۲	۰

اس مسئلہ میں حقیقی بھائی کے ساتھ علاتی بھائی کو دادا کے خلاف شمار کیا جائے پھر حقیقی بھائی اس کو محجوب کردے گا اور اس کا حصہ بھی لے لے گا، اس سے دادا کا حصہ آدھے سے گھٹ کر ایک تہائی رہ جائے گا۔

دادا کے لیے ایک اور حقیقی بھائی کے لیے دو، اور علاتی بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں کیوں کہ وہ محجوب ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆

۱۲

دادا	بیوی	حقیقی بھائی	علاتی بھائی
۱/۳ مابقی	۱/۴	ع	م
۳	۳	۶	۰

مسئلہ ۱۲ سے بنے گا جو دادا کے مخرج (۳) کو بیوی کے مخرج (۴) سے ضرب دینے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

دادا کو ثلث باقی (۳) ملیں گے کیوں کہ یہ اور مقاسمہ اس کے حق میں یکساں ہیں، بیوی کو چوتھائی (۳) باقی بچے ہوئے ۶ حصے بھائی کو ملیں گے، علاتی بھائی کو دادا کے خلاف شمار کیا گیا ہے اور دونوں کا حصہ حقیقی بھائی کو دیا گیا ہے۔

اور علاتی بھائی حقیقی بھائی کی وجہ سے محجوب ہے کیوں کہ حقیقی بھائی رشتے داری میں اس سے زیادہ طاقت ور ہے۔

☆☆☆☆

۳

دادا	۲ حقیقی بہنیں	علاتی بھائی
۱/۳	۲/۳	م
۱	۲	۰

مسئلہ کی اصل ۳ ہے جو دادا کے حصے کا مخرج ہے۔

دادا کو ایک تہائی (۱) ملے گا جو اس کے حق میں مقاسمہ کے برابر ہے، اور باقی حقیقی بہنوں کو ملے گا جو دو تہائی ہے، اور علاتی بھائی محروم ہو جائے گا، کیوں کہ اس کے لیے کچھ بھی باقی نہیں ہے، دادا کے خلاف علاتی بھائی کو حقیقی بہنوں کے ساتھ شمار کیا جائے گا، جس کی وجہ سے اس کا حصہ نصف سے گھٹ کر ایک تہائی ہو گیا ہے۔

☆☆☆☆

۶

شوہر	دادا	حقیقی بہن	۲علاتی بھائی
۱/۲	۱/۶	۱/۲	ع
۳	۱	۲	۰

مسئلہ کی اصل ۶ ہے جو دادا کے حصے کا مخرج ہے، اور نصف کا مخرج اس میں داخل ہے، اس لیے اس کو چھوڑ کر بڑے مخرج کو لیا جائے گا۔

شوہر کو نصف (۳) دیا جائے گا۔

اگر علاتی بھائیوں کو دادا کے خلاف بہن کے ساتھ شمار کیا جائے تو اس کے لیے مفید چھٹا حصہ ہے جو ثلث باقی کے برابر ہے۔

نصف اور چھٹے حصے کے بعد مسئلہ کے حصوں کا ایک تہائی بچتا ہے جو حقیقی بہن کو دیا جائے گا، یہ نصف سے کم ہے۔

علاتی بھائی محروم ہو جائیں گے، کیوں کہ وراثت میں ان کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔

☆☆☆☆

۲ تصحیح ۱۰ جزء السہم ۵

دادا	حقیقی بہن	علاتی بھائی
	ع	
	۲	
۴	۵	۱

اس مسئلہ کو عشریۂ زید کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کی تصحیح ۱۰ سے ہوتی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں دادا کے لیے سب سے مفید مقاسمہ ہے، اس لیے اسی بنیاد پر اس کو حصہ دیا جائے گا۔

علاتی بھائی کو دادا کے خلاف حقیقی بہن کے ساتھ شمار کیا جائے گا پھر وہ لوٹ کر علاتی بھائی کے حصے میں سے اتنا لے گی جس سے اس کا نصف مکمل ہو جائے اور باقی بچا ہوا علاتی بھائی کو ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ۲ ہے جو حقیقی بہن کے ذہن میں مقدر کیے ہوئے حصے کا مخرج ہے، جو وارثین میں تقسیم نہیں ہوتا ہے، اسی وجہ سے مسئلہ کی تصحیح ۱۰ سے ہوگی جو عدد رؤوس کو اصل مسئلہ سے ضرب دینے کا حاصل ہے، یہاں مرد کو عورت کے دوشمار کیا جائے گا۔

دادا کو دس میں سے چار حصے، حقیقی بہن کو پانچ حصے اور باقی ایک حصہ علاتی بھائی کو دیا جائے گا۔

☆☆☆☆

۱۰ تصحیح ۲۰ جزء السہم ۲

دادا	حقیقی بہن	۲ علاتی بہنیں
	ع	
۴	۵	۱
۸	۱۰	۲

اس مسئلہ کو عشرینیہ کہتے ہیں کیوں کہ اس کی تصحیح ۲۰ سے ہوتی ہے۔

ہم نے فرض کرلیا کہ یہ مسئلہ ۱۰ سے ہے، جو حقیقی بہن کو نصف مان کر اس کے مخرج کو عدد رؤوس (۵) سے ضرب دیا، پھر علاتی بہنوں کے عدد رؤوس کو مسئلہ کی اصل سے ضرب دیا تو حاصل ۲۰ نکلا، جو مسئلہ کی تصحیح ہے۔

دادا کو ۲۰ میں سے ۸ حصے ملیں گے، حقیقی بہن کو نصف یعنی ۲۰ میں سے ۱۰ حصے، دو حصے بچتے ہیں، ہر علاتی بہن کو ایک ایک۔

☆☆☆☆

۱۸ تصحیح ۵۴ جزء السہم ۳

ماں	دادا	حقیقی بہن	علاقی بھائی	علاقی بہن
۱/۶	۱/۳ مابقی	۱/۲	باقی بچا ہوا	
۳	۵	۹	۱	
۹	۱۵	۲۷	۲	۱

اس مسئلہ کو مختصرۃ زید کہا جاتا ہے۔

مسئلہ کی اصل ۱۸ بنتی ہے جو سدس کے مخرج (۶) کو ثلث مابقی کے مخرج (۳) سے ضرب دینے کا حاصل ہے۔

ماں کو چھٹا حصہ (۳) ملے گا، کیوں کہ ایک سے زائد بھائی بہن پائے جاتے ہیں، دادا کو ثلث مابقی (۵) ملے گا اس کے حق میں یہ اور مقاسمہ دونوں یکساں ہے، پھر حقیقی بہن کو علاقی بہن بھائیوں کو دادا کے خلاف شمار کرنے کے بعد نصف (۹) ملے گا اور ایک حصہ باقی بچتا ہے جو علاقی بھائی بہن کو ملے گا، جو ان دونوں پر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے تصحیح کی جائے گی، حصے اور عدد رؤوس کے درمیان تباین ہے، اس لیے عدد رؤوس (۳) کو مسئلہ کی اصل (۱۸) سے ضرب دیا جائے گا، جس کا حاصل ۵۴ ہوتا ہے۔

پھر ہر وارث کے حصے کو جزء السہم سے ضرب دیا جائے گا جیسا کہ اس کی وضاحت مسئلہ کے حل میں کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

۱۸ تصحیح ۹۰ جزءالسہم ۵

ماں	دادا	حقیقی بہن	۲علاتی بھائی	علاتی بہن
۱/۶	۱/۳یاباقی	۱/۲	باقی بچاہوا	
۳	۵	۹	۱	
۱۵	۲۵	۴۵	۴	۱

مسئلہ کی اصل ۱۸ ہے اوراس کی تصحیح ۹۰ سے ہوتی ہے۔
مسئلہ کے حل میں اس مسئلہ کی مکمل وضاحت ہے۔

☆☆☆☆

۶عول الی ۹ تصحیح ۲۷ جزءالسہم ۳

شوہر	ماں	دادا	بہن
۱/۲	۱/۳	۱/۶	۱/۲
۳	۲	۱	۳
۹	۶	۳ +	۹
		۱۲	
		۸	۴

اس مسئلہ کو اکدریہ کہا جاتا ہے۔
اس کی اصل ۶ سے ہے جو سدس کا مخرج ہے اوراس کے علاوہ دوسرے مخارج اس میں داخل ہیں،اس میں عول الی ۹ ہے۔
شوہر کو عول کے ساتھ نصف (۳) کیوں کہ میت کا فرع وارث موجود نہیں ہے، ماں کو عول کے ساتھ ایک تہائی (۲) کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع نہیں ہے اور ایک سے

زائد بھائی بہن بھی نہیں ہیں، دادا کو عول کے ساتھ چھٹا(۱) اور بہن کو عول کے ساتھ نصف (۳)۔

لیکن اس کے بعد علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دادا بہن کی طرف رجوع ہوگا اور دونوں کے حصے ملا کر ان کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے اور اس میں دادا کو بہن کے دوگنا ملے گا مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق، دادا کا حصہ نو میں سے ایک اور بہن کا حصہ نو میں سے ۳ ہے، دونوں ملا کر ۴ ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق تقسیم کرنے سے یہ دادا اور بہن پر برابر تقسیم نہیں ہوتا ہے، اس لیے عددِ رؤوس کو لیں گے کیوں کہ حصوں میں تباین پایا جاتا ہے، اور اس کو اصل مسئلہ سے ضرب دیں گے، اس کے نتیجے میں مسئلہ کی تصحیح ۲۷ بنتی ہے شوہر کو ۹، ماں کو چھ، دادا کو آٹھ اور بہن کو ۴ حصے ملیں گے۔

مناسخہ کے ایک مسئلہ کا حل

		جزء سہم ۵		جزء سہم ۳	جزء سہم ۲		جزء سہم ۵				
		اصل اول		اصل دوم	جامعہ اول		اصل سوم	جامعہ دوم		اصل	جامعہ سوم
		٦		٥	٣٠		٤	٦٠		١٠	٦٠
١/٢	شوہر	٣	متوفی	٠	٠		٠				
١/٣	ماں	٢	اجنبیہ	٠	١٠	متوفی	٠				
ع	چچا	١	اجنبی	٠	٥	اجنبی		١٠	اجنبی		
			۵ بیٹے	٥	١٥	اجنبی	٠	٣٠	اجنبی		٣٠
						ع علاتی بھائی	٤	٢٠	١٠ بیٹے (ع)		٢٠
										١٠	١٠

تشریح

اس مناسخہ میں پہلی میت کی وراثت کے تقسیم ہونے سے پہلے بہت سے افراد کا انتقال ہوگیا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا شکل سے واضح ہے۔

پہلے مسئلہ میں شوہر کو نصف ملے گا کیوں کہ کوئی وارث فرع نہیں ہے، ماں کو ایک تہائی ملے گا کیوں کہ کوئی فرع وارث نہیں ہے اور نہ ایک سے زائد بھائی بہن ہیں، چچا کو عصبہ کی

بنیا دپر بچا ہوا ملے گا، کیوں کہ اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔
مسئلہ کی اصل ٦ ہے، شوہر کو نصف یعنی تین حصے ملیں گے، ماں کو ایک تہائی یعنی دو حصے ملیں گے اور باقی بچا ہوا ایک حصہ چچا کو ملے گا۔
شوہر کا انتقال ہو گیا اور اس کے پانچ بیٹے ہیں، اس لیے ایک الگ مسئلہ بنایا جائے گا جس کی اصل ۵ ہوگی بیٹیوں کے عدد رؤوس کے مطابق، ہر ایک کو ایک حصہ ملے گا۔
پھر پہلے مسئلہ میں شوہر کے حصے (۳) اور اس مسئلے کے عدد رؤوس کو دیکھا جائے گا تو تباین نظر آئے گا،
اس لیے پہلے مسئلہ کی اصل (٦) کو دوسرے مسئلہ کی اصل (۵) سے ضرب دیا جائے گا تو جامع (۳۰) بنے گا، یہ مناسخہ کا پہلا مسئلہ ہوا۔
جامع سے ماں کو دس حصے ملیں گے، کیوں کہ پہلے مسئلہ سے اس کے حصے (۲) کو دوسرے مسئلہ کی اصل (۵) سے ضرب دیا جائے گا، اور چچا کو پانچ حصے ملیں گے جو پہلے مسئلہ سے اس کے حصے (۱) کو دوسرے مسئلہ کے اصل (۵) سے ضرب دینے کا حاصل ہے، اور بیٹیوں کو ۱۵ حصے ملیں گے جو پہلے مسئلہ سے اس کے حصے (۳) کو دوسرے مسئلہ کی اصل سے دینے کا ماحصل ہے۔
پھر پہلے میت کے وارثین میں سے ماں کا انتقال ہو گیا اور اس کے چار علاتی بھائی ہیں، اس لیے اس کا نیا مسئلہ بنایا جائے گا، جس کی اصل ۴ بنے گی جو علاتی بھائیوں کا عدد رؤوس ہے، ان میں سے ہر ایک کو ایک حصہ ملے گا۔
اب مسئلہ مناسخہ کے جامع اول سے تیسری میت (ماں) کے حصوں (۱۰) اور اس کے اصل مسئلہ (۴) کو دیکھا جائے گا تو دونوں میں نصف سے توافق نظر آئے گا، کیوں کہ دونوں دو سے تقسیم ہو جاتے ہیں، اس لیے تیسری میت کے حصوں کے نصف جو اس کا وفق ہے کو مسئلہ جامع اول سے ضرب دیں گے تو مناسخہ کے جامع ثانی کے حصوں کی تعداد ٦۰ بن جاتی ہے۔
پہلی میت کے مسئلہ میں چچا کو ۱۰ حصے ملیں گے جو جامع اولی میں اس کے حصے (۵) کو

دو سے ضرب دینے کا حاصل ہے۔

دوسری میت کے مسئلہ میں بیٹوں کو ۳۰ حصے ملیں گے جو جامع اول میں ان کے حصوں (۱۵) کو ۲ سے ضرب دینے کا نتیجہ ہے۔

تیسری میت کے مسئلہ میں علاتی بھائیوں کو بیس حصے ملیں گے جو ان کے مسئلے میں ان کے حصے کو جامع دوم کے مسئلہ میں ان کی میت کے حصوں کے وفق (۵) کے ساتھ ضرب دینے کا حاصل ہے۔

پھر پہلی میت کے وارثین میں سے چچا کا انتقال ہوگیا اور اس کے ۱۰ بیٹے ہیں، اس لیے اس کا بھی ایک نیا مسئلہ بنایا جائے گا جس کی اصل ان کے عدد روؤس ۱۰ کو بنایا جائے گا، ہر بیٹے کو ایک حصہ ملے گا۔

اب مناسخہ کے دوسرے مسئلہ میں چوتھی میت یعنی چچا کے حصوں (۱۰) اور اس کے اصل مسئلہ کو دیکھا جائے گا تو ان دونوں میں تماثل پایا جاتا ہے جو ان پر برابر تقسیم ہوجاتا ہے، اس لیے مسئلہ مناسخہ کی اصل کو جامع ثالث بنایا جائے جو دوسرے جامع کی اصل (۶۰) ہے۔

دوسری میت کے مسئلہ میں بیٹوں کو جامع ثالث (۶۰) میں سے (۳۰) حصے ملیں گے، ان میں سے ہر ایک کو چھ چھ حصے، تیسری میت کے مسئلہ میں علاتی بھائیوں کو اس میں سے (۲۰) حصے ملیں گے جو سابقہ مناسخہ میں ان کے حصوں کی مجموعی تعداد ہے، ان میں سے ہر ایک کو پانچ پانچ حصے ملیں گے، چوتھی میت کے مسئلہ میں بیٹوں کو سابقہ مناسخہ دوم سے ان کی میت کے حصوں کی مجموعی تعداد ۱۰ حصے ملیں گے، ہر ایک کو دو دو حصے۔

خنثی کے مسائل کا حل

ع

۲ سہم ۳

بیٹا	۱
خنثی / مذکر	۱

خنثی مونث

۳ سہم ۲ ۶

۲	۳
۱	۲

موقوف ۱

تشریح

پہلے مسئلہ میں مخنث کو مرد مانا گیا ہے، اس لیے وہ بیٹے کے برابر ہے اور وہی دو وارث ہیں، اس لیے وراثت ان دونوں میں تقسیم کی جائے گی، مسئلہ کی اصل ان کے عدد روؤس ۲ سے بنے گا، ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا، دوسرے مسئلہ میں مخنث کو عورت مانا گیا ہے، اس صورت میں عدد روؤس ۳ ہے جو مسئلہ کی اصل بنتا ہے، مرد کو دو عورتوں کے بقدر حصہ، بیٹے کے دو حصے اور مخنث کو ایک حصہ۔

دونوں مسئلوں کے درمیان تباین ہے، اس لیے ایک کو دوسرے سے ضرب دیا جائے گا، جو حاصل ہو گا وہ دونوں مسئلہ کا جامع (۶) ہو گا، مخنث اور بھائی کو دو حصوں میں سے کم حصہ دیا جائے گا۔

مخنث کو مرد ماننے کی صورت کو بیٹے کو تین حصے ملتے ہیں جو پہلے مسئلہ سے اس کا حصہ ہے جو دوسرے کے اصل (۳) سے ضرب کا حاصل ہے۔

مخنث کو بھی تین حصے ملتے ہیں، مذکورہ بالا سبب کی بنیاد پر۔

مخنث کو عورت ماننے کی صورت میں بیٹے کو چار حصے ملتے ہیں، جو اس کا دوسرے مسئلہ سے حصہ ہے پہلے مسئلہ کی اصل سے ضرب دینے کے بعد۔

مخنث کے لیے دو حصے ہیں جو اس کا دوسرے مسئلہ سے حصہ ہے، پہلی کی اصل کو ضرب دینے کے بعد۔

اس صورت میں بیٹے کو ۳ حصے دیے جائیں گے اور مخنث کو ایک، جو کم سے کم حصہ ہے، اور ایک حصہ روکا جائے گا، یہاں تک کہ مخنث کی حقیقت معلوم ہو جائے یا وہ اپنے بھائی کے ساتھ مصالحت کر لے، اگر مخنث مرد ثابت ہو جائے تو یہ حصہ اس کو دیا جائے گا، اگر عورت ثابت ہو جائے تو بھائی کو دیا جائے گا۔

۲		
۱/۲	بیٹی	۱
ع	حقیقی بھائی/مخنث	۱

تشریح

بیٹی کو نصف ملے گا، کیوں کہ یہ اس کا حصہ ہے، اور مخنث ہر حال میں عصبہ ہونے کی بنیاد پر باقی نصف لے گا، کیوں کہ اگر وہ مرد ہے تو عصبہ بنفسہ بنے گا، اگر عورت ہے تو عصبہ مع غیرہ بنے گا۔

اس مسئلہ میں کوئی حصہ روکا نہیں جائے گا، کیوں کہ مخنث کو مرد یا عورت ماننے سے ان دونوں کے حصے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔

چناں چہ مسئلہ کی اصل ۲ ہے جو بیٹی کے حصے کا مخرج ہے، ہر ایک اس میں سے ایک حصہ ملے گا۔

☆☆☆☆

		سہم ۳	سہم ۳		سہم ۲	
		×۲ ۲۴	۴۸		۷۲	۱۴۴
۱/۸	بیوی	۳	۶		۹	۱۸
۱/۶	ماں	۴	۸		۱۲	۲۴
ع	بیٹا	۱۷	۱۷		۳۴	۵۱
	مخنث ولد/مذکر		۱۷	مونث	۱۷	۳۴

موقوف ۱۷

تشریح:

اس مسئلہ میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا کیوں کہ میت کا وارث فرع موجود ہے، اور اسی سبب کی وجہ سے ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

مخنث اگر مذکر ہے تو وہ عصبہ بنفسہ بنے گا، اگر مونث ہے تو بیٹے کی وجہ سے عصبہ بنے گا، جو عصبہ بنفسہ ہے، دونوں صورتوں میں ولد مخنث اور بیٹا عصبہ ہونے کی بنیاد پر باقی حصوں کے حق دار بنیں گے۔

مسئلہ کی اصل ۲۴ سے ہے، جو سدس کے مخرج کے وفق (۳) کو ثمن کے مخرج کے کل (۸) سے ضرب کا حاصل ہے، کیوں کہ دونوں میں نصف میں توافق پایا جاتا ہے۔

بیوی کو تین حصے ملیں گے جو آٹھواں حصہ ہے، ماں کو چار حصے ملیں گے جو چھٹا حصہ ہے، اور عصبہ یعنی بیٹا اور مخنث ولد کے لیے ۱۷ حصے بچتے ہیں جو ان پر برابر برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اگر مخنث کو مذکر مانا جائے تو مسئلہ کو دو سے ضرب دینے سے تصحیح ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں مسئلہ کی تصحیح (۴۸) ہو جاتی ہے (۲۴×۲=۴۸)، اس میں سے بیوی کو چھ، ماں کو آٹھ، مخنث کو (۱۷) اور بیٹے کو (۱۷)۔

اگر مخنث کو عورت مانا جائے تو مسئلہ کو ۳ سے ضرب دینے سے مسئلہ کی تصحیح ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں تصحیح (۷۲) سے ہوگی: (۲۴×۳=۷۲) بیوی کو ۹، ماں کو ۱۲، مخنث کو ۱۷، اور

بیٹے کو ۳۴ حصے ملیں گے۔

پھر دونوں مسئلوں کے اصل کو دیکھا جائے گا تو ان دونوں کے درمیان آٹھویں حصے کے ثلث سے توافق پایا جاتا ہے، کیوں کہ ۴۸ کا آٹھواں حصہ ۶ بنتا ہے، اور ۶ کا ایک تہائی ۲ ہے، اور ۷۲ کا آٹھواں حصہ ۹ ہے، اور ۹ کا ایک تہائی ۳ ہے، اس کے نتیجے میں جامع مسئلہ ۱۴۴ سے بنے گا، جو مرد کے مسئلہ کے جزء السہم ۳ سے ۴۸ کو ضرب دینے یا عورت کے مسئلہ کے جزء السہم ۲ سے ۷۲ کو ضرب دینے کا حاصل ہے۔

اس میں سے بیوی کو ۱۸ ملے گا، کیوں کہ دونوں صورتوں میں اس کے حصے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے، ماں کو ۲۴ حصے دیے جائیں گے، کیوں کہ اس کا حصہ بھی دونوں صورت میں تبدیل نہیں ہوتا ہے، مخنث کو عورت مان کر ۳۴ حصے دیے جائیں گے کیوں کہ یہ کم سے کم حصہ ہے، اور مخنث کو مرد مان کر بیٹے کو ۵۱ حصے دیے جائیں، کیوں کہ یہ بھی کم سے کم حصہ ہے۔

مخنث کی حقیقت معلوم ہونے تک ۱۷ حصے روکے جائیں گے۔

اگر اس کا عورت ہونا معلوم ہوجائے تو یہ حصے بیٹے کو دیے جائیں گے، اگر مرد ہونا ثابت ہوجائے تو اس کو دیے جائیں گے۔

☆☆☆☆

سہم۲ سہم۱

۱ ۲ ۲

ع	مخنث ولد/مذکر	۱	۱/۲مونث	۱	۱
م	چچا	۰	ع	۱	۰

موقوف ۱

تشریح:

مخنث کو مرد مانا جائے تو وہ میت کا بیٹا بن جائے گا، اس صورت میں وہ عصبہ بنفسہ ہے

اور وہ چچا کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے، اس کی وجہ سے وہ چچا کو محجوب کردے گا، اور پورا مال بیٹے کا ہوگا۔

اس کو عورت ماننے کی صورت میں بیٹی ہوگا تو اس کو میراث کا نصف ملے گا، کیوں کہ وہ تنہا ہے اور اس کو عصبہ بنانے والا کوئی نہیں ہے، اس صورت میں چچا عصبہ بنفسہ بنے گا کیوں کہ اس کو محجوب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

پہلے مسئلہ کی اصل (۱) ہے، اور دوسرے کی اصل (۲) ہے، اور جامع (۲) ہے جو (۱) کو (۲) سے ضرب دینے کا حاصل ہے، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان تباین پایا جاتا ہے۔

مخنث کو عورت مان کر جامع سے ایک حصہ دیا جائے گا کیوں کہ اس کے حق میں یہی کم سے کم یقینی حصہ ہے۔

چچا کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ مخنث کا مرد ہونے کا احتمال ہے، اور مخنث کی حقیقت معلوم ہونے تک اس حصے کو روکا جائے گا، اگر وہ مرد ثابت ہوجائے تو اس کو یہ حصہ دیا جائے گا، اگر عورت ثابت ہوجائے تو یہ حصہ چچا کو دیا جائے گا۔ اگر اس کی حقیقت معلوم ہی نہ ہو تو وہ اور چچا آپس میں مصالحت کرلیں گے۔

☆☆☆☆

		سہم ۱		سہم ۱	
		۲		۲	۲
۱/۲	شوہر	۱		۱	۱
ع	مخنث بھتیجا/مذکر	۱	مونث	۰	۰
م	چچا	۰	ع	۱	۰
					موقوف ۱

تشریح:

پہلے مسئلہ کی اصل ۲ ہے جو شوہر کے حصے نصف کا مخرج ہے، اور دوسرا مسئلہ بھی اسی طرح ہے، اور جامع بھی ۲ ہے، کیوں کہ دونوں میں نصف سے توافق پایا جاتا ہے، اس لیے (۱) کو ۲ سے ضرب دیا جائے گا (۲×۱=۲)

ہر حال میں شوہر کو نصف ملے گا، کیوں کہ میت کا کوئی فرع وارث نہیں ہے، پھر اگر مخنث کو مرد مان لیا جائے تو بھتیجا باقی حصے کا عصبہ کی بنیاد پر وارث بن جائے گا اور چچا محجوب ہو جائے گا، کیوں کہ وہ چچا کے مقابلے میں میت سے زیادہ قریب ہے۔

اگر مخنث کو عورت فرض کرلیا جائے تو وہ ذوی الارحام میں سے بن جائے اور چچا کو عصبہ کی بنیاد پر باقی حصہ ملے گا۔

مخنث اور چچا کے سلسلے میں احتیاط اور کم سے کم حصہ دینے کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان میں سے کسی کو حصہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ مخنث کی حقیقت معلوم ہونے تک روکا جائے گا، اگر اس کا مرد ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو دیا جائے گا، اگر عورت ثابت ہو جائے تو چچا کو دیا جائے گا۔ یا دونوں آپس میں مصالحت کرلیں گے۔ واللہ أعلم

مفقود کے مسائل کا حل

		سہم ۱ ۶		سہم ۱ ۶	۶
۱/۲	شوہر	۳		۳	۳
۱/۶	ماں	۱	۱/۳ ماں	۲	۱
۱/۶	اخیافی بھائی	۱		۱	۱
ع	حقیقی بھائی مفقود/ زندہ	۱	/میت	۰	۰
					موقوف ۱

تشریح:

شوہر کو نصف ملے گا، کیوں کہ میت کا کوئی وارث فرع موجود نہیں ہے، مفقود کو زندہ ماننے کی صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، کیوں کہ ایک سے زائد بھائی بہن ہیں، اور اخیافی بھائی کو چھٹا حصہ ملے گا، حقیقی بھائی باقی بچا ہوا عصبہ کی بنیاد پر لے گا جو ایک حصہ ہے۔

پہلا مسئلہ کی اصل ۶ ہے جو سدس کا مخرج ہے، اور نصف کا مخرج اس میں داخل ہے۔

تین حصے شوہر کو، ایک حصہ ماں کو، ایک حصہ اخیافی بھائی کو، اور ایک حصہ حقیقی بھائی کو زندہ مان کر۔

دوسرے مسئلہ میں مفقود کو میت مانا گیا ہے، اس صورت میں شوہر کو نصف ملے گا، ماں کو ایک تہائی ملے گا اور اخیافی بھائی کو چھٹا حصہ ملے گا۔

مسئلہ کی اصل ٦ ہے جو سدس کا مخرج ہے۔

شوہر کو تین حصے، ماں کو دو حصے، اخیافی بھائی کو ایک حصہ، مفقود کو کچھ بھی نہیں، اس کو میت مان کر۔

اگر ہم دونوں مسئلوں کی اصل کو دیکھیں گے تو تماثل نظر آئے گا، اس لیے جامع بھی ٦ ہی بنے گا۔

شوہر کو تین حصے دیے جائیں گے، اخیافی بھائی کو ایک حصہ دیا جائے گا، ان دونوں کا حصہ مفقود کو زندہ یا مردہ ماننے کی صورت میں بدلتا نہیں ہے، ماں کو چھٹا حصہ (١) دیا جائے گا، کیوں کہ یہی کم سے کم حصہ ہے، اور ایک حصے کو موقوف رکھا جائے گا، اگر مفقود بھائی زندہ ہو تو وہ اس حصے کو لے گا، اگر مر گیا ہو تو یہ حصہ ماں کو ملے گا۔

☆☆☆☆

		سہم ٣	سہم ١		سہم ٣	
		٢٤	٧٢		٢٤	٧٢
1/8	بیوی	٣	٩		٣	٩
1/6	باپ	٤	١٢	ع + 1/6	٤+١	١٢
1/6	ماں	٤	١٢		٤	١٢
ع	بیٹی	١٣	١٣	1/2	١٢	١٣
	بیٹا مفقود/زندہ		٢٦	/میت	٠	٠

موقوف ٢٦

تشریح:

پہلے مسئلہ میں مفقود کو زندہ مانا گیا ہے، اس کی اصل ٢٤ ہوتی ہے، کیوں کہ ثمن کے مخرج

کے وفق (۴) کو سدس کے مخرج کے کل سے ضرب دیا گیا ہے، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان نصف سے توافق پایا جاتا ہے۔

بیوی کو آٹھواں (۲۴) میں سے تین دیا جائے گا، باپ کو چھٹا حصہ (۴) دیا جائے گا، ماں کو چھٹا حصہ (۴) دیا جائے گا۔

اور باقی بچے ہوئے (۱۳) حصے بیٹی اور بیٹے میں مرد کو عورت کے دوگنا کے اصول کے مطابق تقسیم کیے جائیں گے۔

ان کا حصے ان دونوں پر برابر تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اس لیے تصحیح کی ضرورت ہے، مسئلہ کی اصل اور عدد رؤوس میں تباین پائے جانے کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے ضرب دیا گیا جس کا حاصل ۷۲ ہوتا ہے جو اس مسئلہ کی تصحیح ہے۔

بیوی کو ۹ حصے، باپ کو ۱۲ حصے، ماں کو ۱۲ حصے، بیٹی کو ۱۳ حصے اور مفقود بیٹے کو ۲۶ حصے۔

دوسرے مسئلہ میں مفقود کو میت مانا گیا ہے، اس صورت میں بھی مسئلہ کی اصل ۲۴ ہی ہوتی ہے جس طرح کہ پہلے مسئلہ کی اصل ہے۔

بیوی کو ۳ حصے، ماں کو ۴ حصے، کیوں کہ بیٹے کو مردہ یا زندہ ماننے کی صورت میں ان کے حصوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، بیٹی کو ۱۲ حصے اور باپ کو ۵ حصے: ۴ حصے چھٹے حصے کی وجہ سے اور ایک حصہ عصبہ کی وجہ سے، اور مفقود بیٹے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، کیوں کہ اس کو مردہ مانا گیا ہے۔

اب یہ کام باقی بچا ہے کہ ہم ان دونوں مسئلوں کی اصل کو دیکھیں تا کہ ان کے جامع تک پہنچ جائیں، یہ بات واضح ہے کہ جامع ۷۲ سے صحیح بنتا ہے، کیوں کہ پہلے مسئلہ کی تصحیح ۷۲ سے ہوئی ہے، اور دوسرے مسئلہ کی اصل ۲۴ ہے، اور یہ دونوں ۲۴ سے تقسیم ہوتے ہیں، جو پہلے مسئلہ کو ایک سے ضرب دینے کا حاصل ہے، پھر ہم حصوں کو تقسیم کریں گے اور ہر وارث کو کم سے کم حصہ دیں گے، کیوں کہ اسی میں احتیاط ہے، اور باقی حصوں کو موقوف رکھیں گے۔

بیوی اور ماں کے حصوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنا اپنا کامل حصہ لیں گے۔

باپ کو کم سے کم دیا جائے گا جو ۱۲ حصے ہوتے ہیں۔

بیٹی کو بھی کم سے کم دیا جائے گا جو ۱۳ حصے بنتے ہیں۔

باقی ۲٦ حصے موقوف رکھے جائیں گے، یہاں تک کہ مفقود کے بارے میں معلوم ہوجائے، اگر وہ زندہ ہے تو موقوف رکھے ہوئے حصے اس کو دیے جائیں گے، اگر مردہ ہو تو ۳ حصے باپ کو اور ۲۳ حصے بیٹی کو دیے جائیں گے۔ واللہ أعلم

مترجم کی دیگر کاوشیں

تراجم:

۱۔شہرِ قدس تہذیبی چیلنج کے نشانے پر تحریر: مصطفٰی محمد طحان طبع
۲۔گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد تحریر: مصطفٰی محمد طحان طبع
۳۔اسلامی آدابِ زندگی تحریر: مصطفٰی محمد طحان طبع
۴۔رہنمائے طلبہ تحریر: مصطفٰی محمد طحان طبع
۵۔وقت کا صحیح استعمال تحریر: مصطفٰی محمد طحان طبع
۶۔فتاوی رسول اللہ تالیف: علامہ ابن قیم جوزیہ طبع
۷۔آدابِ شاگردی تحریر: محمد بن صالح الاسمر طبع
۸۔جوروں کی دنیا تحریر: محمد علی ابوالعباس طبع
۹۔اسلام اور مغرب کے درمیان ڈائیلاگ کا مستقبل تحریر: پروفیسر نجم الدین اربکان
ترکی سے عربی: مصطفٰی محمد طحان طبع
۱۰۔روشن مستقبل کا جوان تحریر: ڈاکٹر سیف راشد جابری طبع
۱۱۔تبلیغی جماعت اور اس کا کام تحریر: ابوبکر جابر جزائری طبع
۱۲۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تحریر: ڈاکٹر حارث بن سلیمان طبع
۱۳۔آلِ رسول واصحابِ رسول ایک دوسرے کے ثناخواں
تحریر: مبرۃ الآل والأصحاب طبع
۱۴۔آلِ رسول واصحابِ رسول ایک دوسرے پر رحم کرنے والے
تحریر: صالح بن عبداللہ الدرویش طبع
۱۵۔آل واصحاب کی تاریخ کا مطالعہ کیسے کریں؟ تحریر: عبدالکریم بن خالد حربی طبع
۱۶۔امہات المومنین کا تذکرۂ عنبریں تحریر: مبرۃ الآل والأصحاب طبع
۱۷۔صحبتِ رسول اللہ تحریر: صالح بن عبداللہ الدرویش طبع
۱۸۔حضرت جعفر بن ابوطالب: فضائل ومناقب تحریر: علامہ حافظ ضیاء الدین مقدسی طبع

۱۹۔راہ خدا کے مسافر (تاریخی ناول) تحریر: نجیب کیلانی زیر طبع
۲۰۔فقہِ شافعی تحریر: مصطفیٰ الخن، مصطفیٰ بغا،علی شربجی طبع
۲۱۔امت مسلمہ صہیونی چیلنج کا مقابلہ کیسے کرے؟ تحریر: مصطفیٰ محمد طحان طبع
۲۲۔اسلام میں غیروں کے حقوق...... تحریر: مصطفیٰ محمد طحان زیر طبع
۲۳۔حضرت ابوبکر صدیق: پہلے خلیفہ راشد تحریر: مصطفیٰ محمد طحان زیر طبع
۲۴۔اجتماعی دعوتی کام: اہمیت وشروعیت تحریر: مصطفیٰ محمد طحان زیر طبع
۲۵۔تاریخ الاخوان المسلمون (مصر) تحریر: مصطفیٰ محمد طحان زیر طبع
۲۶۔مسکرایئے تحریر: عبدالحمید بلالی زیر طبع
۲۷۔رہنمائے طلبہ برائے کالجز تحریر: مصطفیٰ محمد طحان زیر طبع
۲۸۔نصرتِ مصطفیٰ کے ایک سو وسائل زیر طبع
۲۹۔مُردوں کو فائدہ پہنچانے والے اعمالِ خیر تحریر: محمود بن جمیل زیر طبع
۳۰۔رمضان کس طرح گزاریں؟ تحریر: ڈاکٹر محمد الہلالی طبع
۳۱۔امام حسن البنا شہیدؒ طبع
۳۲۔امت مسلمہ کی تشکیل نو میں طلبہ اور نوجوانوں کا کردار تحریر: مصطفیٰ محمد الطحان طبع
۳۳۔ماں؛ پیغامِ محبت تحریر: ڈاکٹر سیف راشد جابری زیر طبع
۳۴۔شیخ یوسف قرضاوی تحریر: یوسف تلیمہ زیر طبع
۳۵۔شیخ عبدالرحمٰن حسن حبنکہ تحریر: عائدہ راغب الجراح زیر طبع
۳۶۔اپنی ذات میں ایک امت؛ مجدد ملت امام حسن البنا شہید تحریر: ڈاکٹر توفیق الواعی

تالیفات:

۱۔القاموس المفرد (المصور) طبع
۲۔عہد نبوی کی شاعری زیر طبع
۳۔تعلم اللغة العربية زیر طبع
۴۔انبیاء کے سچے واقعات (بزبان نوائطی) زیر طبع
۵۔تاریخ ادب عربی (عہد جدید) زیر تحریر
۶۔مراثی عہد نبوی زیر تحریر
۷۔تحفۃ الاخوات طبع

تزکیۂ نفس

اوراد ووظائف کے ذریعے

تالیف

امام حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ
(بانی اخوان المسلمون)

معہد امام حسن البنا شہید۔ بھٹکل

مختصر تعارف

معہد امام حسن البنا شہید کا قیام آج سے تقریباً بیس سال قبل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۰۸ ہجری مطابق ۷/اگست ۱۹۸۸ء کو عمل میں آیا، حضرت مولانا کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی معہد کی سرپرستی فرمارہے ہیں، اس معہد کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

☆عموماً مسلمانوں میں اور خصوصاً نوجوانوں میں دینی شعور بیدار کرنا۔

☆اسلامی خطوط پر مسلم معاشرے کی تشکیل۔

☆ دینی اور اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی نوجوانوں کو ترغیب دینا اور ان کو علمی اور دعوتی سرگرمیوں میں شریک ہونے کی دعوت دینا۔

☆اخلاقی، فکری اور معاشرتی بگاڑ اور اسلام مخالف نظریات کا مقابلہ کرنا۔

☆اسلامی وراثت کی حفاظت کرنا۔

☆اسلامی بیداری کی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ لینا۔

☆ فکری ارتداد کا مقابلہ کرنا، نوجوانوں کو اس سے چوکنا رکھنا اور امت مسلمہ کو ترقی دینا۔